انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ

جریدہ حیاتِ نو

مدیر مسئول: سید راشد حامدی —— مدیر: ابوالاعلی سید سبحانی

جلد:۲، شمارہ:۶، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۷ء/ محرم الحرام۔ربیع الآخر ۱۴۳۸ھ

مجلس ادارت

محمد اسماعیل فلاحی............نئی دہلی

زبیر ملک فلاحی............لکھنؤ

انیس احمد فلاحی............جامعۃ الفلاح

فی شمارہ:	اندرون ملک	۳۰/روپے
	بیرون ملک	۵/امریکی ڈالر
سالانہ زرتعاون:	اندرون ملک	۳۰۰/روپے
	بیرون ملک	۲۰/امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ:	اندرون ملک	۵۰۰۰/روپے
	بیرون ملک	۳۰۰/امریکی ڈالر

- رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔
- مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

Printed, Published & Owned by Sayyed Rashid Ali,F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025. **Printed at**: Ala Printing Press, 3636, Katra Dina Baig, Lal Kuan, Delhi-110006. **Published at**:F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025. **Editor: Abul Aala Sayyed**

نقوشِ حیات

اداریہ	ابوالاعلیٰ سید سبحانی	۴
پیام سیرت	مولانا سید جلال الدین انصر عمری	۶
پیغام	مشرف حسین صدیقی	۸
سیرت رسول ﷺ کے دو اہم ترین پہلو	مولانا صدرالدین اصلاحیؒ ترتیب وپیشکش: رضوان احمد فلاحی	۹
تعمیر فکر اور تہذیبی سیادت۔ سیرت طیبہ کا مطالعہ	ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی	۱۷
سیرت نبوی ﷺ کی معنویت	ظفر احمد الاثری	۳۴
داعیٔ اعظم کے بعض داعیانہ اوصاف واسالیب	مولانا محمد اسماعیل فلاحی	۷۰
نبی اکرم ﷺ کی دعوتی جدوجہد	سراج احمد برکت اللہ فلاحی	۸۳
مکی دورِ دعوت: مشکلات ومسائل	ذوالفقار علی فلاحی	۹۲
کامیاب منصوبہ بندی واقدام۔ ہجرت نبوی کی روشنی میں	اشتیاق عالم فلاحی	۱۰۷
صلح حدیبیہ: ایک مطالعہ	ضمیر الحسن خاں فلاحی	۱۱۲
خطبۂ حجۃ الوداع۔ حقوق انسانی کا عالمی منشور	پروفیسر توقیر عالم فلاحی	۱۱۷
قیادت: سیرت رسولؐ کے آئینے میں	غلام رسول فلاحی	۱۴۶
نبی اکرم ﷺ کی کشادہ دلی	نسیبہ سبحانی	۱۵۷

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا کفار سے حسن سلوک	محمد انس فلاحی سنبھلی	۱۶۲
دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک	عبدالرب کریمی فلاحی	۱۶۷
رسول اللہ ﷺ کی سماجی زندگی	ضمیراللہ ضمیر اعظمی فلاحی	۱۹۱
محسن انسانیت ﷺ کی خدمت شعاری	محی الدین غازی	۱۹۵
خدمت خلق اور اسوۂ رسولؐ	جوہر جاوید	۱۹۸
انسانوں کی خدمت سے معمور سیرت پاکؐ	عبدالحاکم مجاہد	۲۰۷
محبت رسولؐ اور اس کے تقاضے	ساجدہ ابواللیث فلاحی	۲۱۶
انسان کاملؐ	احسان الحق فلاحی عارف آئمی	۲۳۰
مرکز فکر وعمل	سید راشد حامدی فلاحی	۲۳۱
شہ انوار کے پاس!	ارشد جمال صارم	۲۳۳
نعت رسول پاکؐ	عزیز نبیل	۲۳۴
یہ نعت ہے فیضان نبیؐ	سعید اختر اعظمی	۲۳۶
نعت سرکار دوعالمؐ	تنویر آفاقی	۲۳۷
نعت	ضمیر اعظمی	۲۳۸
سلام	سالم سلیم	۲۳۹

خط وکتابت وارسال زر کا پتہ

Zeeshan Apartment, F-9, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025

Email: jareedahayatenau@gmail.com

موبائل نمبر (مدیر مسئول): +91-9811126467

موبائل نمبر (مدیر): +91-9891051676

اپنی بات

قرآن مجید جس اعلیٰ اخلاق و کردار کی تعلیم دیتا ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اس اعلیٰ قرآنی اخلاق و کردار کا جیتا جاگتا اور چلتا پھرتا ثبوت تھا۔

صحابہ کرامؓ اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور آپؐ سے محبت کا اولین تقاضا یہ ہے کہ اپنی زندگی کو مکمل طور سے آپؐ کی زندگی کے مطابق ڈھال لیں۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سب سے بڑی خواہش یہی ہوتی، کہ وہ اپنے آپ کو مکمل طور سے اللہ کے رسولؐ کے اخلاق و کردار کے سانچہ میں ڈھال لیں۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سراپا محسن انسانیت تھے۔ آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت میں بھی یہ وصف نمایاں طور سے موجود تھا۔ آپؐ اور آپ کے صحابہ کرامؓ سے واقف ایک ایک فرد، دوست ہو کہ دشمن، وہ اس بات کی کھل کر گواہی دیتا تھا۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی غیر معمولی مقبولیت کا ایک بڑا سبب آپؐ اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ کا یہ وصف بھی تھا۔ یہ وصف اسلامی دعوت کا اہم ترین اور مضبوط ترین جزو ہے، اور تاریخ کے ہر دور میں اسلامی مشن کی تکمیل میں اور اسلامی فتوحات کو رقم کرنے میں اس کا ایک بہت ہی اہم اور مؤثر رول رہا ہے۔

....

اس خصوصی شمارے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کا دعوتی اور تربیتی نقطہ نظر سے مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اسوۂ حسنہ کے مطابق جس مؤثر اسلامی شخصیت کی تشکیل ہوتی ہے اس کے کچھ اہم گوشوں کو اس شمارے کے ذریعہ سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایک عظیم مشن کے علمبردار تھے، بندوں کو بندوں کے رب سے وابستہ کرنے کا مشن، اس مشن کی تکمیل کے سلسلہ میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جدوجہد کی کیا نوعیت تھی؟ آپؐ کے اندر کیسی داعیانہ تڑپ پائی جاتی تھی؟ آپؐ کے وہ کیا داعیانہ اوصاف واسالیب تھے جن کی بنیاد پر آپؐ نے اپنے مشن میں اتنی مختصر مدت میں اس قدر غیر معمولی کامیابی درج کرائی؟ اس

شمارے کے مختلف مضامین میں ان سوالات کا جواب بہت ہی مؤثر اور بہت ہی عملی انداز میں دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اخلاق کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز تھے۔ عام انسانوں کے ساتھ بھی اعلیٰ اخلاق کے ساتھ پیش آتے، اپنے مشن کے سخت ترین مخالفین کے ساتھ بھی اعلیٰ اخلاق کے ساتھ پیش آتے، اور مومنین کے ساتھ بھی اعلیٰ اخلاق کے ساتھ پیش آتے۔ آپؐ کے مشن کی تکمیل میں اپنوں اور غیروں سب کے ساتھ آپؐ کے اس اعلیٰ اخلاق وکردار کا کس قدر غیر معمولی رول تھا، اس کو بھی اس شمارے میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستگی ایمان کے تقاضوں میں شامل ہے۔ فطری طور پر ہر بندۂ مومن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ وابستگی رکھتا ہے۔ فی زمانہ اہل ایمان کا ایک بڑا حصہ اس وابستگی کے سلسلہ میں غلط تصورات کا شکار ہے۔ اطاعت رسولؐ سے عاری محبت رسولؐ اس وقت امت کا ایک بڑا مسئلہ بن چکا ہے، اور محبت رسولؐ میں شرک کی حد تک غلو نے معاملہ کو اور سنگین بنا دیا ہے۔ اس شمارے میں محبت رسولؐ کے صحیح تصور اور اس کے عملی تقاضوں پر قرآن وسنت کے واضح نصوص کی روشنی میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس شمارے میں حیات طیبہ کے دوسرے مختلف اہم پہلوؤں پر بھی مفید اور قیمتی مضامین موجود ہیں۔ صفحات کی قلت کے سبب بعض اہم مضامین اس خصوصی اشاعت میں شامل نہیں کیے جا سکے، ادارہ اس کے لیے معذرت خواہ ہے، ان شاء اللہ یہ مضامین وقتاً فوقتاً آئندہ شماروں میں شائع کیے جاتے رہیں گے۔

....

اسوۂ حسنہ اہل ایمان کی شخصیت کی تشکیل میں کلیدی رول ادا کرتا ہے۔ یہ رب کائنات کی جانب سے عطا کردہ اخلاق وکردار کا وہ اعلی ترین اور مثالی عملی نمونہ ہے، جو رہتی دنیا تک اہل ایمان کی شخصیت کو بنانے اور سنوارنے کا کام کرتا رہے گا اور شخصی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک، ہر ہر مرحلہ میں رہنمائی کا کام کرتا ہے گا۔ ضرورت ہے کہ اسوۂ حسنہ کو ہم اپنی زندگی کے ایک ایک مرحلے کے لیے آئیڈیل اور نمونے کے طور پر تسلیم کریں اور اسی کے مطابق اپنے سفر حیات کی منصوبہ بندی کریں۔

(ابوالاعلی سید سبحانی)

پیامِ سیرت

مولانا سید جلال الدین انصر عمری

امیر جماعت اسلامی ہندو شیخ الجامعہ، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ۔ یوپی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں زبردست قوت تاثیر تھی۔ بڑی بڑی شخصیتوں نے اس سے گہرا اثر قبول کیا۔ جن افراد کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض صحبت نصیب ہوا وہ آپؐ کے عکس کامل بن گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں اللہ کی یاد، آخرت کا خوف، فنائے نفس اور ایثار وقربانی کے جذبات تھے تو یہ جذبات ان کے اندر بھی ابھر آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وسیرت میں پاکیزگی تھی تو ان کے اخلاق وسیرت میں بھی پاکیزگی آگئی۔ دین حق کے لیے ان میں بے پایاں اخلاص تھا اور باطل کے مقابلے میں ان کے اندر استقامت اور پامردی تھی۔ وہ بے یقینی کے عالم سے نکل کر یقین کے اس مقام تک پہنچ گئے جس سے اونچے مقام کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول مانا اور اس طرح مانا کہ اس میں شک وشبہہ کی کوئی آمیزش نہیں تھی۔ انہیں جس طرح اپنے وجود پر یقین تھا، ٹھیک اسی طرح یہ بھی یقین تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ ان کے اس یقین سے دنیا نے قدم قدم پر ٹکر لی، لیکن اسے متزلزل نہ کرسکی۔ وہ آزمائشوں میں ڈالے گئے، ہر طرح ستائے گئے، قید وبند کی تکلیفوں سے گزرے، مال ودولت سے محروم کیے گئے، لیکن ان کے یقین نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔

حضرت بلالؓ نے جب اعلان کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں تو مکے کے لڑکے ان کے پیروں میں رسی باندھ کر گلیوں اور کوچوں میں گھسیٹتے پھرتے تھے۔ ان کا مالک امیہ بن خلف تپتی ہوئی ریت پر انہیں لٹا کر سینے پر پتھر رکھ دیتا کہ اگر محمد کا انکار نہ کروگے تو اسی حال میں مرجاؤگے۔ لیکن اس کے باوجود محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کا جو کلمہ انہیں پڑھایا

تھا اس کے سوا کوئی دوسرا کلمہ پڑھنے سے انہوں نے انکار کر دیا۔ حضرت خبابؓ کو انگاروں پر لٹا دیا جاتا، جس سے ان کے جسم کی چربی پگھلنے لگتی۔ اس عذاب سے دہکتے ہوئے انگارے ٹھنڈے پڑ جاتے، لیکن ان کے یقین کی وہ آگ نہ بجھتی جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے روشن کیا تھا۔

نبوت کے جھوٹے مدعی مسیلمہ نے حضرت حبیب بن زیدؓ کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے، لیکن ان کے دل کی دنیا جس ایمان و یقین سے آباد تھی اسے نہ نکال سکا۔ وہ ان سے پوچھتا کہ کیا محمد اللہ کے رسول ہیں؟ تو پورے یقین کے ساتھ جواب دیتے کہ ہاں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور جب وہ یہ سوال کرتا کہ کیا تم مجھے اللہ کا رسول مانتے ہو تو صاف کہہ دیتے کہ تمہاری ان خرافات کے سننے سے میرے کان بہرے ہیں۔ حضرت صہیبؓ کو اس جرم میں کہ وہ آپؐ کو اللہ کا رسول مانتے تھے مکہ چھوڑنا پڑا، تو انہوں نے اس شان سے ہجرت کی کہ اپنا سارا مال و متاع مشرکین کے حوالے کر دیا اور خالی ہاتھ مدینے پہنچے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننے والوں کا یہ یقین، یہ ایمان اور یہ قربانیاں میرے نزدیک آپؐ کے برحق ہونے کی زبردست دلیل ہیں، کیونکہ آج تک اس کی کوئی مثال نہیں ہے کہ کسی جھوٹے نے دوسروں کو صداقت کا پابند بنا دیا ہو، کسی خدا سے بے خوف انسان نے اپنے ساتھیوں کے اندر اس کا خوف اور خشیت پیدا کر دی ہو اور کسی پست سیرت آدمی کی صحبت سے لوگوں کی سیرت بلند ہو گئی ہو۔ جھوٹ انسان کو کمزور کر دیتا ہے، اس لیے جھوٹے شخص میں یہ طاقت نہیں ہوتی کہ کسی کو سہارا دے سکے۔ اس کا مقام مصلح اخلاق کا نہیں ہوتا، بلکہ وہ اس قابل ہوتا ہے کہ اس کی اصلاح کی جائے۔ ظاہر ہے، جو خود دوسروں کا محتاج ہو، وہ کسی کی دست گیری کیا کر سکتا ہے؟ میدان عمل میں جس کے قدم لڑکھڑا رہے ہو، ناممکن ہے کہ وہ کسی کمزور اور ناتواں جسم میں استقلال اور ثابت قدمی کی روح پھونک دے۔

....

پیغام

یہ ہم سب کے لیے مسرت کا موقع ہے کہ حیات نو کا ایک خاص شمارہ ''محسن انسانیت'' کے عنوان سے منظر عام پر آ رہا ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر لاکھوں لاکھوں درود وسلام۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا ایک ایک گوشہ اور ایک ایک پہلو رہتی دنیا تک انسانی دنیا کی رہنمائی کرتا رہے گا۔

امت اسلامیہ کی موجودہ صورتحال اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اسوہ حسنہ کی روشنی میں اس کی تشکیل جدید کی جائے، اس کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت کی خدمت اور رہنمائی کا جو سبق سکھایا تھا وہ سبق ایک بار پھر سکھایا جائے۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ قرآن وسنت سے رشتہ مضبوط سے مضبوط کیا جائے، اسی کی روشنی میں نفوس کا تزکیہ کیا جائے اور اسی کی روشنی میں اپنی زندگی کے تمام فیصلے کیے جائیں۔

اللہ رب العزت اس کاوش کو قبول فرمائے۔

والسلام
مشرف حسین صدیقی
صدر انجمن طلبہ قدیم
جامعۃ الفلاح، بلریا گنج۔ اعظم گڑھ

سیرت رسول ﷺ کے دو اہم ترین پہلو

مولانا صدرالدین اصلاحیؒ

ترتیب وپیشکش: رضوان احمد فلاحی، لندن

واضح رہے کہ یہ مضمون اس وقت تحریر کیا گیا تھا جب آنجہانی سوویت یونین کی نظریاتی اساس، مارکس ازم، اپنے عروج کے نصف النہار پہ تھا۔ (مرتب)

یوں تو پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت کا کوئی گوشہ نہیں جو کمال انسانیت کا آئینہ دار نہ ہو، لیکن اس کے دو اہم پہلو ایسے ہیں جو سب سے زیادہ بنیادی اور سب سے زیادہ اہم ہیں:

ایک تو یہ کہ آپ ﷺ کے پاس جو حق تھا اسے آپ نے خلق تک، وقت کے وقت، جوں کا توں پہنچا دیا، اور کبھی اس بات کو روا نہ رکھا کہ اس کا کوئی جز لوگوں پر واضح ہونے سے رہ جائے۔ آپ کو حکم تھا اور نہایت زوردار لفظوں میں تھا کہ

"یَا أَیُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ، وَإِن لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ۔" (المائدہ:٦٧)

''اے رسول! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے، اسے (جوں کا توں) لوگوں تک پہنچا دو، اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کا پیغام پہنچانے کا حق ادا نہ ہوگا۔''

گمان نہیں کیا جا سکتا کہ آپ ﷺ نے اتنے زبردست فرمان کی تکمیل میں کوئی کسر اٹھا رکھی ہوگی جب کہ آپ کو یہ بھی صاف صاف سنایا جا چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایتوں کا چھپانے والا لعنتی ہوتا ہے۔ (اِنَّ الَّذِینَ یَکْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنَاتِ وَالْهُدیٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَیَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتَابِ أُولٰئِكَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَیَلْعَنُهُمُ اللاعِنُونَ) (البقرۃ:١٥٩)۔ اس لیے عقلاً ممکن نہیں کہ آپ ﷺ نے اللہ کے دین کو پورا پورا اور جوں کا توں لوگوں تک نہ پہنچا دیا ہو۔ یہ صرف قیاس اور عقیدت کی بات نہیں ہے، بلکہ واقعات کی قطعی اور کھلی ہوئی شہادت بھی یہی ہے۔ تیئس برس کی پیغمبرانہ زندگی میں ایک ثبوت بھی اس بات کا نہیں مل سکتا کہ آپؐ نے اس فرمان الٰہی کی تعمیل میں کوئی

کوتاہی دکھائی ہو۔ حالانکہ جو کچھ آپ کو دنیا کے سامنے اس بے لاگ طریقہ پر رکھنا ہوتا تھا بسا اوقات وہ ماحول کے لیے یکسر نامانوس اور سننے والوں کے لیے سرتاسر ناقابل برداشت ہوتا تھا۔ لیکن ماحول کی مصلحتوں اور سننے والوں کے جذباتی ردعمل کا آپ نے کبھی ذہنی دباؤ قبول نہیں کیا، اور نہ کبھی دعوت حق کا مفاد آپ نے اس میں سمجھا کہ اس کے ایسے اجزاء کو جن سے لوگوں کے بھڑک اٹھنے کا زیادہ اندیشہ ہو، ''قابل گوارا'' بنا کر اور ان کے ''رنگ توحش'' کو کچھ ہلکا کر کے پیش کریں۔ ایک طرف تو عرب کی سرزمین تھی جو سینکڑوں خداؤں کی نیازمندی اور پرستش میں غرق تھی، دوسری طرف قرآن کا تصور توحید تھا جس میں کسی بھی زندہ یا مردہ ''خدا'' کی خدائی کے لیے کوئی گنجائش سرے سے موجود ہی نہ تھی، اور جو ضروری قرار دیتا تھا کہ ایک ایک غیر اللہ کی خدائی کا انکار کیا جائے۔ شرک کے ایسے زبردست مرکز میں توحید کے ایسے بے آمیز تصور کی منادی کیا کسی حال میں بھی قابل برداشت سمجھی جاسکتی تھی؟ آج کریملین کے اندر کھڑے ہو کر مارکس ازم کے خلاف بولنا پھر بھی بہت آسان ہے لیکن مکہ میں اور کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر لا الہ الا اللہ کی منادی کرنا اس سے کہیں زیادہ مشکل تھا۔ مگر دنیا جانتی ہے کہ آپ ﷺ نے یہ منادی ٹھیک ان ہی لفظوں میں کی، ہر مقام اور ہر موقع پر کی، اور اس طرح کی کہ نہ تو کبھی آپ کے لب ولہجہ میں کوئی کمزوری آئی اور نہ ان لفظوں کے معنی ومفہوم کو خوش نما بنانے کا آپ کے اندر کبھی کوئی رجحان پیدا ہوا۔ حالانکہ اس طرح کی ''روادارانہ پالیسی'' کے اختیار کر لینے کا خود مخالف کیمپ سے بھی کھلا اشارہ کیا گیا تھا اور اس وقت کیا گیا تھا جب طاقت واقتدار کے اعتبار سے وہ آپ کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ تھا۔ لیکن ان باتوں کا بھی اور وہ بھی ایسے سخت حالات میں، آپ ﷺ کے برملا اعلان حق پر کوئی اثر نہیں پڑا، اگر پڑا تو صرف یہ کہ اس میں اور زیادہ شدت آتی گئی اور مخالفین کا ہر تازہ اظہار ناپسندیدگی دعوت توحید کی ایک تازہ تلقین وتوضیح کا سبب بنتا چلا گیا۔

جب توحید جیسے انقلابی اور ماحول کے لیے سب سے زیادہ ناقابل برداشت تصور کے بارے میں آپ ﷺ کی صاف بیانی کا یہ حال تھا تو اسلام کے دوسرے عقائد اور تعلیمات کے بارے میں کسی اخفاء یا التواء کا سوال ہی کہاں باقی رہ جاتا ہے؟

سیرت پاک کا دوسرا اہم ترین پہلو یہ تھا کہ داعی اسلام ہونے کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ ''اَوَّلُ الْمُسْلِمِين'' بھی تھے۔ آپ نے جس عقیدے، جس اصول اور جس ہدایت کی بھی دوسروں کو تلقین کی اس کے تقاضوں پر سب سے پہلے خود عمل کیا۔ آپ جس حق کے مبلغ تھے اس کی تبلیغ آپ نے بیک وقت

اپنی زبان اور اپنے عمل، دونوں سے کی۔ اپنے ساتھیوں کو اگر یہ تاکید فرمائی کہ ذکر الٰہی اور حمد و تسبیح میں زیادہ سے زیادہ مشغول رہو تو دنیا نے آپ کو بھی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ یاد مولیٰ میں مشغول دیکھا۔ اگر دوسرے اہل ایمان کو آپؐ کی یہ نصیحت تھی کہ دشمنان حق کی پیہم ایذا رسانیوں کا صبر سے مقابلہ کرتے رہو تو ان کے سامنے خود بھی سراپا صبر و ثبات بنے رہے۔ جب زبان مبارک نے یہ اعلان کیا کہ ان ظالم دشمنوں کا اب ہاتھ سے مقابلہ کرو تو میدان جنگ کی طرف سب سے پہلے اٹھنے والے قدم آپ ہی کے تھے اور اگر کبھی غیر معمولی حالات پیدا ہو جانے کے باعث ساتھی میدان چھوڑ بیٹھے تو اس وقت بھی حق کا یہ ستون اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ جنگی ضرورت سے اگر خندقیں کھودنے کا فیصلہ ہوا تو دوسروں کی طرح آپؐ کے ہاتھوں سے بھی پھاوڑے چلتے دیکھے گئے۔ تنگ حالی کے عالم میں اگر اوروں کے پیٹ پر ایک ایک پتھر بندھے تھے تو دامن مبارک کے نیچے دو دو پتھر بندھے پائے گئے۔ غرض دینی احکام و ہدایت کا کوئی جز ونہیں اور بندگی کا کوئی پہلو نہیں جس میں آپ ﷺ کا اپنا عمل دوسروں کی رہنمائی کے لیے آگے آگے موجود نہ رہا ہو۔ یہ صرف آپ کا جذبۂ عمل ہی نہ تھا بلکہ آپ کو حکم بھی اسی بات کا تھا:-

”قُلْ إِنِّـی أُمِـرْتُ أَنْ أَعْبُـدَ اللّٰـهَ مُـخْلِصاً لَهُ الدِّيْنَ وَأُمِرْتُ لِأَنْ أَكُونَ أَوَّلَ الْمُسْلِمِينَ۔“(الزمر:۱۱)

”اے نبیؐ! کہہ دو مجھے حکم ہے کہ اللہ کی بندگی کروں طاعت کو اسی کے لیے [خالص] کرتے ہوئے، اور مجھے حکم ہے کہ میں سب سے پہلا طاعت گزار بنوں۔“

اللہ تعالیٰ کے نزدیک آپ کے ”أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ“ ہونے کی اہمیت اتنی زیادہ تھی کہ بعض اوقات جب مصالح نے تقاضا کیا تو آپؐ کی نجی زندگی کی وہ آزادی بھی باقی نہ رہنے دی گئی جو شریعت کی طرف سے ہر شخص کو ملی ہوئی ہے۔ مثلاً نکاح کا معاملہ انسان کا ذاتی معاملہ ہے، اس بات کا فیصلہ کرنے میں وہ بالکل آزاد ہے کہ شرعی حدود اور معروف کے اندر وہ جس عورت سے چاہے نکاح کرے، جس سے چاہے نہ کرے۔ مگر ایک خالص دینی مصلحت کی بنا پر آنحضرت ﷺ کو ایک خاتون (حضرت زینب رضی اللہ عنہا) سے نکاح کر لینے کا مکلّف بنا دیا گیا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ یا بیوہ سے نکاح عرب جاہلیت میں جائز نہیں سمجھا جاتا تھا۔ دوسری تمام جاہلی اور غلط رسوم کی طرح اس رسم کو بھی اسلام نے موقوف قرار دے دیا۔ مگر پرانی رسموں کا اثر مسلسل تعامل کی وجہ سے سماج کے ذہن میں جس گہرائی تک اترا ہوا ہوتا ہے اس

کی وجہ سے اس رسم کے خلاف عمل کی ابتدا کرنا سخت مجاہدے کی بات تھی۔ اتفاق کی بات کہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے جو آں حضرت ﷺ کے منہ بولے بیٹے تھے، اپنی بیوی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دے دی۔ اگرچہ بعض اہم مصالح کا تقاضا آپ یہی سمجھتے تھے کہ حضرت زینب کو اپنے عقد نکاح میں لے لیں۔ مگر وہی منہ بولے بیٹے کی مطلقہ ہونے کی بنا پر اس بات کا قوی اندیشہ کہ معاشرے میں ابھی اس نکاح کا اچھا خاصا خراب ردعمل ہوگا، جھجک میں ڈالے ہوئے تھا۔ ظاہر ہے کہ جہاں تک معاملہ کی عام نوعیت کا تعلق تھا یہ آپ ﷺ کا بالکل نجی معاملہ تھا، اور آپ کے لیے اس لحاظ سے دونوں راہیں کھلی تھیں، نکاح کر لینے کی بھی اور نہ کرنے کی بھی۔ مگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہوا کہ آپؐ کو یہ نکاح ضرور کرنا چاہیے۔ بلکہ قرآن مجید کے ظاہر الفاظ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ ہی نے اس رشتۂ نکاح کو جوڑ کر اس کا اعلان فرما دیا (زَوَّجْنَاکَهَا)۔ ایسا کیوں ہوا؟ اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے اس ذاتی معاملہ میں آپ کی آزادیٔ عمل کیوں برقرار نہ رہنے دی؟ اس کا جواب خود اسی کے لفظوں میں سنیے:

''......زَوَّجْنَـاکَهَا لِکَیْ لَا یَکُونَ عَلَی الْمُؤْمِنِینَ حَرَجٌ فِی أَزْوَاجِ أَدْعِیَائِهِمْ إِذَا قَضَوا مِنْهُنَّ وَطَراً'' (الأحزاب:۳۷)

''......ہم نے اسے تمہارے نکاح میں دے دیا تاکہ اہل ایمان کے لیے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے، جبکہ وہ ان سے اپنی غرض پوری کر چکیں، نکاح کر لینے میں کوئی تنگی نہ رہ جائے۔''

یعنی چونکہ امت پر سے ایک ناروا بندش کو ختم کرنا تھا اور اس سلسلہ میں دوسروں کے لیے زبردست نفسیاتی رکاوٹیں تھیں، اس لیے یہ ''اول المسلمین'' ہی کا کام تھا کہ آگے بڑھے اور بڑھ کر راہ عمل کھول دے۔

اس ایک مثال سے پوری صورت واقعہ اچھی طرح سمجھ میں آ جاسکتی ہے اور اندازہ کر لیا جاسکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ''اول المسلمین'' ہونے کے کیا معنی تھے؟

اب ذرا اس بات پر بھی غور کیجیے کہ رسول خدا ﷺ یہ دونوں امتیازی خصوصیتیں زندگی بھر اتنی مضبوطی سے کیوں اپنائے رہے؟ کیا بات تھی کہ سیرت پاک کے سراپے میں یہ دونوں اوصاف اتنی نمایاں اہمیت کے ساتھ موجود نظر آرہے ہیں؟ بلاشبہ اس کا آسان اور سیدھا جواب تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ

کا آپؐ کو حکم ہی اس طرح کا تھا۔ لیکن اس جواب پر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم تھا کیوں؟ آخر اس حقیقت کو تو حقیقت ہی مانا جائے گا کہ اس کا کوئی حکم بلاوجہ نہیں ہوتا بلکہ ہر حکم کسی نہ کسی گہری حکمت پر ہی مبنی ہوتا ہے۔ پھر سوچیے کہ آپؐ کو جو کام سپرد کر کے بھیجا گیا تھا اور جو دین حق کی تبلیغ واقامت کے سوا اور کچھ نہ تھا، اس کے پیش نظر ان دونوں باتوں کا حکم کن مصلحتوں اور حکمتوں کا حامل ہوسکتا ہے؟ جہاں تک معروف اندازفکر کا تعلق ہے وہ تو کسی ایسی غیر معمولی انقلابی دعوت وتحریک کے سلسلہ میں، جو انسانی ڈھانچے کو پوری طرح ادھیڑ دینا اور ادھیڑ کر بالکل نئی بنیادوں پر پھر سے تعمیر کرنا چاہتی ہو، اس طرح کی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ کوئی اہمیت نہیں دیتا، بلکہ پہلی چیز کو تو دانش مندی کے بھی خلاف سمجھتا ہے۔ اس بارے میں اس کا فیصلہ یہ ہے کہ جس تحریک کا منشا سماج میں کوئی غیر معمولی تبدیلی لانا ہوا بتدا ہی میں اس کا واضح اور صاف صاف تعارف عوامی جذبات کو لازماً بھڑکا دیا کرتا ہے، اس لیے حسن تدبیر کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے اصل اور آخری مدعا کا پہلے ہی قدم پر کیا، مدتوں پتہ نہ چلنے دیا جائے، بلکہ لوگوں کی نگاہیں دیکھ کر باتیں کی جائیں اور ان کی قوت برداشت کی حد تک اسے کم وحشت انگیز بلکہ خوش نما بنا کر پیش کیا جائے۔ پھر جب ایک خاص حد تک لوگ ہموار ہو جائیں اور کچھ طاقت بھی فراہم کر لی جائے تب کہیں جا کر اپنے اصل مدعا کا برملا اظہار کیا جائے۔ یہ فیصلہ کچھ آج ہی کے ''معروف اندازفکر'' کا نہیں ہے بلکہ خود اس زمانے میں اور اس ملک میں بھی لوگوں کے سوچنے کا انداز کچھ اسی طرح کا تھا جس میں آپ ﷺ مبعوث فرمائے گئے تھے۔ چنانچہ آپؐ کو اور آپ کے مخلص ساتھیوں کو اسی بنا پر ایک مدت تک، العیاذ باللہ، فریب خوردہ اور بے وقوف قرار دیا جاتا رہا۔ اب اگر اللہ تعالیٰ کا حکم اور رسول خدا ﷺ کا طریق کار اس معروف اندازفکر وطریق کار کے بالکل مخالف رہا تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ دعوت حق کا مفاد اسی بات کا متقاضی تھا۔ کیونکہ یہ بات حکیم وخبیر خدا کی شان سے بعید ہے کہ وہ اپنے رسول کو ایسی پالیسی اختیار کرنے کی ہدایت کرے جو اس کے مقصد بعثت کے حصول میں مفید ہونے کے بجائے الٹا اسے نقصان پہنچانے والی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر اسلامی تحریکوں پر اسلامی دعوت کو قیاس کرنا بنیادی طور پر غلط ہے۔ غیر اسلامی تحریکوں کے لیے اپنے مقصد کا گول مول اظہار اور اپنے اصول ونظریات کا پیچ رخا تعارف ضرور مفید مطلب ہوتا ہے، بلکہ شاید ضروری بھی ہوتا ہے کیونکہ یہی پالیسی ان کے مزاج سے ہم آہنگ اور ان کی فطری بے مائیگی کے حسب حال ہوتی ہے۔ مگر دعوت حق کو یہ پالیسی کبھی راس نہیں آسکتی، کیونکہ اس کا اختیار کرنا خود اس بات کی

دلیل بن جائے گا کہ اس دعوت کو اپنی غرض وغایت کی حقانیت پر خود ہی اطمینان نہیں ہے، اور عملاً ہوگا یہ کہ ابتدا کے ساتھی درمیان ہی میں ساتھ چھوڑ جائیں گے، مؤثر الزامات اور معقول اعتراضات کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوگا، اور اگر بہ ہزار دقت ورسوائی کسی منزل تک رسائی ہو بھی گئی تو وہ قیام دین کی منزل بہر حال نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ اس پالیسی سے دعوت حق کا مزاج بھی کسی طرح میل نہیں کھاتا کیونکہ اپنے مقصد ومدعا کا یہ طرز تعارف بجائے خود ایک مہذب قسم کا جھوٹ ہے، اور جھوٹ کا سہارا پکڑنے کا ننگ، خواہ وہ کتنا ہی مہذب کیوں نہ ہو، اس حق کی خودداراور بے لاگ فطرت کبھی گوارا نہیں کرسکتی جو زمین پر آیا ہی اسی لیے ہے کہ اسے جھوٹ اور باطل سے یکسر پاک کردے۔ ان وجوہ کو اگر سامنے رکھیے تو معلوم ہوگا کہ اپنے مقصد دعوت کا واضح اعلان واظہار محض آپ کی جرأت حق گوئی کا نتیجہ نہ تھا بلکہ اس کے پیچھے یہ ضرورت بھی کام کررہی تھی کہ اسلام کی تبلیغ واقامت اور لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ کی منزل تک رسائی اس کے بغیر ممکن ہی نہ تھی۔

رہا سیرت پاک کا دوسرا پہلو، تو اگر چہ دوسری تحریکوں میں اسے خلاف دانش نہیں سمجھا جاتا، مگر ضروری بھی نہیں مانا جاتا۔ چنانچہ اس طرح کی تحریکوں کا اگر آپ جائزہ لیں تو پائیں گے کہ ان کے علم بردار اپنے مسلک کے چاہے بڑے اچھے ''مسلم'' رہے ہوں مگر ''اول المسلمین'' ہرگز نہیں تھے، اور اس کے باوجود بھی وہ کامیاب ہوگئیں۔ لیکن دعوت اسلامی کا معاملہ اس باب میں بھی بالکل مختلف ہے۔ اگر اس دعوت کا پیش کرنے والا ایک طرف تو اسے خدا کی طرف سے آئی ہوئی کہتا اور اس کی پیروی ہی پر دارین کی فلاح موقوف ٹھہراتا ہو، دوسری طرف اس کا اپنا عمل اس کے اعلیٰ تقاضوں کی زندہ مثال نہ پیش کرتا ہو تو دنیا اس کی طرف کبھی نہیں آسکتی۔ اس قسم کی ''تبلیغ حق'' کو تبلیغ حق کہنا ہی غلط ہے۔ اسے تو حق کی بس پیشہ ورانہ وکالت کہہ سکتے ہیں۔

....

اسلام کی تصوریت ''عملیت'' کا جامہ کس طرح پہنتی ہے، یہ بات اس وقت تک جانی نہیں جاسکتی تھی جب تک قرآن کے ساتھ رسول بھی نہ آتا اور وہ اپنی پوری زندگی کو اسلامی تصورات کی، اسلامی اعمال کی اور اسلامی اخلاق کی ایک جیتی جاگتی تصویر بنا کر لوگوں کے سامنے نہ رکھ دیتا۔ اس لیے حقیقت واقعی یہ ہے کہ سیرت رسول ﷺ کے بغیر اسلام کو ٹھیک طور سے سمجھا ہی نہیں جاسکتا، اور اگر ایک چیز کے بغیر اسلام کو ٹھیک ٹھیک سمجھا بھی نہیں جاسکتا تو ظاہر بات ہے کہ اس کی ٹھیک ٹھیک پیروی کا امکان تو اور دور

جا پڑتا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر سیرت نبوی کا ذکر و مطالعہ تسکین عقیدت کا نہیں بلکہ حفاظت دین و ایمان کا اور ادائے حقوق اسلام کا مسئلہ بن جاتا ہے، اس لیے اس تذکرے اور مطالعے کی اصل ضرورت یہ ہے کہ اس سے مومن ہونے کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا طریقہ معلوم کیا جائے۔

سیرت رسول کا مطالعہ اگر اس صحیح نقطۂ نظر سے کیا جائے تو صاف محسوس ہوگا کہ سیرت کے یہ دونوں پہلو، جن کا اوپر کی سطروں میں ایک مختصر سا جائزہ لیا گیا ہے، اپنی اصل حیثیت ہی کے لحاظ سے اہم ترین نہیں ہیں، بلکہ آج کل ملت اسلامیہ جس حالت میں ہے اس کے لحاظ سے بھی اہم ترین ہیں۔ آج کوئی آنکھ نہیں جو ملت کا حال دیکھ کر ٹھنڈی رہ جائے اور کوئی زبان نہیں جو اس پر ماتم سرا نہ ہو۔ یہ صورت حال جس وجہ سے پیدا ہوئی ہے اس کی اس سے زیادہ صحیح اور موزوں تعبیر اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ سیرت رسول ﷺ کے ان دونوں پہلوؤں سے، جو سب سے زیادہ اہم تھے، ملت نے سب سے زیادہ غفلت اختیار کر رکھی ہے۔ اسلام جتنا کچھ اور جیسا کچھ ہے، اسے جوں کا توں ظاہر کرنا احتیاط اور زمانہ شناسی کے خلاف سمجھا جاتا ہے، اور ایسا سمجھنا دانش مندی کا فیشن بن گیا ہے۔ اور اگر بعض حلقوں میں ایمانی خودی کچھ زور دکھاتی بھی ہے تو صرف زبانی اعتراف و اظہار خیال کی حد تک، ورنہ جہاں تک عملی اقدام کا تعلق ہے اس کی راہ میں یہاں بھی وہی احتیاط پسندی چٹان بن کر آ کھڑی ہوتی ہے۔ اس طرز فکر و عمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلام کے جن حصوں پر عمل کی کوشش ماحول کو پسند نہیں ہوتی ان کا یا تو زبان پر ذکر نہیں آنے پاتا، یا پھر عقیدت و تحسین کا خراج ادا کر کے خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے اور ان کی حد تک عملی زندگی بدستور دوسری لائنوں ہی پر سفر کرتی رہتی ہے۔ جس شخص کو بھی اسلام کے مطالعے کا موقع ملا ہے وہ اس حقیقت کو مانے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ بندگی کا ایک جامع نظام ہے جس سے انسانی زندگی کا کوئی گوشہ بھی باہر نہیں۔ وہ اپنے پیرووں سے جس اطاعت کا مطالبہ کرتا اور جس بندگی رب کی بجا آوری چاہتا ہے اس کی حدیں اگر مسجد کے گوشۂ ذکر سے شروع ہوتی ہیں تو مملکت کے نظم و انصرام سے پہلے ختم نہیں ہوتیں۔ لیکن کیا آج ملت کو دیکھ کر نہ سہی، اس کی باتوں کو سن کر ہی کوئی اسلام کو ایسا جان اور سمجھ سکتا ہے؟ یقیناً نہیں۔ کیونکہ ہماری بہت بڑی اکثریت یا تو اس امر حق سے واقف ہی نہیں، یا اسے زبان پر لانے کی بھی جرأت کھو بیٹھی ہے۔ وہ اسلام کی وضاحت عموماً اس انداز میں کرتی رہتی ہے جس سے وہ ہماری زندگی کے ایک پرائیویٹ معاملہ سے زیادہ اور کچھ نہیں ثابت ہوتا، جس کے ساتھ اجتماعی زندگی میں کسی بھی ''ازم'' کو لا کر بہ آسانی جوڑ دیا جا سکتا ہو، بلکہ زیادہ 'محتاط' لوگ تو علانیہ فرمایا کرتے ہیں کہ دین کو دنیا

سے اور مذہب کو سیاست سے کوئی واسطہ نہیں، دونوں کے دائرے بالکل الگ الگ ہیں۔ اس ''بڑی اکثریت'' سے آگے بڑھیے تو ان لوگوں میں سے بھی، جو بحمداللہ اس جہل اور اس کتمان حق دونوں بیماریوں سے محفوظ ہیں، بہتوں کو ایک دوسرا روگ چمٹا دکھائی دے گا۔ وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں یہ فرماتے تو ضرور نظر آئیں گے کہ اسلام ہی ایک برحق دین ہے، انسانی اور عالمی مذہب ہے، ایک جامع نظام حیات ہے، دنیا کو امن وسلامتی کی تلاش ہے تو یہ تریاق اسے اسلام ہی عطا کر سکتا ہے اور انسانی زندگی کے سارے مسائل کا حل اسی کی تعلیمات میں مل سکتا ہے۔ لیکن ان کی عملی دلچسپیوں کو دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ ان کی صرف ''حدیث بزم'' ہے، جس کے اندر ''حدیث رزم'' بننے کی کوئی امنگ بہ مشکل ہی محسوس کی جا سکتی ہے۔ اظہار اس ایمان، عقیدے اور یقین کا کہ انسانیت کی فلاح صرف اسلام سے وابستہ ہے اور انسانی مسائل کی کنجی صرف قرآن ہے، مگر لائحہ عمل میں ہر نظام کی خدمت گزاریوں کے لیے پوری پوری جگہ، اگر جگہ نہیں تو صرف اسلامی نظام کی خاطر سعی و جہد کے لیے۔ بلاشبہ حالات کا دباؤ کم سخت نہیں مگر ''اول المسلمین'' کا اسوۂ حسنہ اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ اس کے تقاضے پورے کیے جائیں۔

کاش سیرت رسول کا مطالعہ امت رسول کو یہ حقیقت سمجھا دیتا کہ اس کی کھوئی دولت واپس نہیں مل سکتی جب تک کہ سیرت پاک کے ان دونوں اہم ترین پہلوؤں کا جرأت اور بے خوفی سے اتباع نہ کیا جائے۔

(ماخوذ از: سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیش کش ''سیرتِ طیبہ''، جلد 7، شمارہ 81، 16 ستمبر 1959 / 12 ربیع الاول 1379)

تعمیر فکر اور تہذیبی سیادت

(سیرت طیبہ کا مطالعہ)

ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی،

پروفیسر وصدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

دنیا میں انسان کی زندگی گزارنے کے لیے اسلام کے علاوہ جو نظام نامے مرتب کیے گئے انہیں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ تقسیم اصولی اور نظریاتی ہے۔(۱) عین ممکن ہے کہ جزئیات وفروع میں فرق ہو:

ا۔ جاہلیت خالصہ، یعنی اس کائنات اور اس کے نظام کے پیچھے کارفرما کسی غیبی قوت کا انکار و استرداد۔ ہر حکمت و مصلحت اور مقصد ونصب العین سے پہلو تہی کر کے اتفاقی ہنگامۂ وجود کو تسلیم کرنا۔ محسوسات سے ماوراء تمام حقائق کا انکار ہر زمانہ کے دنیا پرستوں کا نظریہ رہا ہے۔ قلیل مستثنیات کو چھوڑ کر بادشاہوں نے، امیروں نے، درباریوں اور ارباب حکومت نے، خوش حال لوگوں اور خوشحالی کے پیچھے جان دینے والوں نے عموماً اسی نظریہ کو ترجیح دی ہے اور مغربی تمدن کی بنیاد میں بھی یہی نظریہ کارفرما ہے۔ مغربی علم وحکمت کا نقطۂ نظر بنیادی طور سے یہی ہے کہ

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

آج مغربی علوم وفنون اور افکار وآداب کی آبیاری میں اسی ذہنیت کی کارفرمائی ہے۔ پورا نظام تعلیم وتربیت اسی الحاد اور مادیت کی بنیاد پر استوار ہے۔ انفرادی سیرتیں اسی سانچے میں ڈھلتی ہیں اور اجتماع ومعاشرت اور سیاست وتمدن کی صورت گری اسی نقشہ پر ہوتی ہے۔ یہ مادیت ظلم اور حق تلفی کو جنم دیتی ہے اور اس کا ظہور قوم پرستی، استعمار اور اقوام کشی کی صورت میں ہوتا ہے۔ قرآن کریم کا مطالعہ ہمیں اسی نتیجے تک پہنچاتا ہے۔(۲)

۲۔ جاہلیت مشرکانہ، یعنی نظام کائنات کو چلانے میں متعدد خداؤں کے وجود کا اعتراف۔ فرشتے،

جن، ارواح، سیارے، زندہ اور مردہ انسان، درخت، پہاڑ، جانور، دریا، زمین، آگ سب دیوتاؤں کی فہرست میں آ گئے۔ بہت سے مجرد معانی مثلاً محبت، حسن، شہوت، قوت تخلیق، بیماری، جنگ، لکشمی، شکتی وغیرہ کو خدا کا مقام دیا گیا۔ اس دیومالائی فکر کے گرد اوہام وخرافات کا ایک طلسم ہوش ربا تیار ہوا، جس میں تمام جاہل اقوام کی قوت وہمہ نے اپنی شادابی اور نادرہ کاری کے نمونے فراہم کیے۔

اس مشرکانہ نظام جاہلیت نے مسلم اقوام اور ممالک کے درمیان بھی اپنے پر پرزے نکالے۔ خداؤں کی روایتی اقسام اسلام کے تصور توحید کے اثر سے رخصت ہوگئیں مگر شیطان اور اس کے حواریوں نے انبیاء، اولیاء، شہداء، صالحین، مجاذیب، اقطاب، ابدال، علماء، مشائخ اور ظل اللّٰہوں کو خدائی کے مقام پر لا بٹھایا، اور تصرفات وتقربات کی ایک پوری میتھالوجی تیار ہوگئی۔ (۳)

۳۔ جاہلیت راہبانہ، یعنی دنیا اور جسمانی وجود کو سراپا عذاب سمجھنے کا نظریہ۔ یہ نظریہ بجائے خود غیر تمدنی ہے مگر تمدن پر مختلف طریقوں سے اثر انداز ہوتا ہے۔ اس رہبانیت کی بنیاد پر ایک خاص قسم کا نظام فلسفہ بنتا ہے جس کی مختلف شکلیں ویدانتزم، مانویت، اشراقیت، یوگ، غیر اسلامی تصوف، مسیحی رہبانیت اور بدھ مت وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں۔ یہ راہبانہ جاہلیت تین صورتوں میں رونما ہوتی ہے:

(الف) نیک اور پاکباز افراد کو گوشۂ عزلت میں بٹھا دیا جاتا ہے اور بدکار لوگ اس روئے زمین کے متولی بن بیٹھتے ہیں اور زمین کو فتنہ وفساد سے بھر دیتے ہیں۔

(ب) مذہب کا غلط تصور انسانوں کے اندر مایوسانہ نقطۂ نظر پیدا کرتا اور انہیں ظالموں کے لیے نرم بنا دیتا ہے۔

(ج) انسانی فطرت سے شکست کھا کر یہ راہبانہ فلسفہ کتاب الحیل کی تصنیف شروع کر دیتا ہے۔ گناہوں کے چور دروازے کھلتے ہیں اور ہوس رانی کے لیے عشق مجازی کی آڑ لی جاتی ہے۔

قرآن کریم نے ان تمام جاہلیتوں پر کاری ضرب لگائی۔ اس نے اعلان کیا:

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ۔ (الحدید: ۲۵)

(ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا، اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ اور لوہا اتارا جس میں بڑا

زور ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں۔ یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ اللہ کو معلوم ہو جائے کہ کون اُس کو دیکھے بغیر اُس کی اور اُس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔)

حلیم کے ساتھ شدید بھی

اور حاملِ کتاب مہبط وحی ﷺ اور ان کے پیارے اصحاب کی تحسین کی گئی اور ان کی جامع صفات بیان کی گئیں تو سابقہ آسمانی کتب تورات وانجیل کے حوالے بھی تائید میں فراہم کیے گئے ۔ یہود اور نصاریٰ کو دعوت تفکر بھی دی گئی:

پہلے نبی آخرالزماں ﷺ کے نصب العین کی تذکیر کی گئی کہ ان کی آمد کا مقصد غلبۂ دین ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر مسلمانوں اور کفار قریش کے درمیان دس سالہ ناجنگ معاہدہ ہوا تھا اور رسول اکرم ﷺ نے کفار قریش کی بعض ایسی شرطیں بھی مان لی تھیں جو مسلمانوں کو ناگوار تھیں۔ مقصد طرفین کے درمیان افہام وتفہیم اور تعامل ومعاشرت کے مواقع تلاش کرنا تھا مگر صراحت کر دی گئی کہ بعثت نبوی کا نصب العین دین اسلام کا غلبہ ہے۔ وہ اس نصب العین سے دست بردار نہیں ہو سکتے:

هُوَ الَّذِیُ أَرُسَلَ رَسُولَهُ بِالُهُدَى وَدِيُنِ الُحَقِّ لِيُظُهِرَهُ عَلَى الدِّيُنِ كُلِّهِ وَكَفَى بِاللَّهِ شَهِيُداً۔ (الفتح:۲۸)

(وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اُس کو پوری جنسِ دین پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔)(۴)

اس کے بعد رسول اور اصحاب رسول کا تذکرہ بڑی خوبصورت تمثیل کے پیرایہ میں کیا گیا:

مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِيُنَ مَعَهُ أَشِدَّاء عَلَى الُكُفَّارِ رُحَمَاء بَيُنَهُمُ تَرَاهُمُ رُكَّعاً سُجَّداً يَبُتَغُونَ فَضُلاً مِّنَ اللَّهِ وَرِضُوَاناً سِيُمَاهُمُ فِي وُجُوهِهِم مِّنُ أَثَرِ السُّجُودِ ذَلِكَ مَثَلُهُمُ فِي التَّوُرَاةِ وَمَثَلُهُمُ فِي الُإِنجِيُلِ كَزَرُعٍ أَخُرَجَ شَطُأَهُ فَآزَرَهُ فَاسُتَغُلَظَ فَاسُتَوَى عَلَى سُوقِهِ يُعُجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيُظَ بِهِمُ الُكُفَّارَ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِيُنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنُهُم مَّغُفِرَةً وَأَجُراً عَظِيُماً ۔ (الفتح:۲۹)

(محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب دیکھو گے انہیں رکوع وسجود، اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں

مشغول پاؤ گے۔ سجود کے اثرات اُن کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔ یہ ہے اُن کی صفت تورات میں، اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے کونپل نکالی، پھر اس کو تقویت دی، پھر وہ گدرائی، پھر اپنے تنے پر کھڑی ہوگئی۔ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تاکہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں۔ اس گروہ کے لوگ جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں، اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔)(۵)

پامالیٔ حرمت پر سخت تنبیہ

اللہ کے رسول اور صحابہ کرام کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اہل ایمان کے لیے رحیم و شفیق اور ہم درد و غم گسار ہوتے ہیں، ایمان نے ان کے اندر محبت و یگانگت اور شفقت و مروت پیدا کر دی ہے مگر کفر اور اہل کفر کے لیے وہ پتھر کی چٹان ہیں۔ انہیں کسی ترغیب سے خریدا جا سکتا ہے نہ کسی ترہیب سے ڈرایا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ان اضداد کی بدرجۂ اتم جامع تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایت ہے:

لم يكن النبي ﷺ فاحشاً و لامتفحشا و كان يقول ان من خياركم أحسنكم اخلاقاً۔(۶)

(نبی ﷺ بدزبان نہ تھے نہ کبھی بدکلامی کی کوشش کی۔ آپ فرماتے تھے: تم میں بہتر لوگ وہی ہیں جن کے اخلاق اچھے ہیں۔)

حضرت عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا:

ما خُيِّر رسولُ الله ﷺ بين أمرين إلا أخذ أيسرهما ما لم يكن اثما كان أبعد الناس منه وما انتقم رسول الله ﷺ لنفسه الا ان تنتهك حرمة الله فينتقم لله بها۔(۷)

(رسول اللہ ﷺ کو جب بھی دو باتوں کے انتخاب کا حق دیا گیا آپ نے آسان تر کا انتخاب کیا بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو۔ اگر وہ گناہ کا عمل ہوتا تو آپ سب سے زیادہ اس سے دور رہتے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہ لیا۔ ہاں اگر اللہ کی حرمت پامال کی جاتی تو آپ ضرور انتقام لیتے۔)

صدیق اکبرؓ کی سماجی مقبولیت

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ کے تربیت یافتہ تھے اور آپ کی صفات کے پرتو۔ اسی لیے ان کی توقیر و تکریم کا حکم دیا گیا اور اتباع کا بھی۔ ہماری ہدایت اور نجات ان کی پیروی سے مشروط کر دی گئی۔ صحابہ کرام میں بھی اولیت و افضلیت حضرت ابوبکر صدیقؓ کو حاصل ہے۔ وہ زمانہ جاہلیت میں بھی حسن اخلاق کا پیکر تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے رسول اللہ ﷺ کے متعلق آپ پر وحی نبوت کے آغاز کے وقت جو الفاظ استعمال کیے تھے وہی الفاظ ابن الدغنہ نے قریش کے سامنے حضرت ابوبکرؓ کی تعریف کرتے ہوئے استعمال کیے۔

غار حرا سے رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری ہوئی تو آپ کا قلب مبارک تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ حضرت خدیجہ بنت خویلدؓ کے پاس آئے اور گھبراہٹ کے عالم میں فرمایا، مجھے چادر اوڑھاؤ، مجھے چادر اوڑھاؤ۔ لوگوں نے آپ کے جسم اطہر پر ایک چادر ڈال دی تا آنکہ خوف دور ہو گیا۔ آپ نے حضرت خدیجہؓ سے سارا ماجرا کہا اور فرمایا: مجھے اپنی جان کا خدشہ ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے اس وقت جو جملے ارشاد فرمائے اس سے آپ کے اعلیٰ کردار پر روشنی پڑتی ہے:

کلا واللہ مایخزیك الله ابدا، انك لتصل الرحم، وتحمل الكل، و تكسب المعدوم، وتقری الضيف، وتعين على نوائب الحق۔(۸)

(ہرگز نہیں، خدا کی قسم اللہ آپ کو رسوا نہیں کرے گا، آپ تو صلہ رحمی کرتے ہیں، ناداروں کا بوجھ ڈھوتے ہیں، مفلسوں کو کھانا کھلاتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں اور ناگہانی آفات میں لوگوں کی امداد کرتے ہیں۔)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب مسلمانوں پر آزمائش کا دور شروع ہوا تو حضرت ابوبکرؓ نے بھی حبشہ کی طرف ہجرت کا منصوبہ بنایا۔ وہ سفر پر نکلے اور برک الغماد مقام تک پہنچے۔ وہاں ابن الدغنہ سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے حضرت ابوبکرؓ سے سفر کا مقصد پوچھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا، میری قوم نے مجھے نکال دیا ہے۔ میں اب سیاحت کرنا چاہتا ہوں تاکہ اپنے رب کی عبادت کر سکوں۔ ابن الدغنہ نے کہا: آپ جیسا آدمی کہیں نہیں جائے گا نہ اسے نکالا جا سکتا ہے۔ آپ تو مفلسوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ ناداروں کا بوجھ ڈھوتے ہیں۔ مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں۔ ناگہانی مصیبتوں میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ میں آپ کا پڑوسی ہوں اور محافظ بھی۔ واپس چلئے۔ اپنے ملک میں اپنے رب کی

عبادت کیجئے۔''

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ابن الدغنہ ابوبکرؓ کو اپنے ساتھ لے کر واپس آیا۔ وہ کفار قریش کے اشراف کی خدمت میں پہنچا اور ان سے بڑی صراحت سے کہا:

إن أبابكر لا يخرج مثله ولا يخرج، أتخرجون رجلا يكسب المعدوم، ويصل الرحم ويحمل الكل، ويقرى الضيف، ويعين على نوائب الحق۔(۹)

(ابوبکر جیسے لوگ اپنے وطن سے باہر نہیں جاتے نہ انہیں نکالا جا سکتا ہے۔ کیا تم لوگ ایسے آدمی کو دیس نکالا دے رہے ہو جو مفلسوں کو کھلاتا ہے، صلہ رحمی کرتا ہے، ناداروں کا بوجھ ڈھوتا ہے، مہمانوں کی ضیافت کرتا ہے اور ناگہانی مصائب میں لوگوں کی مدد کرتا ہے۔)

چنانچہ کفار قریش کو ابن الدغنہ کی یہ پناہ دہی تسلیم کرنا پڑی۔

فکری بصیرت و شہامت

حضرت ابوبکرؓ کا دور خلافت (۶۳۲۔۶۳۴ء) دو سال تین ماہ گیارہ دن کی مختصر مدت پر محیط ہے۔ یہ دور زیادہ تر ارتداد کی تحریک سے نمٹنے میں گزرا مگر اس مختصر مدت میں ایسے عظیم الشان کارنامے انجام پائے جن پر اسلام کی تاریخ کو ناز ہے۔ انہوں نے بدترین حالات میں بھی، جبکہ عام طور پر لوگوں کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں اور قوت فیصلہ سلب ہو جاتی ہے، سخت اور مطلوب موقف اختیار کیا اور أشداء على الكفار اور أعزة على الكافرين کے قرآنی وصف کی سراپا تصویر بن کر دکھایا۔

زمام خلافت سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے جیش اسامہ بن زیدؓ کی روانگی کا معاملہ سامنے آیا۔ ۸/ربیع الاول ۱۱ھ کو جمعرات کے دن حضور ﷺ نے اپنے دست مبارک سے علم حضرت اسامہؓ کے ہاتھ میں دیا تھا اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو اس لشکر میں ان کے ساتھ بھیجا تھا۔ نبی اکرم ﷺ کا وصال ہو گیا تو یہ مہم رک گئی۔ حضرت ابوبکرؓ خلیفہ اول منتخب ہوئے تو مدعیان نبوت اور فتنۂ ارتداد کی وجہ سے صحابہ کرام کی رائے ہوئی کہ اس مہم کو روک دیا جائے اور مدینہ کی حفاظت پر اولین توجہ دی جائے۔ حضرت عمرؓ بھی اسی رائے کے حق میں تھے۔ مگر صدیق اکبرؓ اپنے موقف پر پہاڑ کی طرح اٹل تھے۔ فرمایا:

والذى نفس أبى بكر بيده، لو ظننت أن السباع تخطفنى لأنفذت بعث أسامة كما أمر به رسول الله ﷺ ولو لم يبق فى القرىٰ غيرى لأنفذته۔(۱۰)

(قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں ابوبکر کی جان ہے۔ اگر مجھے گمان ہو کہ درندے

مجھے بھنبھوڑ کھائیں گے تب بھی میں اسامہ کو رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق اس مہم پر روانہ کروں گا۔ خواہ مدینہ اس طرح خالی ہو جائے کہ میں اکیلا ہی رہ جاؤں تب بھی میں وصیت نبوی کو نافذ کروں گا۔)

اسی لیے اللہ کے رسول نے ابوبکرؓ کو تمام صحابہ پر فضیلت دی تھی۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے خطبہ میں فرمایا:

إن الله خيَّر عبدا بين الدنيا و بين ماعنده، فاختار ذالك العبد ما عند الله۔

(اللہ نے ایک بندے کو اختیار دیا کہ وہ دنیا کو منتخب کر لے یا اللہ کے پاس موجود مقام کو۔ اس بندے نے اللہ کے پاس موجود مقام کو ترجیح دی۔)

راوی کہتے ہیں، ابوبکر رو پڑے، ہمیں ان کے رونے پر بڑا تعجب ہوا کہ رسول اللہ ﷺ ایک بندے کے بارے میں خبر دے رہے ہیں کہ اسے اختیار وانتخاب کا حق عطا کیا گیا، اور یہ رو رہے ہیں! معلوم ہوا کہ وہ بندہ خود رسول اللہ تھے اور ابوبکر ہم سے کہیں زیادہ آگاہ تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

إنَّ مـن أمـنِّ الـنـاس عـلىّ فى صحبته و ماله أبابكر و لو كنتُ متخذا خليلا غير ربى لاتخذت ابابكر ولكن اخوة الاسلام و مودته۔ لايبقين فى المسجد باب الا بابُ ابى بكر۔(۱۱)

(میرے اوپر رفاقت اور دولت کا سب سے بڑا احسان ابوبکر کا ہے۔ اگر میں کسی کو اپنے رب کے سوا اپنا رازداں اور جگری دوست بناتا تو ابوبکر کو بناتا۔ اب تو اسلام کی اخوت اور محبت کا رشتہ ہی سب کچھ ہے۔ دیکھو مسجد کی طرف کسی کا دروازہ کھلا نہ رہے سوائے ابوبکر کے دروازے کے۔)

یہ روایت متعدد طرق سے مروی ہے۔ ایک طریق کے الفاظ کچھ مختلف ہیں مگر مفہوم وہی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

لو كنت متخذا خليلاً لاتخذته خليلاً ولكن اخوة الاسلام افضل۔(۱۲)

(اگر میں کسی کو جگری دوست بناتا تو ابوبکر کو بناتا، لیکن اسلامی اخوت افضل ہے۔)

آج دنیا بھر میں پھیلے ہوئے شمع رسالت کے پروانے قرآن کریم کی اس ایمانی تصویر کو حرز جاں بنالیں تو کایا پلٹ سکتی ہے:

☆ آپس میں رحم دل ☆ کافروں پر سخت

شاعر مشرق نے اسی آیت کی ترجمانی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

وہ مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہیں تو اسی آیت قرآنی کی تذکیر کرتے ہیں

گزر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہوجا

فکر کی صحت و شفافیت

مسلمانوں کے عروج و زوال کی تاریخ پر جن کی گہری نظر ہے وہ یہ ادراک رکھتے ہیں کہ کفر کے مقابلے میں سختی اور اہل اسلام کے لیے نرمی وچشم پوشی کا رویہ جب تک باقی رہا مسلمانوں نے اقوام عالم کی قیادت کی۔ سیاست و معیشت اور علم و تہذیب کے کارواں کے امیر بن کے رہے۔ کفر کے مقابلے میں وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنے۔ اصولوں پر عمل درآمد کی سختی نے انہیں چٹان کی طرح مستحکم بنائے رکھا۔ خدمت انسانیت کے جذبے نے انہیں محبوب عالم بنایا اور فکری و تخلیقی قوتوں کے استعمال نے پوری دنیا کو ان کے زیر نگیں کیا۔

ڈاکٹر عبدالحمید احمد ابوسلیمان مسلمانوں کے عروج و ترقی کا تجزیہ اسی طرح کرتے ہیں۔ دور رسالت میں انسانیت کی تہذیبی قیادت کو وہ دو عناصر کے اجتماع سے موسوم کرتے ہیں:

۱۔ عقیدہ کا تعمیری اور ایجابی کردار

۲۔ فکر و تہذیب کی معاصر دنیا پر برتری اور تفوق۔ (۱۳)

اللہ کے رسول ﷺ نے عقیدہ توحید کی تعلیم دے کر تمام اوہام و خرافات، توہمات و طلسمات اور مذہبی و سماجی اجارہ داریوں کا خاتمہ کر دیا۔ دور صحابہ میں یہ شفاف عقیدہ قرآن و سنت ہی پر استوار تھا۔ انسان کو فکری آزادی عطا ہوئی تھی اور اس آزادئ فکر نے انسانی قابلیتوں کو پروان چڑھنے کا بھرپور موقع فراہم کیا تھا۔ قرآن نے نبی کی بعثت کا مقصد ہی یہ بتایا تھا کہ وہ تمام بندشوں اور قدغنوں کو توڑنے کے لیے آئے ہیں۔ تورات و انجیل میں ان کی آمد کی بشارتیں لکھی ہوئی ہیں اور وہ تمام قانونی موشگافیوں اور زہد کے مبالغوں سے انسانیت کو نجات دلانا چاہتے ہیں۔ خود ساختہ حدود و قیود سے زندگی بوجھل بن گئی ہے وہ اس بوجھ کو اتارنا اور اس بندش کو توڑ کر زندگی کو آزاد کرنے کے لیے تشریف لائے ہیں:

الَّـذِيـنَ يَتَّبِـعُـونَ الـرَّسُولَ النَّبِيَّ الأُمِّيَّ الَّذِيُ يَجِدُونَهُ مَكْتُوباً عِندَهُمُ فِيُ التَّوُرَاةِ وَالإِنُـجِيُلِ يَأُمُرُهُم بِالْمَعُرُوفِ وَيَنُهَاهُمُ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَـلَيُهِـمُ الُـخَبَـآئِـثَ وَيَـضَعُ عَنُهُمُ إِصُرَهُمُ وَالْأَغُلاَلَ الَّتِيُ كَانَتُ عَلَيُهِمُ فَالَّذِيُنَ آمَـنُـواُ بِـهِ وَعَـزَّرُوهُ وَنَـصَـرُوهُ وَاتَّبَـعُـواُ الـنُّـورَ الَّـذِيَ أُنـزِلَ مَـعَـهُ أُوُلَـئِكَ هُمُ الُمُفُلِحُونَ۔ (الاعراف:۱۵۷)

(جواس پیغمبر نبی امی کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے، اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔)

صحابی رسول حضرت ربعی بن عامرؓ نے سپہ سالار ایران رستم کے دربار میں اسی آزادئ فکر اور توحیدی مشن کا اعلان کیا تھا۔ علامہ ابن کثیرؒ (۱۳۰۱۔۱۳۷۳ء) نے البدایۃ والنھایۃ میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ایرانی سپہ سالار کا جاہ وجلال اور اس کے دربار کی شان وشوکت سفیر اسلام کو ذرا مبہوت نہ کرسکی۔ رستم نے جب آمد کا مقصد پوچھا تو صحابی رسول نے ادائے بے نیازی سے جواب دیا:

ابتعثنا الله لنخرج من شاء من عبادة العباد الی عبادة الله و من ضیق الدنیا الی سعتها و من جور الادیان الی عدل الاسلام۔ (۱۴)

(اللہ نے ہمیں مبعوث کیا ہے کہ جس کے بارے میں اس کی مرضی ہو اس کو بندوں کی بندگی سے نجات دلا کر اللہ کی بندگی میں داخل کریں۔ دنیا کی تنگیوں سے نکال کر اس کی وسعتوں میں داخل کریں اور مذاہب کے ظلم سے چھٹکارا دلا کر اسلام کے انصاف کے سایے میں لے آئیں۔)

تہذیب کا تفوق

دور رسالت میں فکر وتہذیب کی معاصر برتری کا ثبوت ڈاکٹر ابوسلیمان یہ فراہم کرتے ہیں کہ جنگ بدر میں رسول اللہ ﷺ نے قریشی تجارت کی شہ رگ کاٹ دی ان کا معاشی محاصرہ کر کے۔ غزوہ

احزاب میں مدینہ کے چاروں طرف خندق کھدوا کے ایرانی حربی حکمت عملی سے استفادہ کرنے میں کوئی فکری رکاوٹ پیش نہ آئی۔ صلح حدیبیہ میں محیر العقول ڈپلومیسی کا مظاہرہ کر کے دس سالہ معاہدہ پر دستخط ہوئے اور دشمنان دین کا حلقہ تنگ کر دیا۔ فتح مکہ کے موقع پر عظیم ترین جنگی تدبیریں اختیار کر کے خون خرابہ کیے بغیر اہل مکہ کو ہتھیار ڈالنے پر آمادہ کیا اور دشمنوں کے لیے یہ اعلان کیا:

لا تثریب علیکم الیوم إذهبوا أنتم الطلقاء۔ (۱۵)

(آج تم پر کوئی سرزنش نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔)

اور فاتح اعظم ﷺ نے بدترین دشمنوں کے دل جیت لیے۔ وہ بے ساختہ پکار اٹھے:

أخٌ کریمٌ وإبن أخٍ کریمٍ

(آپ ایک شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں)

رومیوں کے خلاف یرموک کی فیصلہ کن جنگ میں مسلمان فوجوں کی مدد کے لیے صحرائے شام کو پار کرنے کی بے نظیر عبقریت کا مظاہرہ رسول اللہ نے کیا۔ دیوان قائم ہوئے۔ سیاسیات کی منصوبہ بندی ہوئی۔ اصول وقواعد اور ادارے وتنظیمات وجود میں آئیں۔ مسجدوں کو علوم وفنون کی اشاعت اور امت کی تعلیم وتربیت کا مرکز بنایا گیا۔ یہ سب امت مسلمہ کی فکری وذہنی برتری کی نمایاں شہادتیں تھیں جن کے ذریعہ رسول اللہ اور آپ کے جاں نثار اصحاب نے اردگرد کی فاسد اور بوسیدہ تہذیبوں کو مسمار کر دیا تھا۔ قبائلی نظاموں کو شکست دے دی تھی۔ (۱۶)

ڈاکٹر ابوسلیمان کا تجزیہ ہے کہ آج مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ مطلوب ہے تو انہیں ان دونوں ستونوں پر اپنی سعی وجہد کی عمارت تعمیر کرنا ہوگی۔ صدیوں کے جمے جمائے تقلیدی افکار ورسوم سے دست کشی کرنا ہوگی۔ توہمات اور طلسمات کی دنیا سے باہر نکلنا ہوگا۔ عقیدہ توحید کا آفتاب آج غیر اسلامی رسوم و نظریات کی بدلیوں میں روپوش ہو گیا ہے۔ شرک اور الحاد نے اس کی شادابی کو ماند کر دیا ہے۔

الطاف حسین حالیؒ (۱۸۳۷۔۱۹۱۴ء) کے یہ اشعار آج بھی مسلم امت پر صادق آتے ہیں:

کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر — جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر — کہے آگ کو اپنا قبلہ تو کافر
مگر مومنوں پہ کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں

نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں　　اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ جاجاکےنذریں چڑھائیں　　شہیدوں سےروروکے مانگیں دعائیں

نہ توحید میں کچھ فرق اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

جہاد و اجتہاد کا تلازم

دوسری طرف ایک فعال اور خادم انسانیت فکر کو پروان چڑھانا ہوگا۔تہذیب اسلامی کی تشکیل اور فرائض خلافت کی مؤثر ادائیگی کے لیے معاصر تہذیبوں اور نظریات کے مقابلہ میں برتر اور مفید تر مثالیہ فراہم کرنا ہوگا اور اسی صورت میں یہ ممکن ہوگا جب وحی اور عقل کے درمیان کامل توافق ہو۔روایت اور جدت میں تطابق کی صورت نکلے۔نصوص اسلامیہ سے مکمل وابستگی ہو اور معاصر حالات کا بھرپور ادراک بھی۔(۱۷) مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (۱۹۱۳۔۱۹۹۹ء) نے اسی حقیقت کو جہاد و اجتہاد کے اجتماع سے تعبیر کیا ہے۔

سورہ الحج کی آخری آیات میں جہاد واجتہاد کے تمام مضمرات کو قرآن نے سمیٹ لیا ہے۔ پہلے رکوع وسجود اور عبادت کا حکم دیا گیا مگر اس کے ساتھ خدمت خلق کے فریضہ کی ادائیگی کا حکم دے کر عبادت و خدمت کے تلازم کو واضح کیا گیا۔ بندگی اپنے رب کی اور خدمت انسانیت کی۔ یہ دونوں عناصر جمع ہو جائیں تو کامیابی مقدر ہو جاتی ہے۔فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔ (الحج:۷۷)

(اے لوگو! جو ایمان لائے ہو رکوع اور سجدہ کرو، اپنے رب کی بندگی کرو، اور نیک کام کرو، اسی سے توقع کی جاسکتی ہے کہ تم کو فلاح نصیب ہو۔)

یہاں فعل الخیر سے مراد خدمت خلق ہے۔حضرت ابن عباسؓ سے یہی منقول ہے۔

اس کے بعد فرمایا:

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِي هَذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيداً عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاء عَلَى النَّاسِ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا

الزَّكَاةَ وَاعۡتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ مَوۡلَاكُمۡ فَنِعۡمَ الۡمَوۡلَى وَنِعۡمَ النَّصِيرُ۔ (الحج:۷۸)

(اللہ کی راہ میں جہاد کرو، جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تمہیں اپنے کام کے لیے چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیمؑ کی ملت پر۔ اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (تمہارا یہی نام ہے) تا کہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ۔ پس نماز قائم کرو، زکوۃ دو اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ، وہ ہے تمہارا مولیٰ، بہت ہی اچھا ہے وہ مولیٰ اور بہت ہی اچھا ہے وہ مددگار۔)

اس آیت میں جہاد اور شہادت حق کا ایک ساتھ تذکرہ ہے۔ جہاد اپنے تمام مفاہیم و مضمرات کے ساتھ اور تن من دھن سے جی جان کی بازی لگا کر مطلوب ہے۔ اس میں قتال کا معنیٰ بھی شامل ہے۔ نفس امارہ کے خلاف مجاہدہ بھی شامل ہے اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے ہر جدوجہد بھی۔ حق جہادہ سے یہ تنبیہ کر دی گئی کہ کمزوری اور نیم دلی کے ساتھ جدوجہد کرنا مطلوب نہیں ہے۔ آگے شہادت حق کے بارگراں کا تذکرہ ہے اور شہادت مؤثر اور دل پذیر اسی وقت ہوگی جب اس میں مخاطب کی نفسیات اور حکمت و بصیرت کی بھرپور رعایت ہو اور حالات کا مکمل ادراک ہو۔ یہ کام ذہنی و فکری قوتوں کے استعمال اور اجتہاد کے بغیر ممکن نہیں۔ ورنہ وہ خالی خولی تبلیغ ہو کر رہ جائے گی۔ معاشرہ پر اس کا کوئی اثر ہوگا نہ کوئی تبدیلی فرد اور سماج میں ممکن ہو سکے گی۔ قرآن نے اسی لیے ہدایت کی:

ادۡعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ وَالۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ وَجَادِلۡهُم بِالَّتِيۡ هِيَ أَحۡسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعۡلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِيۡن۔ (النحل:۱۲۵)

(اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو، تمہارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہ راست پر ہے۔)

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے مطابق جہاد سے مراد ہے عزیز ترین اور اہم ترین مطلوب کے حصول کے لیے اپنی انتہائی طاقت اور وسائل صرف کر دینا۔ ''مسلمان کا سب سے بڑا مقصود اللہ کی فرماں برداری، اس کی خوشنودی کا حصول، اور اس کی بادشاہی اور احکام کے سامنے سپردگی اور سرافگندگی ہے۔ اس کے لیے ایک طویل جہاد کی ضرورت ہے، ہر اس عقیدہ، تربیت، اخلاق، اغراضات اور خواہشات کے خلاف جو اس میں مزاحم ہوں، اور ان تمام نفسی و آفاقی آلہہ و معبودانِ باطل کے خلاف جو اللہ کی فرماں

برداری اور اخلاص میں حریف اور رقیب ہوں۔‘‘(۱۸) اس مقصد کے حصول کے بعد خدا کی بادشاہی کو گردوپیش کی دنیا پر قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرنا ہر مسلمان کا دینی فریضہ ہے۔ خدا کی مخلوق پر شفقت اور اس کے ساتھ خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ مسلمان فتنہ کی سرکوبی کے لیے سربکف ہو۔

مولانا ندویؒ نے اس جہاد کے دو اہم تقاضے شمار کرائے ہیں:

ا۔ مسلمان اس اسلام سے بخوبی واقف ہو جس کی خاطر وہ جہاد کررہا ہے۔ اور کفر و جاہلیت کے بارے میں بھی، جس کے خلاف وہ جہاد کررہا ہے اس کو گہری واقفیت ہوتا کہ جس لباس اور جس رنگ میں بھی ظاہر ہو، اس کو پہچان لے۔

۲۔ جو لوگ جہاد کی فرضیت کی ادائیگی کرنا چاہتے ہیں ان کی تیاری بھرپور اور ان کی قوت مکمل ہو۔ ان کے پاس لوہے کو کاٹنے کے لیے لوہا بلکہ فولاد ہو۔ وہ کفر کا مقابلہ ان تمام وسائل اور سامان سے کریں جو ان کی دسترس میں ہو، جس کا انسان اکتشاف کرسکا ہو اور جہاں تک انسان کے علم کی رسائی ہو۔(۱۹)

اجتہاد سے مولانا ندویؒ کی مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کی سیادت و امامت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہو وہ نئے پیش آنے والے مسائل زندگی میں انفرادی و اجتماعی طور سے صحیح فیصلہ کرنے کی اہلیت اور استعداد رکھتے ہوں۔

اجتہاد کے لیے ضروری ہے کہ اصحاب امر اتنی بصیرت و ذکاوت، علم اور مستعدی رکھتے ہوں اور اتنی محنت اور جفاکشی کے لیے تیار ہوں کہ اللہ نے کائنات میں جو طبعی قوتیں پیدا کی ہیں اور زمین میں دولت و قوت کے جو چشمے اور دفینے رکھ دیے ہیں ان سے کام لے سکیں اور ان کو اسلام کے کاز کے لیے مفید بنا سکیں۔(۲۰)

اسلام کی امامت کے لیے ان دو صفات کی ناگزیریت واضح ہے۔ اور یہ دونوں صفات صحابہ کرام کے اندر بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ جبھی وہ اس دنیا میں سرخ رو ہوئے اور ان کے بارے میں خود قرآن نے اعلان کیا:

رَّضِيَ اللّهُ عَنْهُمْ وَرَضُواْ عَنْهُ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ۔ (المائدہ:۱۱۹)

(اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے، یہی بڑی کامیابی ہے۔)

....

حواشی و تعلیقات

۱۔مودودی سید ابوالاعلی، سیرت سرور عالم، ادارہ ترجمان القرآن لاہور، مرتبین: نعیم صدیقی اور عبدالوکیل علوی، محرم الحرام ۱۴۰۱ھ/دسمبر ۱۹۸۰ء۔ص ۳۵۴۔۳۶۲

۲۔حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کواللہ کی بندگی کی دعوت دی اور تجارت میں خیانت اور بددیانتی سے روکا تو انہوں نے اسی دنیا پرستی کا مظاہرہ کیا۔ وہ بھی بندگی رب کو پرائیوٹ معاملہ قرار دینے اور اپنے تمدن، معاشرت، سیاست اور اجتماعی زندگی کو اس کے دائرہ اثر سے آزاد رکھنے پر یقین رکھتے تھے۔ دین و دنیا کی یہ تقسیم آج سے تین ساڑھے تین ہزار سال پہلے قوم مدین کو بہت بھاتی تھی اور آج مغرب کے دانش وروں کی طرح وہ بھی اسے روشن خیالی تصور کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے جواب دیا:

يَا شُعَيْبُ أَصَلاَتُكَ تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَن نَّفْعَلَ فِيْ أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءِ۔ (ہود:۸۷)

(اے شعیبؑ، کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟ یا یہ کہ ہم کو اپنے مال میں اپنے منشا کے مطابق تصرف کرنے کا اختیار نہ ہو؟)

۳۔سورہ ہود آیت ۶۱ میں اللہ نے حضرت صالح علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا ہے:

فَاسْتَغْفِرُوهُ ثُمَّ تُوبُواْ إِلَيْهِ إِنَّ رَبِّي قَرِيبٌ مُّجِيب۔

(پس تم اللہ سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ، یقیناً میرا رب قریب ہے اور وہ دعاؤں کا جواب دینے والا ہے۔)

یہ مشرکین کی اس غلط فہمی کا جواب ہے کہ خداوند عالم کا آستانۂ اقدس عام انسانوں کی دست رس سے بہت دور ہے۔ اس لیے پاک روحوں کا وسیلہ ضروری ہے۔ اس غلط فہمی نے خدا اور بندے کے درمیان بہت سے معبودوں اور سفارشیوں کا ایک جم غفیر کھڑا کر دیا اور اس کے ساتھ مہنت گری کا وہ نظام پیدا کیا جس کے توسط کے بغیر جاہلی مذاہب کے پیرو پیدائش سے لے کر موت تک اپنی کوئی مذہبی رسم بھی انجام نہیں دے سکتے۔ تفہیم القرآن، جلد دوم، سورہ ہود، حاشیہ ۶۹۔

۴۔سورہ الصّف:۹ اور سورہ التوبہ:۳۳ میں یہی مفہوم زیادہ زور اور صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا۔ اور مشرکین کی ناز برداری سے صرفِ نظر کرنے کا حکم دیا گیا:

هُوَ الَّذِیْ أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهُ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهِ وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُون۔

(وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ اسے پوری جنس دین پر غالب کردے، خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔)

۵۔سورہ المائدہ: ۵۴ میں اللہ نے اہل ایمان کی ان صفات کو دوسرے لفظوں میں بیان کیا ہے:

یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُواْ مَن یَرْتَدَّ مِنکُمْ عَن دِیْنِهِ فَسَوْفَ یَأْتِیْ اللّهُ بِقَوْمٍ یُحِبُّهُمْ وَیُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ أَعِزَّةٍ عَلَی الْکَافِرِیْنَ یُجَاهِدُونَ فِیْ سَبِیْلِ اللّهِ وَلاَ یَخَافُونَ لَوْمَةَ لآئِمٍ ذَلِکَ فَضْلُ اللّهِ یُؤْتِیْهِ مَن یَشَاءُ وَاللّهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ۔

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اور بہت سے ایسے لوگ پیدا کردے گا جو اللہ کو محبوب ہوں اور اللہ ان کو محبوب ہوگا، جو مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے۔ جو اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔اللہ وسیع ذرائع کا مالک ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔)

۶۔بخاری محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، کتاب المناقب، باب صفۃ النبی ﷺ، حدیث: ۱۷۷۔

۷۔نفس مصدر، حدیث ۲۷۷

۸۔نفس مصدر، باب بدء الوحی، حدیث ۳۔

۹۔نفس مصدر، کتاب الکفالۃ، باب جوار ابی بکر فی عہد النبی ﷺ وعقدہ، حدیث: ۲۱۷۵۔

۱۰۔طبری ابن جریر، تاریخ الطبری (تاریخ الرسل والملوک)، تحقیق: محمد ابوالفضل ابراہیم، دارالمعارف مصر، ۱۹۶۲ء، الجزء الثالث، ص ۲۲۵۔

۱۱۔بخاری الجامع الصحیح، کتاب فضائل الصحابۃ، باب قول النبی سدوا الابواب إلا باب ابی بکر، حدیث ۳۴۵۴۔

۱۲۔نفس مصدر، باب فضل ابی بکر بعد النبی ﷺ، حدیث ۳۴۵۶۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اپنی کتاب کے آخر میں بڑا جامع تبصرہ کیا ہے۔حضرت ابوبکرؓ کی حیات طیبہ کے پوری مرقع پر غور سے نظر ڈالیے تو اس آئینہ میں ایک ایسے انسان کی شکل وصورت نظر

آ ئے گی جو ہر حیثیت سے مکمل ہے، جس میں انسانی کمالات واوصاف بیک وقت سمٹ کر جمع ہو گئے ہیں۔ فاضل مصنف کہتے ہیں کہ ایک انسان کی تکمیل کا دارو مداراس کی ان باطنی قوتوں کی اعلیٰ تربیت و تہذیب پر موقوف ہے جو قدرت نے اس کے اندر ودیعت کردی ہیں۔ یہ قوتیں اصولی طور پر دو ہیں: ایک قوت نظری اور دوسری قوت عملی، پہلی قوت کے اعتدال سے جو اوصاف و کمالات پیدا ہوتے ہیں وہ شجاعت، سخاوت، عفت، غیرت وحلم، خود داری وغیرہ ہیں۔ کسی شخص میں ان تمام اوصاف و کمالات کا جمع ہوجانا انسانی سعادت وخوش نصیبی کی معراجِ کمال ہے اور قران مجید میں اسی کو خیر کہا گیا ہے۔ اور فرمایا گیا:

يُؤتِيُ الُحِكُمَةَ مَن يَشَاءُ وَمَن يُؤُتَ الُحِكُمَةَ فَقَدُ أُوتِيَ خَيُراً كَثِيُرا۔ (البقرہ:۲۶۹)

(وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے، اور جس کو حکمت ملی، اسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی۔)

مولانا اکبرآ بادی کہتے ہیں کہ اگر چہ عمومی طور پر اس وصف خاص میں دوسرے صحابہ کرام بھی حضرت ابوبکرؓ کے شریک ہیں لیکن جس طرح نیکی نیکی اور حسن حسن میں فرق مراتب ہوتا ہے اسی طرح حکمت حکمت میں بھی مدارج ومنازل کا بڑا فرق وامتیاز ہے۔ اسی فرق کے اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کا مقام سب سے اونچا تھا اور وہ حکمت وسعادت کے اس نقطۂ عروج پر فائز تھے جو نبوت سے نیچے اور سب سے اونچا ہوتا ہے۔ دیکھئے اکبرآ بادی سعید احمد، صدیق اکبرؓ، ندوۃ المصنفین، اردو بازار جامع مسجد دہلی، نومبر ۱۹۵۷ء، ص ۴۷۔

۱۳۔ ابوسلیمان، عبدالحمید احمد، ازمۃ العقل المسلم، اردو ترجمہ، ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی، فکر اسلامی کا بحران، ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور، اکتوبر ۲۰۰۱ء، ص ۴۷۔

۱۴۔ القرشی ابن کثیر، البدایۃ والنھایۃ فی التاریخ، مطبعۃ السعادۃ مصر، الجزء السابع، ص ۳۹۔۴۰

۱۵۔ مبارک پوری صفی الرحمٰن، الرحیق المختوم، المجلس العلمی علی گڑھ، شعبان المعظم ۱۴۰۸ھ/اپریل ۱۹۸۸ء، ص ۶۳۳۔

۱۶۔ فکر اسلامی کا بحران، حوالہ بالا، ص ۴۷۔

۱۷۔ نفس مصدر، ص ۴۸۔

۱۸۔ ندوی سید ابوالحسن علی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، مکتبہ اسلام گوئن روڈ

لکھنؤ،ص۱۸۴۔

۱۹۔نفس مصدر،ص ۱۸۶۔۱۸۷، فاضل مصنف نے اپنے موقف کی حمایت میں قرآن سے استدلال کیا ہے۔قرآن کہتا ہے:

وَأَعِدُّواْ لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدْوَّ اللّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لاَ تَعْلَمُونَهُمُ اللّهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنفِقُواْ مِن شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لاَ تُظْلَمُونَ۔(انفال:۶۰)

اس آیت کا ترجمہ مولانا ندویؒ اس طرح کرتے ہیں:

(مسلمانوں جہاں تک تمہارے بس میں ہے قوت پیدا کرکے اور گھوڑے تیار رکھ کر دشمنوں کے مقابلہ کے لیے اپنا ساز وسامان مہیا کیے رہو کہ اس طرح مستعد رہ کر تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں پر دھاک بٹھائے رکھوگے، نیز ان لوگوں کے سوا اوروں پر بھی جن کی تمہیں خبر نہیں، اللہ انہیں جانتا ہے اور اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد کی تیاری میں) جو کچھ بھی تم خرچ کروگے وہ تمہیں پورا پورا مل جائے گا، ایسا نہ ہوگا کہ تمہاری حق تلفی ہو۔)

۲۰۔نفس مصدر،ص ۱۸۸

سیرت نبوی ﷺ کی معنویت

(قرآن مجید کی روشنی میں)

ظفر احمد الاثری، لندن، ای میل: asarizafar@hotmail.com

قرآن کا نزول شروع ہوا اور دعوت و تحریک کی تاریخ لکھی جانے لگی، اور اس تاریخ میں انبیاء کرام کی تاریخ بھی جستہ جستہ پورے تیئیس سال میں بیان ہوتی گئی، اور واقعات قلم بند ہوتے چلے گئے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ کی سیرت اور اور آپ کی دعوت و تبلیغ کی تفصیلات مختلف انداز میں بیان ہونا شروع ہوگئیں۔ قرآن مجید میں مکی اور مدنی زندگی کی تمام جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔ قرآن مجید میں توحید، رسالت اور معاد پر آفاق و انفس کے دلائل، دعوت اسلامی کے مکی اور مدنی مراحل کا تذکرہ، اور دعوت اور اس کے اصول و مبادی پر مختلف انداز سے ہدایات ملتی ہیں۔ انبیاء کرام کا طریقہ دعوت غرضیکہ دعوت اسلامی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کا تذکرہ ہونے سے رہ گیا ہو، اور جو امت مسلمہ کی دعوتی ضرورتوں میں شمار ہوتا ہو۔ وہ تمام شرعی احکام جو نبیؐ کو دیے گئے ان کا تذکرہ ہے، زندگی گزارنے کا مکمل طریقہ اور ضابطہ حیات اس میں موجود ہے، اور پھر اس کی تفصیل و تشریح اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے اقوال اور اعمال سے فرمائی اور یہی دونوں قرآن و سنت شریعت کے مأخذ ہیں۔ قرآن نے اسی حقیقت کو اس طرح واضح کیا ہے:

> ''اللہ نے اہل ایمان پر احسان فرمایا جبکہ ان کے اندر خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور اس سے پہلے تو وہ کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔''(۱)

اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی ذمہ داری تھی کہ قرآن پڑھ کر لوگوں کو سنائیں، اس کے اور تین مقاصد تھے۔ [۱] لوگوں کو کتاب اور احکام قوانین الٰہی کی تعلیم دینا۔ [۲] لوگوں کو حکمت اور دانائی کی تعلیم دینا [۳] اور لوگوں کا تزکیہ کرنا۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ جب خانہ کعبہ کی تعمیر کررہے تھے اس وقت انہوں نے بعینہ انہی تین مقاصد کے حصول کی دعا کی تھی کہ ایسا نبی مبعوث کر جو

ان تین عظیم مقاصد کو بروئے کار لا سکے۔قرآن کے نزول کے ساتھ ساتھ ہی نبی ﷺ کی زندگی کے اوراق لکھے جانے شروع ہو گئے تھے تا کہ وہ شریعت جو آپ ﷺ لے کر آئے ہیں وہ زندہ جاوید ہو جائے۔

حضور ﷺ کی زندگی ہی میں آپ ﷺ کے اقوال و افعال کی تصنیف شروع ہو گئی تھی۔ ''کتابت حدیث کا آغاز سرور کائنات ﷺ کی زندگی میں ہو چکا تھا'' (۲) ''عبداللہؓ بن عمرو بن عاصؓ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ سے جو کچھ سنتا تھا وہ لکھ لیتا تھا۔لوگوں نے مجھے اس سے منع کیا اور کہا رسول اللہ ﷺ ایک انسان ہیں کبھی رضا کی حالت میں بولتے ہیں اور کبھی غضب کی حالت میں تم سب کچھ لکھ ڈالتے ہو؟ اس پر میں نے فیصلہ کیا کہ جب تک حضور ﷺ سے نہ پوچھ لوں آپ کی کوئی بات نہ لکھوں پھر جب حضور ﷺ سے میں نے پوچھا تو آپؐ نے اپنے منہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اکتب فوالذی نفسی بیدہ ما یخرج منہ الا حق ''لکھو، اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس منہ سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا'' (۳)

کتابت حدیث کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ نے زبانی نقل اور روایت کے سلسلہ میں بھی کھلی اجازت بلکہ تاکید فرمائی۔حضور ﷺ نے فرمایا:

ألا فليبلغ الشاهد منكم الغائب فان الشاهد عسى أن يبلغ من هو أوعى له منه۔(۴)

''یاد رکھو، تم میں جو حاضر ہیں وہ غیر حاضر تک میری بات پہنچا دیں، ممکن ہے موجود لوگ جن لوگوں تک بات پہنچائیں گے وہ سننے والوں سے زیادہ سمجھنے کے اہل ہوں''۔

نبی ﷺ کی دعوت اور طریقہ کار

تمام انبیاء کی طرح آپ ﷺ نے بھی شرک کا ابطال کیا اور توحید کی دعوت دی۔ ''آغاز میں اسلام کی بنیادی تعلیمات بیان کی گئیں اور وہ یہ تھیں؛ توحید و رسالت اور آخرت۔قرآن ان تین بنیادی باتوں کو پورے مکی دور میں مختلف انداز میں پیش کرتا رہا۔نہایت مؤثر انداز میں اور چھوٹے چھوٹے فقروں کے ذریعہ ذہن میں انہیں بٹھایا گیا۔اس کے ساتھ ہی اخلاقی اوصاف اور نیک اعمال بیان کیے گئے اور مکی دور میں اخلاقی برائیوں کی شدید مذمت کی گئی۔دعوت کا یہی مرکزی مضمون رہا، پھر بتدریج دوسرے مسائل کی طرف توجہ دی جانے لگی، صبر و نماز کی تلقین کی گئی، اور شبہات اور اعتراضات کے جوابات بھی دیے جاتے رہے، کفار کے سامنے فہمائش اور تنبیہ دونوں کے ذریعہ دعوت پیش کی گئی۔

ناصحانہ انداز میں تنبیہ وملامت کی گئی اور معلمانہ انداز میں فہمائش کی گئی۔ رسالت کے بارے میں شبہات کا جواب دیا گیا۔ شرک کی لغویت اور نا معقولیت اور توحید کی صداقت اور معقولیت سمجھائی گئی۔ مکی دور کے آخری زمانہ میں انذار کا پہلو غالب رہا۔ مگر بار بار انذار کے ساتھ استدلال سے بھی تفہیم کی گئی، اور یہ کہ انسان خالص اللہ کی بندگی کرے اور کسی دوسرے کی اطاعت وعبادت سے اپنی خدا پرستی کو آلودہ نہ کرے۔ اس اصل الاصول کو بار بار مختلف انداز سے پیش کرتے ہوئے نہایت زوردار طریقے پر توحید کی حقانیت اور اسے ماننے کے عمدہ نتائج اور شرک کی غلطی اور اس پر جمے رہنے کے برے نتائج کو واضح کیا گیا۔ قریش اور اہل عرب کے جاہلانہ اوہام پر تنقید کی گئی ہے، جن پر وہ اصرار کیے چلے جا رہے تھے اور نہایت محکم ودل نشین طریقے سے ان کی معقولیت کا پردہ فاش کیا، تاکہ معاشرے کا ہر فرد جس کے اندر کچھ بھی معقولیت ہے وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ آخر یہ کیسی جہالتیں ہیں جن سے ہماری قوم بری طرح چمٹی ہوئی ہے۔'' (۵) پھر اس کے ساتھ ہی ایک مسلم معاشرہ کی تشکیل کے لیے احکام وفرامین نازل ہوئے اور ایک پوری شریعت مکمل کر کے دے دی گئی۔ آپ ﷺ کو 'سب سے پہلے اپنے ان قرابت داروں کو عذاب سے ڈرانے کا حکم ہوا جو خانہ کعبہ کے کلید بردار اور متولی تھے۔ انبیاء علیہم السلام کا طریق دعوت ہمیشہ سے یہی رہا ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کی زجر وتوبیخ کے سب سے پہلے ہدف علماء یہود ہوئے، کیونکہ امانت الٰہی کے حامل ہونے کے سبب سب سے پہلے باز پرس کے وہی مستحق ہیں۔ علماء عوام کے لیڈر ہیں، اس لیے ہدایت واصلاح کی دعوت سب سے پہلے ان ہی کو مخاطب کرتی ہے تاکہ ان کی اصلاح عوام کا ذریعہ بنے۔ اگر انبیاء کرام علیہم السلام اپنی دعوت میں رہبران قوم سے چشم پوشی کر جاتے تو یہ دین کے معاملہ میں ایک ناجائز چشم پوشی ہوتی، اور اس سے دعوت حق کا تمام تانا بانا درہم برہم ہو جاتا۔ خواص کو بالکل نظر انداز کر کے صرف عوام کو دعوت دینا انبیاء کا طریقہ نہیں ہے۔ یہ طریق دعوت باغیوں اور طالبین ملک ودولت کا ہے جو ہمیشہ عوام کو ورغلا کر اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی مقام انبیاء کرام اور طالبین ملک وجاہ کے درمیان نقطۂ امتیاز ہے، جہاں سے دونوں جماعتوں کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں''۔ (۶)

جس طرح ''پہلے انبیاء نے عقائد کی تعلیم اپنی قوموں کی استعداد کے لحاظ سے دی تھی۔ اسی طرح خاتم الانبیا ﷺ نے عقائد کی تعلیم اس معیار کے لحاظ سے دی جو اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو عطا فرمایا ہے۔ دوسرے انبیاء نے جن قوانین کی تعلیم دی ان میں ان کی قوموں کے خاص مزاج اور ان کے خاص

خاص امراض کا لحاظ تھا لیکن اسلام کے قوانین میں کسی خاص قومی اور جماعتی مزاج اور رجحان کے لحاظ کے بجائے صرف مزاج انسانی کا لحاظ ہے۔ دوسرے انبیاء کو جو نظام زندگی خدا کی طرف سے عطا ہوا وہ صرف ان قوموں کی ضروریات کے اعتبار سے تھا اور آنحضرتؐ کے ذریعہ سے جو نظام زندگی دنیا کو ملا وہ کسی خاص قوم ہی کی ضروریات کو پورا نہیں کرتا بلکہ بنی نوع انساں کی تمام انفرادی و اجتماعی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔(۷)

یوں تو تمام انبیاء کی دعوت ایک تھی، اور وہ ہے شرک کا ابطال اور ایک خدا کی عبادت، البتہ طریقہ کار میں اختلاف رہا ہے۔ لیکن آپؐ کی دعوت اور ابراہیمؑ کی دعوت میں کئی پہلوؤں سے مماثلت ہے، پہلی چیز یہ کہ آپ نے توحید کا مرکز مکہ کو بنایا اور وہیں خانۂ کعبہ کی تعمیر کی اور اسی جگہ ایک نبی کی بعثت کی دعا کی جو ان کے مشن کو باقی رکھے، اور اس سے مراد آپ ﷺ تھے جو مکہ ہی میں پیدا ہوئے۔ اسی طرح نبی جب ہجرت کر جاتا ہے تو پھر وہ دوبارہ اس شہر میں واپس نہیں جاتا، حضرت ابراہیمؑ نے اپنے وطن کو خیر باد کہا اور دوبارہ واپس نہیں گئے، اسی طرح ہمارے نبی ﷺ نے مکہ سے ہجرت کی اور مدینہ کو اپنا مرکز بنایا، چنانچہ فتح مکہ کے بعد بھی وہاں نہیں رُکے بلکہ مدینہ واپس آ گئے۔ جب آپ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو آپ ﷺ نے مشرکین سے برأت کا اظہار کر دیا۔ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ نے کیا، جب ہجرت کرنے لگے تو انھوں نے اپنے والد اور اپنی قوم سے اپنی برأت اور دوری کا اظہار کیا۔ اور ''جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے پنڈتوں اور مہنتوں کے خاندان میں آنکھ کھولی تھی، اسی طرح حضرت محمد ﷺ نے بھی اس خاندان میں آنکھ کھولی جو صدیوں سے کعبہ کے تیرتھ کا مہنت بنا ہوا تھا۔ جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے اپنے ہاتھ سے خود اپنے خاندان کی مہنتی پر ضرب لگائی اسی طرح آنحضرت ﷺ نے بھی اس پر ضرب لگائی اور محض ضرب ہی نہیں لگائی بلکہ ہمیشہ کے لیے اس کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ پھر جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے تمام باطل عقیدتوں اور جھوٹے خداؤں کی خدائی مٹانے کے لیے جدوجہد کی اور ایک خدا کی بندگی کی طرف بلانے کی کوشش کی، بالکل وہی کام آنحضرت ﷺ نے بھی کیا اور اسی اصلی اور بے لوث دین کو تازہ کر دیا جسے حضرت ابراہیمؑ لے کر آئے تھے''۔(۸)

سب سے اہم بات یہ کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور قوم کو جن الفاظ سے خطاب کیا اور جس طرح انہیں رب کی بندگی کی طرف دعوت دی، کبھی ان کے لیے کافر اور مشرک کے الفاظ نہیں استعمال کیے، اور دعوت و تبلیغ کی ایک مدت گزر جانے کے بعد جب قوم ہٹ دھرمی پر اتر آئی اور بات یہاں تک

پہنچ گئی کہ وہ اُن کی جان کے در پے ہوگئے تو اس وقت اعلان برأت کر کے قوم سے الگ تھلگ ہو گئے، چنانچہ اس کے بعد رواداری اور تسامح کے سارے راستے بند ہو گئے، اب وہ جب تک توحید نہ اختیار کر لیتے اس وقت تک وہ ان سے اپنی برأت کا اعلان کرتے رہے، قرآن اس کا ذکر اس طرح کرتا ہے ''تمہارے لیے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ تم سے اور ان چیزوں سے جن کی تم اللہ کے سوا پوجا کرتے ہو، ہم بالکل بری ہیں، ہم نے تمہارا انکار کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے دشمنی اور بیزاری آشکارا ہوگئی، یہاں تک کہ تم ایک ہی خدا پر ایمان لاؤ''۔(۹)

اسی طرح نبی کریم ﷺ کی دعوت کا حال تھا انھوں نے بھی اسی صورتحال کا مقابلہ کیا اور اسی صورتحال سے دوچار ہوئے، آپ ﷺ ایک عرصہ تک اپنی قوم کو دعوت دیتے رہے، اور کبھی بھی انہیں کھلے طور پر کافر و مشرک کہہ کر نہیں پکارا، اور اس جیسے الفاظ نہیں استعمال کیے، ابتدائی سورتوں میں یـــــا أیھاالناس اور یا قوم کے الفاظ استعمال کیے، اسی طرح اہل کتاب کے لیے یا أھل الکتاب یا اس کے ہم معنی لفظ استعمال ہوئے، یہاں تک کہ فتح مکہ کے بعد تک منافقین کے لیے عام لفظ یا أیھا الذین آمنوا استعمال ہوا۔ لیکن جب قریش نے نبی ﷺ کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا تو آپ اللہ کے حکم سے ہجرت کر گئے۔ اس کے بعد کفار قریش کو اے کافرو! کے الفاظ سے خطاب کیا گیا۔ یہ اعلان برأت کے ساتھ اعلان جنگ بھی تھا۔ ''کہہ دو، اے کافرو! نہ میں پوجتا ہوں جسے تم لوگ پوجتے ہو اور نہ تم پوجتے ہو جسے میں پوجتا ہوں اور نہ میں پوجنے کا جسے تم لوگ پوجتے آئے اور نہ تم لوگ پوجنے کے جسے میں پوجتا ہوں، تمہیں تمہارا دین اور مجھے میرا دین۔(۱۰)

خانہ کعبہ کی تعمیر کا مقصد اور اس کے لیے دعا

حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ کی تعمیر کی اور اس بات کی دعا کی کہ ''اللہ تعالی اس ذریت میں سے جو وادی غیر ذی زرع میں آباد ہے ایک ایسی امت اٹھا جو اس شریعت کی جو اسلام کامل کی مظہر ہے، حامل ہو سکے اور ایک ایسا پیغمبر مبعوث فرمائے جو اس امت کو اس بارگراں کے اٹھانے کے قابل بنائے اور ان کو اس شریعت کی تعلیم دے''۔(۱۱) اور ''حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا اللہ تعالی نے قبول فرمائی، چنانچہ ان کی اولاد میں سے امت محمدیہ کو اٹھایا اور اس کے ذریعہ سے ملت ابراہیمی کی تکمیل فرمائی جس کی بنا اسلام کامل پر رکھی گئی تھی''۔(۱۲)

خانہ کعبہ کی اہمیت اس بات سے بھی ہے کہ حج کا پورا فلسفہ اسی گھر سے وابستہ ہے اور پوری شریعت کا اتمام یہیں آ کر ہوا جب آپ ﷺ حج کے لیے تشریف لائے۔ یہی وجہ ہے کہ یہود کو اس گھر سے اس قدر کد تھا کہ اس کی تاریخ مٹانے کی ہر طرح سے کوشش کی لیکن قرآن مجید نے ان کی تحریفات کا پردہ فاش کیا۔'' خانہ کعبہ کمال اسلام کی تصویر ہے، اس لیے کہ حضرت ابراہیمؑ نے وہیں اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی کا فیصلہ کیا اور پھر دونوں باپ بیٹوں نے مل کر اس کی تعمیر کی اور خدا سے اس کی قبولیت کی دعا کی۔ ہر چند یہود نے تورات میں اس قصہ کو بہت بدل ڈالا ہے۔ لیکن ان کا جھوٹ بالکل آشکارا ہے۔ انھوں نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا ہے کہ جہاں جہاں حضرت اسماعیلؑ کا نام تھا وہاں حضرت اسحاقؑ کا نام ڈال دیا ہے۔''(۱۳)

جب ابراہیمؑ اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ خانۂ کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے اس وقت انہوں نے یہ دعا کی:

رَبَّنَا وَاجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَيۡنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسۡلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبۡ عَلَيۡنَا إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ۔ رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيهِمۡ رَسُولاً مِّنۡهُمۡ يَتۡلُو عَلَيۡهِمۡ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتَابَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيهِمۡ إِنَّكَ أَنتَ العَزِيزُ الحَكِيمُ۔ (۱۴)

ترجمہ: ''اے رب، ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیع فرمان) بنا، ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا، جو تیری مسلم ہو، ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا، اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما، تو بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور اے رب، ان لوگوں میں خود انھی کی قوم سے ایک ایسا رسول اٹھائیو، جو انھیں تیری آیات سنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے۔ تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے''۔

یہ اس بات کی تمہید تھی کہ ایک نبی کی بعثت ہوگی اور اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ اس نبی کی بعثت اسی شہر مکہ میں ہوگی۔ اور ان آیات میں اس نبی کی ذمہ داریاں بھی بتا دی گئیں۔ تاکہ وہ ایک ایسی جماعت تیار کرے جو حضرت ابراہیمؑ کی وراثت کو قبول کر کے امت مسلمہ کا کردار ادا کرے۔ اس میں یہ خاص بات تھی کہ'' جس چیز کی دعا کی تھی، وہ مسلم بنانے کی دعا تھی نہ کہ یہودی یا نصرانی بنائے جانے کی''۔(۱۵) اور ''اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ محمد ﷺ کا ظہور دراصل حضرت ابراہیمؑ کی دعا کا جواب ہے''۔(۱۶)

رسول کی بعثت کے تین مقاصد بیان کیے گئے ہیں: لوگوں کو آسمان وزمین کے خالق ومالک کے احکام وفرامین اوران کے دلائل وبراہین سے آگاہ کرے گا۔لوگوں کی ذاتی تربیت کرے گا،اوران کی فکری صلاحیتوں کوغذادے گااورکتاب الٰہی پرغوروفکرکو بیدارکرے گا،اور پاک صاف کرے گااورنشوونما دے گا۔آپ ﷺ نے مکمل طور پراسی انداز سے اپنے اصحاب کی تربیت کی۔

چنانچہ اسی سورہ میں نبی کی بعثت اوراس کے مقاصد بتلانے کے بعد آیت ۲۴۳رمیں خانہ کعبہ کے حصول میں اس تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا جس میں مسلمانوں کو تنبیہ بھی ہے اوراس بات کے لیے کمر بستہ رہنے کے لیے کہا گیا ہے کہ خانہ کعبہ کی حیثیت مرکزی ہے اوراسے آزاد کرانا ایک دینی فریضہ ہےاوراس میں کسی قسم کی بزدلی دکھلانا اپنی ایمانی اوراخلاقی موت کودعوت دینا ہے''کیا تم نے ان لوگوں کونہیں دیکھا جو ہزاروں کی تعداد میں ہونے کے باوجود موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے بھاگ کھڑے ہوئے تو اللہ نے ان کو کہا کہ جاؤ مرجاؤ پھر اللہ نے ان کو زندہ کیا،اللہ لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکرگزارنہیں ہوتے''۔(۱۷)اس واقعہ کاتعلق بنی اسرائیل کی تاریخ کے اس دور سے ہےجس کا ذکرصحیفہ سموئیل میں ہے۔سموئیل نبی کےظہور کےابتدائی دورمیں بنی اسرائیل سخت انتشار میں مبتلا تھےاس وقت ان کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ تھی۔ان کے اندرمذہبی اوراخلاقی بیماریاں بہت زیادہ تھیں۔دشمنوں کےنرغے میں تھےاوران پررعب طاری تھا،اوران میں دشمن کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت بالکل نہیں تھی۔جب ان پرخوف اور بزدلی کی کیفیت طاری ہوگئی تو انہیں ایمانی اوراخلاقی موت کےحوالہ کردیا پھرجب ان کے ہاں تجدیدواحیائے دین کی دعوت اٹھی تو اللہ تعالی نے ان کے اندر زندگی ڈال دی اورانھیں عزت اورسربلندی بخشی۔اس واقعہ کا ذکرکر کے مسلمانوں کو جہاداورانفاق پر ابھاراجارہاہے۔''بنی اسرائیل کا یہ واقعہ بھی ان کے قبلہ کی جنگ سے متعلق ہےاورمسلمانوں کوبھی یہاں جس جنگ اورانفاق کے لیے ابھارا جارہا ہےاس کاتعلق اصلاً قبلہ ہی کی آزادی سے ہے دونوں میں نہایت واضح قدرمشترک ہے''۔(۱۸)

خانہ کعبہ توحید کا مرکز

اوراسی کے ساتھ اس بات کی توثیق کردی گئی کہ یہ گھر مرکزتوحید ہوگااور یہ ہدایت دی گئی کہ بیت اللہ تمام ذریت ابراہیم کامرکز اورقبلہ ہوگا،اس سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی:

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْناً وَاتَّخِذُواْ مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى وَعَهِدْنَا

إِلَـى إِبْـرَاهِيْـمَ وَإِسْـمَـاعِيْـلَ أَن طَهِّـرَا بَيْتِـىَ لِـلـطَّـائِـفِيْنَ وَالْعَـاكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُود۔ (۱۹)

ترجمہ:''اور یہ کہ ہم نے اس گھر (کعبے) کولوگوں کے لیے مرکز اورامن کی جگہ قرار دیااور لوگوں کوحکم دیا کہ ابراہیمؑ جہاں عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے اس مقام کومستقل جائے نماز بنالو، اور ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو تاکید کی کہ میرے اس گھر کوطواف اور اعتکاف اور رکوع اور سجدے کرنے والوں کے لیے پاک رکھو''۔

''یہ آیت ایک نہایت لطیف طریقے سے مشرکین قریش کے جرم کی طرف اشارہ کررہی ہے کہ یہ ظالم لوگ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے وارث ہونے پر فخر تو کرتے ہیں، مگر وراثت کا حق ادا کرنے کے بجائے الٹا اس حق کو پامال کر رہے ہیں۔ لہٰذا جو وعدہ ابراہیمؑ سے کیا گیا تھا، اس سے جس طرح بنی اسرائیل مستثنیٰ ہوگئے ہیں، اسی طرح یہ مشرک بنی اسماعیل بھی اس سے مستثنیٰ ہیں'' (۲۰)

حضرت ابراہیمؑ نے اس بات کی دعا کی تھی کہ یہ گھر شرک سے پاک ہوگا۔ اور ان کو ذمہ داری دی گئی کہ یہ گھر بت پرستی کا اڈّہ نہ بنے اور اسے ایک مرکزی حیثیت حاصل ہو اور فرزندان توحید یہاں آکر مناسک حج ادا کریں۔ شروع میں یہ گھر توحید کا مرکز بنا رہا لیکن دھیرے دھیرے دین کے نام پر خرافات کا مرکز بنتا چلا گیا اور شرک کا اڈّہ بن گیا، خانہ کعبہ کی جو حرمت تھی اس کو باقی نہیں رکھا گیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس کے اندر سیکڑوں بت رکھ دیئے گئے۔ ''اور غضب یہ کہ خود حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کا بھی بت بنا ڈالا گیا جن کی ساری زندگی بتوں ہی کی پرستش مٹانے میں صرف ہوئی تھی۔ ابراہیمؑ حنیف کی اولاد نے لات، منات، ہبل،، نسر، یغوث، عزیٰ، اساف، نائلہ اور خدا جانے کس کس نام کے بت بنائے اور ان کو پوجا'' (۲۱)

امام فراہیؒ سورہ لہب کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو سلطان وفرماں روا بنا کر نہیں بھیجا تھا کہ آپؐ کی دشمنی میں سب سے سرگرم امراء وسلاطین اور حریفان ملک وسلطنت ہوتے۔ آپ ایک داعی حق تھے، ایک بشیر ونذیر تھے، اور گمراہیوں کے لیے شمع ہدایت بنا کر بھیجے گئے تھے، آپ کو تلقین صبر ونماز، اعلائے کلمہ حق، اور نیکی کی تعلیم اور برائی سے روکنے کا حکم ملا تھا اور آپؐ دنیا میں اس لیے تشریف لائے تھے کہ لوگوں کے اندر ملت ابراہیمی کو قائم کریں اور خانۂ خدا کو شرک کی آلودگیوں سے پاک کردیں کہ بانی کعبہ ابراہیم خلیلؑ سے جو وعدہ کیا گیا تھا وہ پورا ہو۔ (۲۲)

سیرت نبوی کی معنویت

حضرت ابراہیمؑ کی دعا کے نتیجہ میں آنحضرت ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے اوران کے اوپر اس گھر کو شرک سے پاک کرنے کی ذمہ داری ڈالی گئی، اس کی خاطر انھوں نے دس سال تک مکہ میں توحید کی دعوت دی۔ قرآن کا نزول شروع ہوا تو بارش کی طرح قرآن کی آیتیں اترنے لگیں اور مشرکین کے سامنے توحید کا پیغام آپ سناتے رہے تا آنکہ آپ نے صالحین کی ایسی جماعت تیار کر لی جو اس گھر کو مشرکین کے ہاتھوں سے آزاد کرا سکے اور حضرت ابراہیم کی طرح اس گھر کو توحید کا مرکز بنائے اور آپ ﷺ کی سیرت کی معنویت یہی تھی کہ خانہ کعبہ کا حصول ہو اور اس گھر کو شرک سے پاک کیا جائے اور آپؐ کی بعثت کا مقصد بھی یہی ٹھہرا۔

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَن لَّا تُشْرِكْ بِي شَيْئاً وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُود۔ وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالاً وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ۔ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَى مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ۔ ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ۔ (۲۳)

ترجمہ: ''اور یاد کرو، جبکہ ہم نے ابراہیمؑ کے لیے ٹھکانہ بنایا بیت اللہ کی جگہ کو اس ہدایت کے ساتھ کہ کسی چیز کو میرا شریک نہ ٹھہرائیو اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، قیام کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھیو! اور لوگوں میں حج کی منادی کرو، وہ تمہارے پاس آئیں گے پیادہ بھی اور نہایت لاغر اونٹیوں پر بھی، جو پہنچیں گی دور دراز گھر سے پہاڑی رستوں سے۔ تاکہ لوگ اپنی منفعت کی جگہوں پر بھی پہنچیں اور چند خاص دنوں میں، ان چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو بخشے ہیں۔ پس اس میں سے کھاؤ اور فاقہ کش فقیروں کو کھلاؤ۔ پھر وہ اپنے میل کچیل دور کریں، اپنی نذریں پوری کریں اور بیت قدیم کا طواف کریں''۔

یہ واضح اشارہ تھا کہ اس گھر کی تعمیر اس لیے نہیں ہوئی تھی کہ یہ بت پرستی کا مسکن ہو اور اس کے وارثین حضرت ابراہیمؑ کی تعلیمات کو بھلا دیں، انھوں نے اسے بت پرستی کے لیے نہیں بنایا تھا۔ گویا مشرکین مکہ کو اس بات کا نوٹس دے دیا گیا کہ اب تم سے یہ امانت چھین لی جائے گی اب تم اس کے حقدار

نہیں اور یہ لوگ جو حضرت ابراہیمؑ کی تعلیمات کا احیاء کر رہے ہیں انہیں یہاں سے نکالنے پر تلے ہوئے ہیں، ان کو یہ امانت سونپ دی جائے گی۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں: ''اب یہ حضرت ابراہیمؑ اور بیت اللہ کی تاریخ بیان ہو رہی ہے تاکہ قریش پر یہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ جن مقاصد کے لیے اللہ نے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ سے یہ گھر تعمیر کرایا تھا وہ سارے ہی مقاصد انھوں نے برباد کر کے رکھ دیے ہیں اس وجہ سے یہ سزاوار ہیں کہ اب یہاں سے بے دخل ہوں اور وہ لوگ اس کے ذمہ دار بنائے جائیں جو اس عظیم امانت الٰہی کا حق ادا کرنے والے ہوں۔'' (۲۴)

بت پرستی سے پاک کرنے کی تحریک

قرآن نے ابتداء میں اپنے نزول سے مکی زندگی میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور مکی معاشرہ کو ایک انقلابی صورتحال میں تبدیل کر دیا اور پوری مکی زندگی ایک معرکہ میں تبدیل ہوگئی۔ اس نے اپنے انقلابی پیغام کے ذریعہ بگل بجا دیا اور مکی معاشرہ میں ایک ہلچل پیدا کر دی، رسول اکرم ﷺ اس دعوت کو مکہ کی گلیوں میں عام کرنے میں لگ گئے، توحید کا نعرہ جو آپ پر اتر رہا تھا انہیں مکہ کی گلیوں میں سنانا شروع کر دیا۔ اور انسانی ضمیر کو جھنجھوڑنا شروع کر دیا اور جو انسانی خواہشات کے نشہ میں چور تھے اور شہوات حیوانی کی بیڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے ان سے آزاد کرنے کے لیے اپنی دعوت کو اتنے مسحور کن انداز میں پیش کیا کہ مخالفین ساحر کہنے لگے۔ آپ کی سیرت پاک نے اس دعوت کو جتنا متاثر کیا، کسی اور چیز نہیں کیا۔ آپ کی سیرت پاک پر کسی نے انگلی تک نہیں اٹھائی۔

جب آپؐ پر پہلی آیت نازل ہوئی تو اس طرح کی کیفیت طاری ہوئی کہ آپ بے چین ہوگئے اور آپ کی سیرت پاک میں ایک نمایاں تبدیلی دکھائی دی۔ ذمہ داری کے احساس میں ڈوب گئے۔ اسی احساس ذمہ داری کے تحت آپ نے اپنے قریبی عزیزوں کو اس کی دعوت دی۔ چند کو چھوڑ کر سبھوں نے ٹھکرا دی۔ دعوت کا یہ مزاج ہے کہ قوم پہلے ہی مرحلہ میں رسولوں کی دعوت کو ٹھکرا دیتی ہے اور اور نبی کے لیے یہ مرحلہ بہت ہی سخت ہوتا ہے، وہ قوم کی گمرہی کو دیکھ کر بے چین ہو جاتے ہیں اور سب سے پہلے آپ کی بیوی حضرت خدیجہؓ نے آپ کی دعوت پر لبیک کہا۔ پھر آپؐ پوری قوم تک اس دعوت کو عام کرنے میں لگ گئے اور اس میں اس قدر سرگرداں ہوگئے کہ اس کتاب پر لوگوں کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے اپنے آپ کو تھکا دیتے اور غم کی وجہ سے گھلا لیتے، قرآن آپؐ کی اس کیفیت کو اس طرح بیان کرتا ہے:

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَى آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَذَا الْحَدِيثِ أَسَفاً۔ (سورہ

کہف:۶)

''تو شاید تم ان کے پیچھے اپنے آپ کو غم سے ہلاک کرڈالوگے اگر وہ اس بات پر ایمان نہ لائے''۔

''یہ آنحضرتﷺ کو تسلی دی گئی ہے اور تسلی دینے کا انداز بہت پیارا ہے،فرمایا:تم تو ان کے ایمان کے غم سے اس طرح گھلے جارہے ہو کہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ اس کتاب پر ایمان نہ لائے تو ان کے پیچھے تم اپنے آپ کو ہلاک کرڈالوگے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آنحضرتﷺ کو اپنے فرض رسالت کی ادائیگی کا کتنا شدید احساس تھا۔ آپﷺ دعوت کے کام کے لیے اپنے رات و دن ایک کیے ہوئے تھے۔لیکن پھر بھی آپ کو یہ غم کھائے جارہا تھا کہ لوگ جو ایمان نہیں لا رہے ہیں،مبادا اس میں آپﷺ کی کسی کوتاہی کا دخل نہ ہو۔اس احساس کے باعث آپ کی مشقت اور آپ کے غم دونوں میں برابر اضافہ ہوتا جارہا تھا،اس پر اللہ تعالی نے آپ کو نہایت پر محبت انداز میں ٹوکا کہ اپنی ذمہ داری کے احساس میں اس قدر غلو صحیح نہیں ہے۔یہ ناشکرے اور ناقدرے لوگ جو اس کتاب پر ایمان نہیں لا رہے ہیں تو یہ نہ سمجھو کہ اس کے سمجھنے میں ان کو کوئی دشواری پیش آ رہی ہے یا تمہاری طرف سے فرض دعوت کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی ہو رہی ہے بلکہ اس کا اصل سبب کچھ اور ہے''(تدبر قرآن: جلد۴،ص ۵۵۸)

آپﷺ کی سیرت کی یہ نمایاں خصوصیت تھی کہ قوم کو گمرہی میں دیکھنے کے لیے ایک لمحہ کو تیار نہ تھے،اسی لیے رسولﷺ قوم کی ضلالت اور گمرہی کے بارے میں کس قدر دکھی اور پریشان ہوتے،اس جذبہ کو آپﷺ یوں بیان کرتے ہیں:''میری اور تمہاری مثال اس شخص کی ہے جس نے ایک الاؤ تیار کیا ہو اور دیکھتے دیکھتے پروانے اور پتنگے اس پر ٹوٹ پڑتے ہوں اور وہ انہیں اس میں گرنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔تم ان پتنگوں کی طرح ضلالت کی آگ میں گر رہے ہو اور میرا حال یہ ہے کہ تمہاری کمر پکڑ پکڑ کر اس آگ میں گرنے سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں''۔

آپ کی کار دعوت میں انہماکیت اور مشغولیت کا حال یہ تھا کہ قرآن کو کہنا پڑا کہ آپ کی ذمہ داری صرف اتنی ہے کہ آپ ان تک اپنی بات پہنچا دیں،آپ ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے ہیں۔ لَسْــــتَ عَلَيهِم بِمُصَيطِر۔''تم ان پر داروغہ نہیں ہو''۔(۲۵)

آپﷺ کی سیرت اور دعوت کا دوسرا نمایاں پہلو یہ تھا کہ حکمت اور موعظہ حسنہ کے ذریعہ لوگوں کے سامنے اسلام کی تعلیمات کو عام کرتے تھے۔اسی اصول کو اپنا کر آپﷺ دعوت عام دیتے رہے اور

اس سے آپؐ نے کبھی سر مو انحراف نہیں کیا، اور آپ ﷺ چونکہ رأفت اور رحمت کا نمونہ تھے چنانچہ جب کبھی جوش تبلیغ میں اس قدر آگے نکل جاتے کہ لوگوں کے پیچھے بہت زیادہ پریشان ہونے لگتے تو اللہ تعالی کو اس پر قدغن لگانا پڑتا جس کا تذکرہ سورہ عبس میں موجود ہے۔ حکم ملتا ہے کہ اس میں اعتدال کی راہ اپنائیں اور آپؐ کی توجہ کے زیادہ مستحق مومنین ہیں نہ کہ کفار، مومنین کا حق مقدم ہے۔ امام فراہیؒ لکھتے ہیں: ''انتہائی رأفت اور شفقت کے سبب یا جوش تبلیغ و دعوت میں کبھی کبھی اصرار و لجاجت پر اتر آتے تھے''(۲۶) دعوت کے نقطہ نظر سے اولین توجہ کے مستحق اور تعلیم و تربیت کے لحاظ سے بھی مومنین ہیں، مولانا مودودیؒ نے اس پہلو کی وضاحت کچھ اس طرح کی ہے: ''دعوت کے نقطہ نظر سے ہر وہ انسان اہمیت رکھتا ہے جو طالب حق ہو، چاہے وہ کیسا ہی کمزور، بے اثر یا معذور ہو، اور ہر وہ شخص غیر اہم ہے جو حق سے بے نیازی برتے، خواہ وہ معاشرے میں کتنا ہی بڑا مقام رکھتا ہو۔ اس لیے آپ اسلام کی تعلیمات تو ہانکے پکارے سب کو سنائیں مگر آپ کی توجہ کے اصل مستحق وہ لوگ ہیں جن میں قبول حق کی آمادگی پائی جاتی ہو، اور آپ کی بلند پایہ دعوت کے مقام سے یہ بات فروتر ہے کہ آپ اسے مغرور لوگوں کے آگے پیش کریں جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں یہ سمجھتے ہوں کہ ان کو آپؐ کی نہیں بلکہ آپؐ کو ان کی ضرورت ہے۔(۲۷)

دعوت کا استقبال استہزاء سے ہوتا ھے

مکی دور کے درمیان میں مخالفت تضحیک واستہزاء کے انداز میں تھی، ظلم کی شدت نہیں ہوئی تھی، البتہ افواہی جنگ، جھوٹے الزامات کے ساتھ ساتھ آپ کی نبوت پر زیادہ تر طنز و تمسخر اور بیہودہ الزامات لگائے جاتے تھے، اور تحریک اسلامی کو پوری طرح آگے قدم بڑھانے سے روکنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ دعوت اسلامی کے آغاز میں یہ مرحلہ ضرور آتا ہے، چنانچہ ''حق کا داعی جوں ہی اپنی دعوت شروع کرتا ہے اور کفر و جاہلیت کے دلدادوں یا دنیا پرستوں اور خدا فروشوں کے سامنے سلامتی کے پیامبر کی حیثیت سے اپنا تعارف کراتا ہے، لبوں پر تبسم آجاتا ہے، نگاہیں اشارے کرنے لگتی ہیں، زبانیں مذاق اڑانے میں مصروف ہو جاتی ہیں، کوئی داعی بلکہ کوئی پیغمبر، حتی کہ سارے داعیوں کے امام اور تمام پیغمبروں کے خاتم ﷺ بھی اس ہمز لمز سے نہ بچ سکے۔ جب بھی کسی دشمن حق سے سامنا ہوتا، طنز اور تمسخر کا ایک نیا زہریلا تیر چل جاتا۔ خاص کر مکی زندگی میں اس کی وہ گرم بازی رہی کہ الامان والحفیظ۔ انداز اس طنز و تمسخر کا ایسا ہوتا جس سے صاف پتہ چلتا کہ ان ''داناؤں'' کے نزدیک یہ دعوت، یہ دین، دین کی یہ تعلیمات، سب کی سب گویا (معاذ اللہ) اتنی لچر ہیں کہ ان کو سنجیدگی سے سن لینا بھی عقل کی توہین

ہے۔ نبی کی ذات کا استہزاء، اس کے دعوائے رسالت کا استہزاء، دعوت توحید کا استہزاء، قیامت اور آخرت کی تعلیم کا استہزاء، نبی کے ساتھیوں کا استہزاء، غرض ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس دعوت کی ایک ایک چیز ان کی جانب سے اگر کسی جواب کی مستحق ہے تو وہ صرف استہزاء ہے۔ قرآن مجید میں ان کے اس طرز عمل کا تذکرہ کثرت سے موجود ہے، چند ایک آیتوں سے اس کا پورا پورا اندازہ ہوگا۔ ''جب بھی یہ منکر دیکھتے ہیں تو تمہیں ٹھٹھوں پر رکھ لیتے ہیں (کہتے ہیں) کیا یہی ہے وہ جو تمہارے معبوں پر نام دھرتا ہے؟ مجرم اہل ایمان کا ٹھٹھا کیا کرتے تھے اور جب ان کے پاس سے ہو کر گزرتے تھے تو آپس میں آنکھوں سے اشارے کرتے''۔ (سورہ مطففین)

''۔۔اور انھوں نے میری آیتوں کو، اور جس عذاب سے انہیں خبردار کیا جارہا ہے اس کو مذاق بنا لیا''(سورہ کہف)۔(۲۸)

جب مخالفت اپنے آخری حد کو پہنچ جاتی ہے اور نبی کے قتل کی سازش ہو جاتی ہے تو نبی اپنی قوم سے بے زاری کا اعلان کر دیتا ہے اور اس سے اپنے تمام تعلقات توڑ لیتا ہے اور ہجرت کر جاتا ہے، یہی صورتحال حضرت ابراہیم کے ساتھ پیش آئی'' حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک مدت تک قوم کو وعظ و نصیحت کرنے میں مشغول رہے۔ انذار وتبشیر کا کوئی پہلو انھوں نے اٹھا نہ رکھا۔ تلقین و دعوت کی پوری طاقت صرف کر ڈالی لیکن قوم ٹس سے مس نہ ہوئی۔ بالآخر وہ مایوس ہو گئے اور چاہا کہ ایک مرتبہ لوگوں کو کھول کر دکھادیں کہ جن بتوں کو لوگ پوج رہے ہیں وہ بالکل بے جان و بے اختیار ہیں، نفع ونقصان کی کوئی بات بھی ان کے بس میں نہیں ہے۔ تنبیہ اور اتمام حجت کی یہ آخری شکل تھی، جو انھوں نے اختیار کی اور نتیجہ وہی نکلا جو ان کا خیال تھا۔ انھوں نے جب تمام بت توڑ پھوڑ کے رکھ دیے تو قوم کو تنبہ ہوا کہ در حقیقت یہ ہماری انتہائی نادانی تھی کہ ہم ان بے جان پتھروں کی پرستش کر رہے تھے جو خود اپنی حفاظت سے قاصر ہیں۔ اس موقع پر حضرت ابراہیمؑ نے ان کو ملامت کی لیکن اس ملامت سے ان کی حمیت جاہلیت پھر بھڑک اٹھی اور وہ چلا اٹھے کہ اس کو آگ میں جھونک دو اور اپنے معبودوں کو بچاؤ۔ اس کے علاوہ انھوں نے سنگسار کرنے کی بھی دھمکی دی۔ بس اس کے بعد فریضہ تبلیغ و دعوت کی آخری منزل نمودار ہوگئی، یعنی ہجرت کا حکم آگیا اور حضرت ابراہیمؑ آخری دوٹوک بات کہہ کر قوم سے علیحدہ ہو گئے۔(۲۹)

چنانچہ جب نبی ﷺ کے بارے میں قتل کی سازش ہوگئی تو آپ کو مدینہ ہجرت کرنے کا حکم ہو گیا، اور آپ اور آپ کے اصحاب مدینہ ہجرت کر گئے۔

بیعت عقبہ ثانیہ، اسلامی ریاست کی سنگ میل

مکی دور کے آخری تین چار سالوں میں ۷۵/افراد کا ایک وفد مدینہ سے آ کر آپﷺ سے ملا، ان لوگوں نے اسلام ہی قبول نہیں کیا بلکہ آپﷺ کو اور آپ کے اصحاب کو مدینہ آنے اور اپنے یہاں بسنے کی دعوت بھی دی۔ظاہر ہے وہ آپﷺ کو ایک رہنما کی حیثیت سے بلا رہے تھے، یہ پیش کش ان کی طرف سے بہت اہم تھی اور اس کے دور رس نتائج سامنے آنے والے تھے۔اس وفد میں ایک کم سن نوجوان تھے جو اس بات کو بھانپ گئے کہ اس دعوت کا کیا مطلب ہوتا ہے۔انھوں نے اپنے وفد کے لوگوں سے کہا کہ ''ٹھہر واے اہل یثرب، ہم لوگ جوان کے پاس آئے ہیں، یہ سمجھتے ہوئے آئے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں اور آج انہیں یہاں سے نکال لے جانا تمام عرب سے دشمنی مول لینا ہے۔اس کے نتیجہ میں تمہارے نونہال قتل ہوں گے اور تلواریں تم پر برسیں گی۔لہٰذا اگر تم اس کو برداشت کرنے کی طاقت اپنے اندر پاتے ہو تو ان کا ہاتھ پکڑو، یقیناً اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے، اور اگر تمہیں اپنی جانیں عزیز ہیں تو پھر چھوڑ دو اور صاف صاف عذر کر دو کیونکہ اس وقت عذر کر دینا خدا کے نزدیک زیادہ قابل قبول ہو سکتا ہے''۔(۳۰)

وفد کے ایک دوسرے شخص نے یہی بات دوہرائی لیکن وفد کے تمام افراد رسول اللہﷺ کو مدینہ بلانے پر متفق ہو گئے۔اس کی اطلاع مکہ والوں کو ہو گئی۔انھوں نے اسے ناکام کرنے کی تمام کوششیں کر ڈالیں لیکن اس میں وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔

قریش نے یہ بات اب سمجھ لی کہ اس طاقت کو روکنا آسان نہیں ہے چنانچہ اس تحریک کو روکنے کے لیے اپنی تمام تدبیریں شروع کر دیں، لیکن ہر چیز ان کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔دوسری بات یہ کہ آپﷺ نے اس بات کا بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ مشرکین اب چین سے نہیں سوئیں گے۔اس لیے آپؐ نے دفاعی طور پر مدینہ کے آس پاس کے قبائل سے معاہدے شروع کر دیے اور انہیں اسلام کی دعوت دینی شروع کر دی۔''مدینہ پہنچ کر اسلامی دعوت ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی، مکہ میں تو معاملہ صرف اصول دین کی تبلیغ اور دین کو قبول کرنے والوں کی اخلاقی تربیت تک محدود تھا، مگر جب ہجرت کے بعد عرب کے مختلف قبائل کے وہ سب لوگ جو اسلام قبول کر چکے تھے، ہر طرف سے سمٹ کر ایک جمع ہونے لگے اور انصار کی مدد سے ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست کی بنیاد پڑ گئی تو اللہ تعالی نے تمدن، معاشرت، معیشت، قانون اور سیاست کے متعلق بھی اصولی ہدایات دینی شروع کیں اور یہ بتایا کہ اسلام

کی اساس پر یہ نظام زندگی کس طرح تعمیر کیا جائے''۔(۳۱)

مدینہ کی اسٹریٹجی

یہاں کی اسٹریٹجی مکہ سے بالکل مختلف تھی۔ یہاں مسلمان اس پوزیشن میں تھے کہ بھرپور طریقے سے مشرکین کی چالوں کا مقابلہ کر سکتے تھے اور اپنی دفاعی پوزیشن بنا سکتے تھے، اور اسے مضبوط سے مضبوط تر کر سکتے تھے، اور ایسا ہی ہوا، مشرکین کی ساری چالیں فیل ہوگئیں۔ آپ ﷺ نے مدینہ پہنچتے ہی سب سے اہم کام یہ کیا کہ اوس اور خزرج اور مہاجرین کو ملا کر ایک برادری بنائی اور دوسرا یہ کہ مسلم معاشرے اور یہودیوں کے درمیان ایک معاہدہ طے کیا کہ کوئی کسی کے حقوق پر دست درازی نہ کرے گا اور باہر کی کوئی طاقت حملہ آور ہوگی تو سب مل کر مقابلہ کریں گے،''ہجرت کے بعد اسلام اور کفر کی کشمکش بھی ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ ہجرت سے پہلے اسلام کی دعوت خود کفر کے گھر میں دی جارہی تھی اور متفرق قبائل میں سے جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے وہ اپنی اپنی جگہ رہ کر ہی دین کی تبلیغ کرتے اور جواب میں مصائب اور مظالم کے تختۂ مشق بنتے تھے مگر ہجرت کے بعد جب یہ منتشر مسلمان مدینہ میں جمع ہو کر ایک جتھا بن گئے اور انہوں نے ایک چھوٹی سی آزاد ریاست قائم کر لی تو صورتحال یہ ہوگئی کہ مکہ والے ایک جتھا بن گئے، ادھر مٹھی بھر مسلمانوں نے مدینہ کی بستی میں ایک اسلامی ریاست قائم کر لی اور دوسری طرف تمام عرب اس کا استیصال کر دینے پر تل گئے۔

اب اس مٹھی بھر جماعت کی کامیابی کا ہی نہیں بلکہ اس کے وجود و بقا کا انحصار بھی اس بات پر تھا کہ اولاً وہ پورے جوش و خروش کے ساتھ اپنے مسلک کی تبلیغ کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کرے، ثانیاً وہ مخالفین کا برسر باطل ہونا اس طرح ثابت و مبرہن کر دے کہ ذی عقل انسان کو اس میں شبہہ نہ رہے۔ ثالثاً بے خانماں ہونے اور تمام ملک کی عداوت و مزاحمت سے دوچار ہونے کی بنا پر فقر و فاقہ اور ہمہ وقت بے امنی و بے اطمینانی کی جو حالت ان پر طاری ہوگئی تھی اور جن خطرات میں وہ چاروں طرف سے گھرے ہوئے تھے، ان میں وہ ہراساں نہ ہوں، بلکہ پورے صبر و ثبات کے ساتھ ان حالات کا مقابلہ کریں اور اپنے عزم میں ذرا تزلزل نہ آنے دیں۔ رابعاً وہ پوری دلیری کے ساتھ ہر اس مسلح مزاحمت کا مسلح مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جائیں، جو ان کی دعوت کو ناکام کرنے کے لیے کسی طاقت کی طرف سے کی جائے، اور اس بات کی ذرا پرواہ نہ کریں کہ مخالفیں کی تعداد اور ان کی مادی طاقت کتنی زیادہ ہے۔ خامساً ان میں اتنی ہمت پیدا کی جائے کہ اگر عرب کے لوگ اس

نئے نظام کو، جو اسلام قائم کرنا چاہتا ہے، فہمائش سے قبول نہ کریں، تو جاہلیت کے اس فاسد نظام کو بزورمٹا دینے میں تأمل نہ کریں۔۔۔'' (۳۲)

تحویل قبلہ، دراصل امامت کی تبدیلی کی طرف ایک قدم

پھر سنہ ۲ ہجری میں اللہ تعالی کی طرف سے تحویل قبلہ کا حکم آیا۔ دراصل بیت المقدس سے سمت قبلہ کا پھرنا اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اب اللہ تعالی نے بنی اسرئیل کو دنیا کی پیشوائی سے معزول کر دیا ہے اور اب اس منصب پر امت محمدی کو فائز کر دیا ہے۔ ''جب یہ حکم آیا کہ دعوت قرآنی کا مرکز اور امت مسلمہ کا قبلہ بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ کو بنایا جائے تو یہ بات ان کے لیے نا قابل برداشت ہوگئی اور اس پر انہوں نے وہ طوفان مخالفت بپا کیا جس سے مدینہ کے در و دیوار ہل گئے۔'' (۳۳ الف)

ایسا ہی ہوا مشرکین نے بہت گہری سازشیں شروع کر دیں، اور جنگ کے حالات پیدا کرنے لگے (سورہ حج آیت ۳۹ میں، مسلمانوں کو قریش مکہ کے مقابلہ میں تلواریں اٹھانے کی جو اجازت دی گئی ہے وہ ان کی مظلومیت کی وجہ سے دی گئی ہے اور اس لیے دی گئی ہے کہ خود ان پر حملہ کیا گیا ہے، اسی طرح سورہ حج آیت ۴۰ میں پھر اس طرح مختلف بدلتے ہوئے حالات کے اعتبار سے اللہ کی طرف سے اس سلسلہ میں ہدایات برابر آتی رہیں) قریش نے مسلمانوں کو کہلا بھیجا کہ تم مغرور نہ ہونا، ہم مکہ سے صاف بچ کر نکل آئے ہیں، ہم یثرب میں پہنچ کر تمہارا ستیاناس کر سکتے ہیں۔ (بخاری) آپ ﷺ کو مکہ سے برابر اس طرح کی خبریں مل رہی تھیں کہ قریش کے لوگ کسی وقت بھی حملہ کر سکتے ہیں اسی لیے راتوں کو آپ اور آپ کے اصحاب پہرہ دیتے تھے۔ اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی ''جن لوگوں سے جنگ جاری ہے انہیں بھی جنگ کی اجازت دی گئی کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر قادر ہے یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے ہیں: ''ہمارا رب اللہ ہے''۔ (۳۳ ب)

گویا اس ابھرتی ہوئی اسلامی جماعت کو نیست و نابود کرنے کے لیے انھوں نے اپنی پوری طاقت جھونک دی، اور جنگوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا، اور ان ہی حالات میں جنگ بدر ہوئی اور جنگ بدر میں انہیں بری طرح شکست ہوئی۔ اس سے پہلے آپ ﷺ نے مدینہ اور ساحل بحر احمر کے درمیان اس شاہراہ سے متصل جو قبائل آباد تھے اپنا اتحادی گروپ بنالیا اور اس کے ساتھ ہی جنگ بدر سے پہلے متعدد غزوات اور سرایا پیش آئے، اور اللہ تعالی کا یہ وعدہ تھا:

هُوَ الَّذِیٔ أَرۡسَلَ رَسُولَہُ بِالۡھُدَی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡھِرَہُ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہِ۔ (سورہ الفتح:۲۸)

''وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کرے''۔

یہی آیت سورہ توبہ میں ہے، آیت ۳۳/ اور سورہ صف میں آیت ۹/۔

نبی کی بعثت کا مقصد صرف دین کی تبلیغ ہی نہ تھی'' بلکہ اسے دین کی نوعیت رکھنے والے تمام نظام زندگی پر غالب کر دینا تھا۔۔ بلکہ آپ اسے اس لیے لائے تھے کہ زندگی کا غالب دین یہ ہو اور دوسرا کوئی دین اگر جیے بھی تو ان حدود کے اندر جیے جن میں یہ اسے جینے کی اجازت دے، (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد چہارم، تفسیر سورہ زمر، حاشیہ ۴۸)'' (۳۴)''اس میں فتح کی بشارت ہے اس لیے کہ اسی کی فتح پر پورے ملک کے اندر دین حق کے غلبہ کا انحصار تھا''۔ (۳۵)

اور اس اظہار دین کا مقصد صرف یہ تھا کہ انسانی زندگی میں عدل وانصاف اور توازن قائم ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَقَدۡ أَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنَاتِ وَأَنزَلۡنَا مَعَھُمُ الۡکِتَابَ وَالۡمِیۡزَانَ لِیَقُومَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ۔ (۳۶)

''ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایت کے ساتھ بھیجا، اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تا کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں''۔

اس آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ قریش اور اہل کتاب کی طرف سے جو پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے کہ یہ کیسا نبی ہے جو خونریزی کی تعلیم دیتا ہے، اس کا اس آیت میں جواب ہے کہ جتنے بھی نبی اور رسول آئے سب کے سب عدل وانصاف کے راستہ پر چلے اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے اللہ نے کتاب نازل کی تا کہ وہ میزان کا کام کرے، اس طرح حق و ناحق کا راستہ واضح ہو جائے اور اس عدل کے راستہ میں جو طاقتیں مزاحمت کریں گی انہیں روک دیا جائے گا۔

مدینہ کا تحفظ اور دفاع

جب رسول اللہ ﷺ مدینہ پہنچ گئے تو پورے علاقے میں سیکورٹی کے لیے قبائل سے صلح اور معاہدے کیے، لیکن اس کے ساتھ ہی قریش اور تمام عرب آپ ﷺ سے لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اسی

لیے آپ ﷺ پورے مدینہ کی حفاظت کے لیے صحابہ کو پہرے پر لگاتے تھے۔" صحیح بخاری باب الجہاد میں ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ" آج کوئی اچھا پہرہ دیتا"، چنانچہ سعد بن وقاصؓ نے ہتھیار لگا کر رات بھر پہرہ دیا، تب آپ نے ارشاد فرمایا، جس کے الفاظ کچھ اس طرح ہیں:

" عن ابی بن کعب قال لما قدم رسول الله ﷺ وأصحابه المدینه وآوتهم الأنصار رمتهم العرب عن قوس واحدة، کانوا لا یبیتون الا بالسلاح و لا یصبحون الا فیه۔ (**باب فی اسباب النزول للسیوطی سورہ نور آیت** وعد الله الذین آمنوا منکم الخ **مسند دارمی میں بھی یہ روایت مذکور ہے**)

" آنحضرت ﷺ اور صحابہ جب مدینہ آئے اور انصار نے ان کو پناہ دی تو تمام عرب ایک ساتھ ان سے لڑنے کو آمادہ ہوگئے، صحابہ صبح تک ہتھیار باندھ کر سوتے تھے۔ مورخین مغازی کی ابتدا انہی واقعات سے کرتے ہیں کہ اسی سال اللہ نے جہاد کی اجازت دی، مواھب لدنیہ اور زرقانی میں لکھا ہے کہ اللہ نے ۱۲ صفر ۲ھ میں جہاد کی اجازت دی، اس کی سند میں امام زہری کا قول نقل کیا ہے (أول آية نزلت في الاذن بالقتال "أذن للذين يقاتلون بأنهم ظلموا وان الله على نصرهم لقدير") پہلی آیت جو قتال کی اجازت میں نازل ہوئی وہ یہ ہے "أذن للذين " الخ یعنی جن سے لڑائی کی جاتی ہے (مسلمان) ان کو بھی اب لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ ان پر ظلم کیا جارہا ہے اور اللہ ان کی مدد پر یقیناً قادر ہے۔ تفسیر ابن جریر میں ہے کہ قتال کے متعلق سب سے پہلے جو آیت نازل ہوئی وہ یہ ہے: (وقاتلوا في سبيل الله الذين يقاتلونكم۔ سورۃ بقرہ) " اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں" لیکن غور سے دیکھو تو دونوں آیتوں میں انہی لوگوں سے لڑنے کی اجازت ہے جو پہلے مسلمانوں سے لڑنے آتے ہیں اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان درحقیقت لڑنے پر مجبور کیے جاتے ہیں۔ بہر حال واقعہ یہ ہے کہ مدینہ میں آ کر آنحضرت ﷺ کا سب سے پہلا کام حفاظت خود اختیاری کی تدبیر تھی، نہ صرف اپنی اور مہاجرین کی بلکہ انصار کی بھی، کیونکہ اس جرم میں کہ انصار نے مسلمانوں کو پناہ دی ہے قریش نے مدینہ کی بربادی کا فیصلہ کرلیا تھا اور اپنے تمام قبائل متحدہ میں یہ آگ بھڑکا دی تھی، اس بنا پر آپ نے دو تدبیریں اختیار کیں، اول یہ کہ قریش کی شامی تجارت جو ان کا مایہ غرور تھی بند کر دی جائے تاکہ وہ صلح پر مجبور ہو جائیں، اور یاد ہوگا کہ سعد بن معاذ نے مکہ میں ابوجہل کو اسی کی دھمکی دی تھی۔ دوسرے یہ کہ مدینہ کے قرب وجوار کے جو قبائل ہیں ان سے امن وامان کا معاہدہ ہوجائے۔ (۳۷)

جنگ بدر میں مشرکین کی شکست کے بعد نبی ﷺ نے بنوقینقاع کا مدینہ سے اخراج کیا جو ایک مدت دراز سے یہاں آباد تھے (۳۸ الف)، اور ایسا اس لیے کہ انھوں نے کیے گئے معاہدہ کو توڑ دیا تھا۔ یہودیوں کا یہ پہلا قبیلہ تھا جس نے جنگ بدر کے بعد اپنا معاہدہ توڑا تھا۔ ان یہودیوں کے اوس اور خزرج کے ساتھ پرانے تعلقات تھے لیکن ان کے اسلام لانے کے بعد وہ تعلقات دشمنی میں تبدیل ہو گئے، وہ اندرونی طور پر مشرکین سے ملے ہوئے تھے اور ان سے ساز باز کرتے رہتے تھے۔ اسلام کی جنگ یہود اور مشرکین سے تھی، تحویل قبلہ اور اخراج بنوقینقاع کے بعد یہود سمجھ گئے کہ اب یہودی شریعت کا خاتمہ ہونے جا رہا ہے، چاہے وہ معاشی لحاظ سے مدینہ میں کتنا ہی اثر ورسوخ رکھتے ہوں لیکن ان کی ہوا نکل چکی تھی۔ تحویل قبلہ کے بعد یہود اور قریش دونوں ہی مایوس ہو گئے اور اسلام کی قوت کو ہر محاذ پر شکست دینے کی کوشش کی۔ جنگ بدر میں شکست کے بعد دونوں کے ہاں دشمنی کی آگ لگی ہوئی تھی، وہ اس کے زوردار بدلہ کی تیاری میں لگ گئے بالآخر جنگ احد ہوئی، اور جنگ بدر کا بدلہ لینے کے لیے پوری مہم جوئی شروع ہو گئی، اور مشرکین مکہ پوری طرح لیس ہو کر مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ حضور ﷺ نے بھی صحابہ سے مشاورت کی اور احد کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس جنگ میں مسلمانوں نے شجاعت کے خوب جوہر دکھائے، اور قریش نے پسپائی دکھائی اور میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے، چنانچہ مسلمانوں نے مال غنیمت سمیٹنا شروع کر دیا۔ ابھی ان کی طاقت نہیں کچلی گئی تھی، جب انھوں نے دیکھا کہ مسلمان مال غنیمت لوٹنے میں مصروف ہو گئے ہیں تو انھوں نے دوبارہ پلٹ کر حملہ کر دیا، اور پھر جنگ کا رخ تبدیل ہوتا نظر آنے لگا، لیکن آپ ﷺ نے مسلمانوں کو از سر نو منظم کیا اور دشمن پر پلٹ وار کیا، دشمن میدان جنگ سے بھاگ نکلے اور انہیں اس بات کا احساس ہو گیا کہ ہم لوگ مسلمانوں کی طاقت کو توڑ نہیں سکتے۔

اس جنگ کے بعد منافقین اور یہود اسلام کے خلاف مسلسل سازشیں کرنے لگے اور طرح طرح کے وسوسے پیدا کرنے لگے۔ جنگ احد کے دو مہینے کے بعد بنی نضیر نے معاہدہ شکنی کی، جس کے مطابق فریقین ایک دوسرے کے ساتھ کسی قسم کی معاندانہ کارروائی نہیں کریں گے، اور نہ دشمنوں کی امداد کریں گے۔ لیکن انھوں نے عہد شکنی کی اور قریش کو خفیہ معلومات پہنچانے لگے، اور آپ ﷺ کے قتل کی سازش کی۔ بار بار الٹی میٹم کے بعد بھی نہ سنبھلے، تو ان کے قلعہ کا محاصرہ کیا گیا اور مجبوراً انہیں وہ قلعہ خالی کر کے خیبر جانا پڑا۔

خیبر کے بعد یہود اور مشرکین نے سمجھ لیا کہ اس تحریک کو پوری طرح ختم کرنے کے لیے ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ پورا عرب مجتمع ہو جائے اور تمام مخالف قوتیں جمع ہو جائیں، تب جا کر اس طاقت کو ختم کر سکتے ہیں، اس میں یہود آگے آگے تھے اور انہوں نے ہر ممکن مدد اور تعاون کی پیش کش کی۔ مشرکین نے اپنے قبائل کو جمع کیا، اسی طرح قریش نے اپنے حلیفوں کو جمع کیا اور پھر مدینہ پر حملہ آور ہو گئے۔

نبی کریم ﷺ کو جیسے ہی اس کی اطلاع ہوئی، انہوں نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ کے مطابق شمال اور مغرب میں جنگی حکمت عملی کے تحت خندق کھود دی گئی، اور اس خندق کی کھدائی میں نبی کریم ﷺ بھی شریک رہے۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر سورہ احزاب کے اندر ہے۔ پوری طاقت کا جمع ہو جانا مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش تھی، مدینہ کا محاصرہ طویل ہو گیا، لیکن اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال رہی۔ یہ محاصرہ تین ہفتے تک جاری رہا، سردی کا زمانہ تھا، رسد کا انتظام انتہائی اہم مسئلہ تھا، اس کی فراہمی میں مشکلات در پیش تھیں، اور متحدہ محاذ میں پھوٹ پڑنے کی وجہ سے ان کی قوت مدافعت ختم ہو گئی اور تیز آندھیوں نے ان کے اندر افراتفری مچا دی، چنانچہ وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

اس جنگ کے بعد نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اب ان کے اندر سے جنگ کی طاقت ختم ہو چکی ہے اور یہ حملہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہے۔ اس کے باوجود یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا، چونکہ یہود کی سازشیں ہر جگہ کام کر رہی تھیں۔

ابھی جنگ خندق سے واپس ہی ہوئے تھے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آ کر حکم سنایا کہ ابھی ہتھیار نہ کھولیں، ابھی بنی قریظہ کا معاملہ باقی ہے، یہ حکم ملتے ہی آپؐ نے صحابہ کو دیار بنو قریظہ جانے کا حکم صادر فرمایا اور یہ تاکید فرمائی کہ وہیں جا کر نماز عصر ادا کریں۔ چنانچہ وہاں پہنچ کر ان کا محاصرہ کیا گیا، ۲۵/ دن محاصرہ کے بعد ان کی ہمت باقی نہیں رہی کہ مزید اس محاصرہ کو باقی رکھ سکیں۔

آخر میں اُن لوگوں نے اپنے آپ کو اس شرط پر نبی ﷺ کے حوالہ کر دیا کہ سعد بن معاذؓ جو غزوہ خندق میں شدید زخمی ہو گئے تھے وہ جو فیصلہ کریں گے وہ فریقین کے لیے قابل قبول ہوگا، چونکہ وہ قبیلہ اوس کے سردار تھے، اس لیے انہیں امید تھی کہ زمانۂ جاہلیت میں اوس اور بنی قریظہ کے درمیان جو حلیفانہ تعلقات مدتوں سے چلے آ رہے تھے اس کا وہ خیال کریں گے، اور انھیں مدینہ سے نکل جانے دیں گے، لیکن ان کے فیصلہ کے مطابق ان کے تمام مردوں کو قتل کر دیا گیا اور عوتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا گیا اور ان کے املاک پر قبضہ کر لیا گیا، یہ فیصلہ نافذ ہو گیا اور یہ فیصلہ یہود کی شریعت کے عین مطابق ہوا (۳۸ ب)

جواس طرح تورات میں موجود ہے:

''جب تو کسی شہر کے پاس اس سے لڑنے کے لیے پہنچے تو اس سے صلح کا پیغام کر، تب یوں ہوگا کہ اگر وہ تجھے جواب دے کہ صلح منظور، اور دروازہ تیرے لیے کھول دے، تو ساری خلق جو اس شہر میں پائی جائے، تیری باج گزار ہوگی اور تیری خدمت کرے گی۔ اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ تجھ سے جنگ کرے تو تو اس کا محاصرہ کر۔ جب خداوند خدا تیرا خدا اسے تیرے قبضے میں کر دے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر، مگر عورتوں اور بچوں اور جانوروں کو، جو کچھ اس شہر میں ہو، اپنے لیے غنیمت کے طور پر لے لے''۔(۳۹)

بنو قریظہ کے معاملہ میں مستشرقین نے ایک طوفان برپا کر دیا کہ یہ کیسا دین ہے جو اپنے مخالفین کو کسی صورت نہیں بخشتا(۴۰)۔ یہ سب کو معلوم ہے اور تاریخ میں موجود ہے کہ یہ فیصلہ ان کی خواہش کے مطابق سعد بن معاذؓ نے کیا تھا، جو اوس کے سردار تھے اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اوس اور بنی قریظہ کے درمیان حلیفانہ تعلقات تھے۔ دوسری طرف مسلمان مورخین نے اس کے جواب میں بہت ہی معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا ہے۔

تاریخ کو معذرت خواہانہ انداز میں پیش کرنا

اسلام نے اپنی دعوت بغیر کسی زور زبردستی کے بغیر پیش کی ہے، اور اس کا اعلان ہے؛ لا اکراہ فی الدین، یعنی دین میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ آپ ﷺ کی پوری مکی زندگی میں جہاں مصائب کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا:'' اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون ''(اے اللہ، میری قوم کو ہدایت دے اس لیے کہ یہ لوگ نہیں جانتے ہیں۔)

اسلام اپنی بات دلائل اور براہین کے ساتھ پیش کرنے کا قائل ہے، لیکن مغرب کی فکری یلغار نے اسلام کی شبیہ کو بگاڑنے کی پوری کوشش کی ہے اور لفظ'' جہاد'' کو غلط مفہوم میں پیش کیا ہے۔ اس فکری یلغار نے مسلمان مورخین کو بہت متاثر کیا ہے، اس کے نتیجہ میں وہ اسلام کی تاریخ کو معذرت خواہانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بعض مستند روایات کا بھی انکار کر بیٹھے۔ مشہور مؤرخ ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری مسلم مورخین پر یوں رقم طراز ہیں:

''بعض مسلمان مورخین کی موجودہ معذرت خواہانہ روش دراصل اس نفسیاتی اور فکری تسلط کا نتیجہ ہے جو مغرب نے اپنی ثقافتی یلغار کے ذریعے کچھ مسلمان کے ذہنوں پر قائم کر رکھا ہے۔ اس مخصوص سوچ

کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ بعض مسلمان مورخین جب اسلام کے تصور جہاد یا اسلامی فتوحات کا ذکر کرتے ہیں تو ان کا انداز بے حد معذرت خواہانہ ہوتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مسلمانوں کی تمام فوجی مہمات رومی اور ایرانی حملوں کے جواب میں جزیرہ نمائے عرب کے دفاع کے لیے تھیں، یہاں تک کہ وہ رسول ﷺ کے زمانے میں پیش آنے والے غزوات کا تذکرہ بھی اسی معذرت خواہانہ انداز میں کرتے ہیں جس سے یہ تصور سامنے آتا ہے، گویا یہ تمام غزوات مدینے کے دفاع کے سلسلے میں پیش آئے تھے۔ علامہ شبلی نعمانی نے بھی اپنے اعلیٰ علمی مقام کے باوجود اپنی شہرہ آفاق تصنیف سیرۃ النبی میں اسی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ بعض مسلمان مورخین کی جسارت تو یہاں تک پہنچ گئی کہ انہوں نے محض اس وجہ سے بعض معروف اور مستند واقعات کو مسترد کر دیا کہ وہ ان واقعات کا جواز ثابت کرنے کے لیے کوئی معذرت خواہانہ بنیاد فراہم نہ کر سکے، مثال کے طور پر ایک مورخ نے ابن اسحاق کی ان روایات کا انکار کیا ہے جو بنو قریظہ کے جنگوؤں کے قتل کے بارے میں آئی ہیں، حالانکہ حدیث، سیرت اور تاریخ کی تمام مستند کتب ان روایات کی تائید کرتی ہیں۔ اس طرح کے رویے سے مترشح ہوتا ہے کہ خود مصنف کو ان لوگوں کے قتل کے جواز پر شبہہ ہے۔ اسلامی تاریخ کی تعبیر نہ تو معذرت خواہانہ انداز میں کی جاسکتی ہے اور نہ اس کا منشا اپنے دفاع میں جواز فراہم کرنا ہونا چاہیے، بلکہ اسلامی تاریخ کی ایک محکم بنیاد ہے، اور وہ بنیاد یہ عقیدہ ہے کہ اسلام مکمل حق ہے اور جو کچھ بھی اس سے متعارض ہے، وہ سب سراسر باطل ہے۔ دین اسلام میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جس بات کا بھی حکم دیا ہے، خواہ وہ جہاد ہو یا کوئی دوسرا حکم خداوندی، وہ بہر حال صحیح اور درست ہے اور اس کے لیے کوئی دوسرا جواز تلاش کرنے یا معذرت پیش کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چاہے وہ حکم الٰہی بیسویں صدی کی مغربی ذہنیت کے لیے کتنا ہی عجیب اور ناقابل قبول ہو۔ ہمیں اسلام اور اس کی تاریخ کو کسی خاص زمانے کے مزاج اور نظریات کے مطابق ڈھالنے کی کسی کوشش کی ضرورت قطعاً نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے، کسی خاص زمانے کے لوگ جس چیز کو پسند کرتے ہوں وہی چیز ایک دوسرے زمانے کے لوگوں کے لیے سخت ناپسندیدہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی زمانے میں ایک چیز کسی ایک علاقے کے لوگوں کی نظروں میں محبوب ترین ہو اور وہی چیز کسی دوسرے خطے کے باسیوں کی نگاہوں میں مبغوض ہو۔ صرف اور صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ایسی ہے جو ہر چیز کو پرکھ سکتی ہے اور اس کی صحیح قدر و قیمت متعین کر سکتی ہے اور یہ حقیقت اس کے جاری کردہ قوانین، یعنی شریعت اسلامی میں پوری طرح ظاہر و باہر ہو کر سامنے آ گئی ہے، انسان ایک فانی مخلوق ہے، اس کی ذاتی آراء، خواہشات یا

گمان اس حیثیت کے حامل نہیں ہوتے کہ قطعی طور پر درست اور صائب ترین فیصلہ دے سکیں۔ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز پر مکمل قدرت رکھتا ہے‘‘۔(۴۱)

اگر مسلمان مؤرخین نے لکھا بھی تو اسے توڑ مروڑ کر پیش کیا اور اس میں کئی پہلوؤں سے کمی رہ گئی ہے اور اسلامی تعلیمات کی صحیح وضاحت نہیں ہوسکی۔ مولانا مودودیؒ ان پر تنقید کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:

’’گزشتہ اور موجودہ صدی میں مسلمانوں کی طرف سے بار ہا اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے اور اس کثرت کے ساتھ اس موضوع پر لکھا جا چکا ہے کہ اب یہ ایک فرسودہ مضمون معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس قسم کی جوابی تحریرات میں میں نے اکثر یہ نقص دیکھا ہے کہ اسلام کے وکلاء مخالفین سے مرعوب ہو کر خود بخود ملزموں کے کٹہرے میں جا کھڑے ہوتے ہیں اور مجرموں کی طرح صفائی پیش کرنے لگتے ہیں۔ بعض حضرات نے تو یہاں تک کیا ہے کہ اپنے مقدمہ کو مضبوط بنانے کے لیے سرے سے اسلام کی تعلیمات اور اس کے قوانین ہی میں ترمیم کر ڈالی، اور شدت مرعوبیت میں جن جن چیزوں کو انھوں نے اپنے نزدیک خوفناک سمجھا انھیں ریکارڈ سے غائب کر دیا تاکہ مخالفین کی نظر اس پر پڑ نہ سکے۔ لیکن جن لوگوں نے ایسا کمزور پہلو نہیں اختیار کیا ان کے ہاں بھی کم از کم یہ نقص ضرور موجود ہے کہ وہ جہاد و قتال کے متعلق اسلامی تعلیمات کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کرتے اور بہت سے پہلو اس طرح تشنہ چھوڑ جاتے ہیں کہ ان میں شک وشبہ کی بہت گنجائش باقی رہتی ہے۔(۴۲الف)

عمرہ کے لیے روانگی

بالآخر وہ وقت آ ہی گیا جب اللہ کے رسول ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ معظّمہ تشریف لے گئے اور عمرہ ادا کیا، پیغمبر کا خواب وحی کی ایک قسم ہے، چنانچہ آپ ﷺ ۱۴/سو اصحاب کے ساتھ عمرہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ لیکن قریش نے آپ کو اور آپ کے اصحاب کو عمرہ کرنے سے روک دیا۔ بہت ردوقدح کے بعد طے ہوا کہ اس سال واپس جائیں اور آئندہ سال عمرہ کے لیے آسکتے ہیں اور تین دن قیام کر سکتے ہیں، ایک صلح نامہ طے ہوا۔ دس سال تک جنگ نہیں ہوگی، کوئی ایک دوسرے کے خلاف کسی قسم کی خفیہ یا علانیہ کارروائی نہیں کرے گا۔ اس دوران قریش کا کوئی فرد بھاگ کر محمد ﷺ کے پاس جائے گا تو اس کو واپس کردیں گے لیکن محمد ﷺ کی طرف سے کوئی جائے گا تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا، اور قبائل عرب میں جو جس کے ساتھ حلیف بن کر رہنا چاہے اسے اختیار ہوگا کہ اس میں شامل ہوجائے۔

یہ صلح حدیبیہ دراصل ایک عظیم فتح تھی اسے قرآن میں فتح عظیم کہا گیا ہے۔آنکھوں نے دیکھا کہ اسلام کو غلبہ نصیب ہونے لگا، مسلمانوں کی طاقت بڑھنے لگی۔ جنگ بند ہونے کی وجہ سے دعوت اسلامی کے مواقع بہت وسیع پیمانہ پر میسر آ گئے۔ ''صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیان ایسا زمانہ تھا جس میں لوگوں تک دعوت پہنچانے کا بہترین موقع تھا۔ امام زہریؒ کہتے ہیں کہ اس سے بڑی فتح اسلام میں کبھی نہیں ہوئی، اس سے پہلے تو جنگ کے بادل منڈلاتے رہتے تھے۔ بنونظیر، بنوقینقاع اور بنوقریضہ کے مدینہ سے انخلاع کے بعد مسلمان ان کی سازشوں سے محفوظ تھے اور قرآن نے اسے فتح عظیم کے لفظ تعبیر کر کے اس فتح کو صحیح مقام دیا ہے اور سیرت نبوی میں یہ ایک بہت بڑا واقعہ ہے، اور اس سے اسلام کی تاریخ میں اور اس کی قوت میں اضافہ ہوا ہے اور انتہائی مضبوطی آئی ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ قریش نے اسلام کی قوت اور اسلام کے وجود کو تسلیم کیا ہے۔ اور یہ اس بات کا اعتراف تھا کہ نبی ﷺ اور مسلمان ان کے ہم پلہ ہیں۔ کئی جنگوں کے بعد ان کا طرز عمل معاندانہ نہیں تھا، آخری جنگ خندق میں وہ مسلمانوں کو اکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے لیکن یہاں وہ منظر نہیں تھا۔'' (۴۲ ب)

فتح مکہ اور بیت اللہ کی آزادی

لیکن صلح حدیبیہ میں جو شرائط لکھے گئے تھے ان میں ایک شرط یہ تھی کہ قبائل عرب میں سے جو قبیلہ بھی چاہے فریقین میں سے کسی کے ساتھ حلیف بن کر رہ سکتا ہے۔ اس معاہدہ کی رو سے بنوخزاعہ مسلمانوں کے ساتھ مل گئے اور بنوبکر قریش کے حلیف بن گئے۔ لیکن دونوں قبیلوں میں ایک زمانہ سے دشمنی چلی آ رہی تھی، چونکہ بنوبکر کو قریش کی حمایت حاصل تھی اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے رات کو بنوبکر نے بنوخزاعہ پر حملہ کر دیا اور حرم میں جان بچانے گئے تو وہاں بھی نہیں بخشا اور وہاں بھی قتل عام کیا گیا۔

یہ معاہدہ کی صریح خلاف ورزی تھی جب آپ ﷺ کو اس کی خبر ہوئی اور بنوخزاعہ کے ایک وفد نے آپ ﷺ کے سامنے دادرسی کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہاری مدد کی جائے گی''۔ یہ بہت بڑا نقض عہد تھا، آپ ﷺ نے مکہ پر چڑھائی کی تیاری شروع کر دی۔ تیاری مکمل ہونے کے بعد مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ چند صحابہ کو آپ نے بتایا، بعدازاں آپ نے اعلان عام فرمادیا، مگر اعلان عام کے باوجود آپ ﷺ چاہتے تھے کہ تیاری کی خبر قریش تک نہ پہنچے، اسی لیے حاطب بن ابی بلتعہ کے خط کو جو وہ چپکے سے مکہ معظّمہ سے آئی ہوئی ایک عورت کے ہاتھ بھیج رہے تھے تاکہ ان کے عزیزوں کو اطلاع ہو جائے، اللہ کے رسول ﷺ نے تین صحابیوں کو بھیج کر روضہ خاخ کے مقام پر اس عورت کو پکڑ لیا اور اس سے وہ خط حاصل

کر لیا۔

دعائے ابراہیم کی تکمیل ہونے والی تھی اور خانہ کعبہ کی تطہیر کا وقت آ گیا تھا۔ یہ گھر اب مسلمانوں کے قبضے میں آنے والا تھا، اور آپ ﷺ کی بعثت کی آخری کڑی تھی، جبکہ اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ اس گھر کو شرک سے پاک کرو۔

آپ مدینہ سے نکلے، چنانچہ ذی طوی اور اذخر کے مقام پر نبی ﷺ نے لشکر کی ترتیب نو کی اور ان کو سختی سے یہ ہدایت کی کہ نہ تو وہ کسی کو قتل کریں اور نہ ہتھیاروں کے استعمال میں پہل کریں۔ مکہ میں داخلہ پرامن ہوا اور اہل مکہ کے لیے امان کے حکم کی پوری پوری تعمیل کی جائے، یہی وجہ ہے "جب فوجی دستے شہر مکہ میں داخل ہو رہے تھے، حضرت سعد بن عبادہ انصار کا پرچم بلند کیے ہوئے ابوسفیان کے سامنے سے گزرے، تو یہ الفاظ ان کے منہ سے بے ساختہ نکل گئے "آج لڑائی کا دن ہے، آج کعبے کی حرمت حلال کر دی جائے گی"، ابوسفیانؓ نے یہ سن کر رسول ﷺ سے شکایت کی کہ سعدؓ نے غیر مناسب الفاظ کہے ہیں۔ رسول ﷺ نے فرمایا: "سعد نے غلط کہا، بلکہ آج اللہ تعالیٰ کعبے کو سر بلند کرے گا، اور آج کعبے کو عزت اور احترام کی چادر اڑھائی جائے گی"۔ آپ ﷺ کے یہ فرمانے کے بعد حضرت سعدؓ بن عبادہ سے پرچم لے کر ان کے صاحبزادے حضرت قیسؓ کو دے دیا گیا۔ حضرت سعدؓ نے یہ دیکھ کر رسول ﷺ سے گزارش کی کہ ان کے بیٹے سے پرچم واپس لے لیا جائے، انہیں یہ خدشہ ہے کہ کہیں ان کے بیٹے سے کوئی غلطی سرزد نہ ہو جائے، چنانچہ رسول ﷺ نے ان کے بیٹے سے بھی پرچم لے لیا"۔(۴۳)

آپؐ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو مکہ کی زیریں جانب سے جانے کا حکم دیا اور زبیر بن العوامؓ کو بالائی جانب سے، قیس بن سعدؓ کا لشکر مغرب میں کدا سے داخل ہوا اور آنحضرت ﷺ خود اذخر کے راستے سے مکہ میں داخل ہو گئے۔ اپنے مشن کی تکمیل کے اس مرحلہ میں آپ کی زبان سورہ نصر اور سورہ فتح کی تلاوت میں مصروف تھی۔ ان دونوں سورتوں میں فتح مکہ کے بارے میں پیشین گوئیاں ہیں۔ اللہ رب العزت کے احسان کو دیکھتے ہوئے کہ اس نے مکہ میں پرامن داخلہ ممکن بنایا، رسول اللہ ﷺ کا دل عاجزی اور شکرگزاری کے جذبات سے معمور تھا جس کا اظہار سواری پر آپ کی جھکی ہوئی گردن سے ہو رہا تھا۔

قریش نے جنگ کے لیے مختلف قبائل کے فوجی دستے جمع کر لیے تھے اور رسول ﷺ نے حکم دیا تھا کہ اگر ان قبائل نے راستہ روکنے کی کوشش کی تو ان سے جنگ کی جائے۔ خالد بن ولیدؓ کے دستے کو قریش کے نوجوانوں کی ایک ٹکڑی نے روکنے کی کوشش کی۔ اس کا انتظام تین قریشی لیڈروں صفوان بن

امیہ، عکرمہ بن ابی جہل اور سہیل بن عمرو نے کیا تھا جو ہتھیار ڈالنے کے فیصلہ کے مخالف تھے۔ لیکن یہ مزاحمت اتنی کمزور تھی کہ مسلمانوں کا تو کوئی خاص نقصان نہ ہوا، البتہ شر پسندوں کے بارہ تیرہ آدمی مارے گئے، اور دو مسلمان شہید ہو گئے۔ باقی تمام افواج کا داخلہ پر امن رہا۔ نبی ﷺ کو جب یہ بات معلوم ہوئی کہ خالد بن ولید کے دستے نے جنگ کی ہے تو آپ کو اس کا بڑا قلق ہوا۔ لیکن تحقیق سے پتہ چلا کہ غلطی خالد کی نہیں بلکہ زیادتی کا ارتکاب قریش کے بعض شرارتی عناصر نے کیا تو آپ نے اس کو تقدیر کا لکھا قرار دیا۔

تمام مسلمان سپاہ مکہ کے مختلف اطراف سے داخل ہو کر شہر کے وسط میں جمع ہوئی جہاں مقام حجون میں نبی ﷺ کے لیے خیمہ نصب کیا گیا۔ فتح مکہ کا یہ عظیم واقعہ ۲۰ رمضان ۸ ہجری کو پیش آیا۔ ''اس فتح وغلبہ کا اصل مقصود یہ تھا کہ مسجد حرام صرف خدائے واحد کی اطاعت وعبادت کا مرکز بن جائے اور ابراہیمؑ کی اولاد بت پرستی کی نجاست سے پاک ہو کر اپنے حقیقی رب سے وابستہ ہو جائے۔'' (۴۴) امام فراہیؒ اسی حقیقت کو سورہ لہب میں یوں لکھتے ہیں: ''پس چونکہ آنحضرت ﷺ کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد کعبہ کو کفار کے قبضہ سے نکالنا اور اس کو کفر و شرک کی آلودگیوں سے پاک کرنا تھا اس وجہ سے آپؐ نے اس (ابولہب) خائنِ امانت الٰہی اور ہادمِ دین ابراہیمی کو جو اہمیت دی وہ قریش کے تمام ارباب منصب و جاہ میں سے جو ندوہ، قیادت اور اللواء وغیرہ کے معزز منصبوں پر متمکن تھے کسی کو بھی نہ دی، حالانکہ ان لوگوں نے آپ کو ایذائیں دی تھیں، انھوں نے آپ سے جنگیں کی تھیں اور آپ کو بیت اللہ کے جوار سے نکالا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ دین الٰہی کا اصلی دشمن یہی تھا باقی سارا قریش اسی کے تابع فرمان تھا۔۔۔'' اور سورہ نصر کی تفسیر میں کہتے ہیں: ''جس طرح محمد ﷺ کی بعثت فتح مکہ پر تمام کی اسی طرح آپ کے صحیفہ نبوت کو اس فتح عظیم کے ذکر پر ختم کیا، یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ حق اپنے مرکز پر پہنچ گیا۔ کیونکہ کعبہ کے مرکز توحید و اسلام ہونے کی وجہ سے فتح مکہ ہی محمد ﷺ کی بعثت کا مرکز تھی۔ (۴۵)

سب سے پہلے آپ ﷺ نے توحید کا اعلان کیا، آپؐ نے فرمایا: ''لا الـه الا الـلـه وحـده لا شـريك لـه صـدق وعده ونصر عبده وهزم الاحزاب وحده''، جب آپ ﷺ کعبے کے بتوں پر ضرب لگا رہے تھے اور آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے: وقـل جـاء الـحـق و زهـق البـاطل ان البـاطل كان زهوقا۔ (۴۶) ترجمہ: ''اور کہہ دو کہ حق آ گیا اور باطل نابود ہو گیا، بیشک باطل نابود ہونے والا ہے۔'' آپ نے قریش کے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اب تم کیا امید کرتے ہو کہ میں

تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں، سب نے شرم ساری کے ساتھ جواب دیا کہ تو فیاض بھائی ہے اور فیاض بھائی کا بیٹا ہے، اس پر آپؐ نے فرمایا، جاؤ تم آزاد ہو، آج تم سے کوئی باز پرس نہیں''۔

آپؐ نے خانہ کعبہ کی کنجی دینے کے لیے عثمانؓ ابن طلحہ کو طلب فرمایا، وہ آئے تو آپﷺ نے انھیں خانہ کعبہ کی کنجی عطا کرتے ہوئے فرمایا:: هاك مفتاحك يا عثمان۔ اليوم يوم بر و وفاء (عثمان! یہ اپنی کنجی تھامو، آج بھلائی اور وفائے عہد کا دن ہے) دراصل یہی خانہ کعبہ کے کنجی بردار تھے۔ ہجرت سے پہلے نبی کریمﷺ نے عثمان ابن طلحہ سے خانہ کعبہ کی کنجی مانگی تھی لیکن انھوں نے دینے سے انکار کر دیا تھا اور آپﷺ پر غصہ کا اظہار کیا تھا لیکن آپﷺ نے اس وقت یہ کنجی ان ہی کے حوالہ کر دی جبکہ بنو ہاشم کے لوگ چاہتے تھے کہ یہ انہیں مل جائے۔

رسولﷺ کے اس اعلیٰ اخلاق کے نتیجہ میں عثمان ابن طلحہ مسلمان ہو گئے، اور ابھی تک یہ خدمت کا سلسلہ انہی کے خاندان کے ساتھ وابستہ ہے۔ ابن اسحاق فتح مکہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''عرب، اسلام کے متعلق کوئی حتمی فیصلہ کرنے سے اس وقت تک جھجکتے رہے، جب تک رسولﷺ اور قریش کے درمیان دوٹوک فیصلہ نہیں ہو گیا۔ یہ جھجک اس وجہ سے تھی کہ قریش کو تمام لوگوں کی سرداری حاصل تھی، وہ کعبے کے متولی اور نگراں تھے اور حضرت ابراہیمؑ کے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں شامل تھے اور عرب کے تمام سرداروں نے اس بات کو قبول کر رکھا تھا۔ قریش وہ لوگ تھے جنہوں نے رسولﷺ کے خلاف جنگ کا آغاز کیا تھا۔ جب مسلمانوں کے ہاتھوں مکہ فتح ہو گیا اور قریش نے سر تسلیم خم کر کے اسلام قبول کر لیا تو عرب قبائل نے یہ محسوس کیا کہ ان کے اندر اتنا دم خم نہیں ہے کہ وہ رسولﷺ کے خلاف جنگ کریں، یا ان کے خلاف کسی قسم کی جارحیت کا مظاہرہ کریں تو انہوں نے بھی اللہ تعالیٰ کے دین میں داخل ہونے کا اعلان کر دیا جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ خود فرماتے ہیں'' چاروں طرف سے لوگ فوج درفوج رسول کی طرف آ رہے ہیں''۔

بیت اللہ کو آزاد کرانا دراصل دعوت اسلامی کا ماحصل تھا، فتح مکہ اس امت پر اتمام نعمت کا فتح باب ثابت ہوا'' آپ کی بیس سالہ دعوت کا مرکزی نقطہ یہی تھا کہ اللہ ایک ہے، وہی حقیقی معبود ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، حضرت ابراہیمؑ نے اسے توحید کا مرکز بنایا تھا لہٰذا مشرکین کا اس پر قبضہ ناجائز تھا۔'' (۴۷) اور سورہ فتح میں فتح وغلبہ کی ان پیشین گوئیوں اور بشارتوں کا بھی حوالہ ہے جو اس امت کے باب میں تورات اور انجیل میں وارد ہوئی ہیں۔ بیت اللہ کا مقصد پورا ہوا، بیس سال تک جس چیز کی دعوت دی

جارہی تھی وہ آج پوری ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے اس گھر کو پاک رکھنے کی اپنی پوری ذمہ داری ادا کی اور ان کی اولاد پر جب اس کی تولیت کی ذمہ داری عائد ہوئی تو انھوں نے اسے شرک و بت پرستی کا مرکز بنا دیا اور اس کے کونے کونے میں بتوں کو جمع کر دیا اور توحید کے سارے مظاہر کو شرک سے آلودہ کر دیا۔ انھیں اس منصب سے معزول کر دیا گیا اور حضرت ابراہیمؑ کی وہ دعا مقبول ہوئی جو انھوں نے کی تھی کہ اے اللہ ایک امت بر پا کرنا جو اس کو شرک سے پاک رکھے۔(۴۸)

آپ ﷺ نے فتح مکہ کے بعد متعدد خطبے دیے اور ان خطبوں میں شریعت کے بہت سے احکام جاری کیے، فتح مکہ کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ مشرکین کی قیادت قریش سے نکل کر دو قبائل ہوازن اور ثقیف میں منتقل ہو گئی۔ ان دونوں قبائل نے فوری طور پر مشرکین کی قیادت سنبھال کر اس خلا کو پر کرنا چاہا جو قریش کی شکست سے پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف جنگ شروع کر دی جو غزوہ حنین اور محاصرۂ طائف پر منتج ہوئی۔

حجة الوداع

''رسول اللہ ﷺ نے اپنے حج پر جانے کی نیت کی اور حج پر جانے کا اعلان کر دیا اور لوگوں کو بتلا دیا کہ جو اس میں شریک ہونا چاہتے ہیں اس میں شریک ہو جائیں اور آپ ذی الحجہ کی آخری تاریخوں میں نکل گئے اور اپنی غیر حاضری میں ابو دجانہؓ کو مدینہ کی ذمہ داری سونپ دی۔ یہ حج ان تمام طریقوں سے مختلف تھا جو اہل عرب ایام جاہلیت میں کیا کرتے تھے''۔(۴۹)

فتح مکہ کے بعد آخری عمل آپؐ کا حج رہ گیا تھا، گویا آپؐ کا یہ پہلا اور آخری حج تھا۔ اب آپؐ نے اس گھر کی زیارت کی جسے آپ نے شرک سے پاک کیا تھا۔ نبیؐ کی بعثت کا مقصد پورا ہوا اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا (سورہ مائدہ ۳) ''آج کے دن تمہارے لیے دین کو میں نے کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لیے پسند کیا''۔

آپ ﷺ نے جاتے جاتے اپنی یہ ذمہ داری امت مسلمہ کی طرف منتقل کر دی اور کہا کہ میری باتیں ان تک پہنچا دی جائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں، ہوسکتا ہے جو یہاں موجود نہیں ہیں وہ سننے والوں سے زیادہ اس حقیقی ذمہ داری کو نباہ سکیں۔ اس طرح جاہلیت کا اختتام ہوا، اور سنت ابراہیمی کی تجدید ہوئی، مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں کہ قرآن نے اس حج کو حج اکبر کہا ہے کہ یہ پہلا موقع تھا کہ رسم حج

ابراہیمی سنت میں جلوہ گر ہوئی، اس حج کا مقصد یہ تھا کہ خانہ خلیل میں عہد جاہلیت کے اختتام اور حکومت اسلام کی ابتدا کا اعلان کیا جائے، زمانہ جاہلیت کے رسوم وعادات کا ابطال کیا جائے''۔(۵۰)

نبی ﷺ کے ساتھ اللہ کی سنت

چونکہ آپ کی بعثت براہ راست قریش کی طرف ہوئی تھی اسی لیے اللہ تعالی نے آغاز رسالت کے وقت حکم دیا؛ وانذر عشيرتك الاقربين ، اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈرسناؤ۔ آپ ﷺ ۱۳/ سال تک قریش کو دعوت دیتے رہے اور جب انھوں نے رسول ﷺ کو قتل کرنے سازش کر ڈالی تو اللہ تعالی نے آپ کو ہجرت کرنے کا حکم دے دیا ہجرت کرنے کے بعد اللہ کی سنت یہ ہے کہ اس قوم پر عذاب کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ پہلے قریش کے لوگ قحط سالی میں مبتلا ہوئے جس کا ذکر سورہ دخان آیت ۱۵ میں ہے اور اس قحط سالی کے بعد سب سے بڑا عذاب جنگ بدر تھا، جسے'' يوم نبطش البطشة الكبرى'' (سورہ دخان ۱۶) کہا گیا ہے۔ اسی سنت کے مطابق اللہ تعالی نے قریش پر جنگوں کا سلسلہ شروع کردیا۔ آپ ﷺ براہ راست قریش کی طرف مبعوث ہوئے تھے اس لیے ان کے لیے دو آپشن تھے یا دعوت قبول کرو اور اگر قبول نہیں کرتے تو'' خذوهم و احصروهم واقعدوا لهم كل مرصد '' (سورہ توبہ) یعنی ان کے خلاف ہر قسم کی جنگی کاروائی کی جائے اور ہر پہلو سے ان کا ناطقہ بند کردیا جائے۔ اس شدت کے ساتھ ان کی داروگیر کے اس حکم کی وجہ یہ ہے کہ اس کی نوعیت محض ایک دشمن کے خلاف اقدام کی نہیں تھی بلکہ یہ مشرکین عرب کے لیے اس سنت الہی کا ظہور رہا تھا جو رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں کے لیے ہمیشہ ظاہر ہوئی ہے (مزید سورہ اعراف میں) اور مشرکین عرب کے لیے دو راہیں تھیں اسلام یا تلوار فان تابوا وأقاموا الصلوة وآتوا الزكوة فخلوا سبيلهم ، مطلب یہ کہ ان کی یہ داروگیر اس وقت تک بند نہ کی جائے جب تک یہ اپنے کفر وشرک سے تائب ہو کر نماز قائم نہ کریں اور زکوۃ نہ ادا کرنے لگ جائیں۔ نماز اور زکوۃ ایک جامع تعبیر ہے، اسلام کے نظام عبادت واطاعت میں داخل ہونے کی۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ اسلام کے بغیر نہ ان کے لیے ذمی یا معاہد بن کر اسلامی نظام میں باقی رہنے کی گنجائش رہی، نہ لونڈی غلام بن کر۔ ان کے لیے صرف دو راہیں باقی رہیں، یا تو اسلام قبول کریں یا تلوار''۔(۵۱)

اسی لیے اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا، "أمرت أن أقاتل الناس حتى يشهدوا أن لا اله الا الله وأن محمدا رسول الله ويقيموا الصلاة ويوتوا الزكاة فاذا فعلوا ذلك عصموا منى

دمائهم وأموالهم الا بحق الاسلام وحسابهم على الله تعالى''، مجھے حکم ملا ہے کہ میں لوگوں سے (قریش) سے جہاد کروں تا آنکہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اگر انھوں نے ایسا کر لیا تو انھوں نے اپنی جانوں اور اپنے اموال کو بچا لیا الا یہ کہ ان پر اسلام کی طرف سے کوئی سزا نافذ ہوتی ہو (اور وہ تو ہوگی ہی) اور ان کا حساب اللہ کے اوپر ہے۔(۵۲)

''الناس'' سے مراد قریش کے لوگ ہیں، اور قریش کے لوگ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں سے تھے۔

''مشرکین عرب کے ساتھ یہ خاص معاملہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر انہی میں سے ایک رسول بھیجا، انہی کی زبان میں ان پر اپنی کتاب اتاری، اسی ملت کی ان کو دعوت دی گئی جس کے وہ مدعی تھے۔ رسول نے مسلسل ۲۳ ؍سال تک ان کو جھنجھوڑا اور جگایا، ان کی ہر مجلس اور ہر بزم میں وہ پہنچا، ان کے ایک ایک دروازے پر دستک دی، ان کے ایک ایک شبہہ اور ایک ایک اعتراض کا جواب دیا، ان کی تمام الزام تراشیوں، تہمتوں اور عداوتوں کا مقابلہ کیا، ان کے مطالبے پر معجزے بھی دکھائے گئے اور ان کی منتخب کی ہوئی کسوٹیوں پر بھی اپنے کو کھرا اور سچا ثابت کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کے اندر جو اچھے لوگ تھے وہ اس کے ساتھی بھی بن گئے، اس سارے اہتمام کے بعد بھی جو لوگ قبول حق پر آمادہ نہیں ہوئے، آخر وہ کس لیے باقی رکھے جاتے۔ رسول اتمام حجت کا کامل اور آخری ذریعہ ہوتا ہے، جو لوگ اس کے جگانے سے بھی نہیں جاگتے وہ مردہ ہیں اور مردوں کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ دفن کر دیے جائیں۔''(۵۳)

آپ ﷺ رحمة للعالمین تھے

آپ ﷺ کی بعثت تمام دنیا کی طرف تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَكَذَالِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيكُم شَهِيداً۔ ''اور اسی طرح ہم نے تمہیں امت وسط بنایا تاکہ تم لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے''۔(۵۴) اسی طرح دوسری آیت ''اور ہم نے تم کو تمام اہل عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے'' (سورہ انبیاء ۱۰۷)، ''کہہ دو اے لوگو، میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں''۔(۵۵) ''سب لوگوں کی طرف'' یعنی بنی اسرائیل و بنی اسماعیل، عرب، غیر عرب سب کی طرف''۔ اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کے ساتھ جو وعدہ فرمایا تھا اس کے الفاظ یوں ہیں: ''ابراہیمؑ کی اولاد دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہوگی اور ان کی نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی'' (عہد نامہ قدیم، پیدائش۔

۱۸:۲۲) حضرت ابراہیمؑ کی نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قوموں کے برکت پانے کی شرط حضور نبی کریم ﷺ سے پہلے کبھی پوری نہیں ہوئی۔ عیسائیت کو اقوام عالم میں ضرور فروغ حاصل ہوا لیکن اس کا واسطہ نسل ابراہیمؑ نہ بنی بلکہ دوسرے لوگ بنے۔(۵٦)

''اور ہم نے تم کو سب لوگوں کے واسطے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جان رہے ہیں''۔(سورہ سبا:۲۸)

یہی وجہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد آپ ﷺ نے قبائل عرب میں بالعموم اور گرد و پیش کی ریاستوں کے حکمرانوں اور فرمانرواؤں کی طرف بالخصوص اپنے سفیر بھیجے اور مکاتیب لکھ کر ان کو دعوت اسلام دی۔ اس سے ہزاروں برس پہلے سنائی گئی ایک پیشین گوئی پوری ہوگئی، تورات میں بتایا گیا تھا:

''خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی''۔(۵۷)

علامہ عنایت اللہ چریا کوٹی کی تحقیق کے مطابق سینا، بحر احمر کے شمالی سرے پر دو خلیجوں کے درمیان کا علاقہ ہے، جہاں حضرت موسیٰؑ کو نبوت عطا ہوئی، پھر اس کے ایک پہاڑ کی ایک چوٹی پر ان کو تورات عطا ہوئی، صحرائے سینا کی نمکین جھیل اور خلیج سویز کے درمیان ایک پہاڑ ہے جس کا عبرانی نام سعیر ہے۔ اسی کے آس پاس بنی اسرائیل عبور دریا کے بعد رہے اور عہد و پیمان کیا۔ فاران وہ مقام ہے جہاں حضرت اسماعیلؑ آباد ہوئے۔ گویا اس سے مراد مکہ کی وادی ہے۔ قدوسی سے مراد پاکیزہ صفات، خدا ترس، نیک اور عبادت گزار بندے ہیں۔ فتح مکہ کے موقع پر ان صفات کے حامل صحابہ کرام کی تعداد دس ہزار تھی۔

پیشین گوئی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سینا میں بنی اسرائیل کے عظیم فرزند موسیٰؑ کو رسالت سے سرفراز فرمایا۔ سعیر کی دشت پیمائی میں ان کو تورات سے نوازا۔ اس کے بعد خداوند نے اپنی ہدایت کا کامل اظہار مکہ میں محمد ﷺ کی بعثت کی صورت میں کیا اور ان کو مکہ پر غلبہ عطا فرمایا۔ وہ اپنے دس ہزار پاکباز ساتھیوں کے ساتھ یہاں متمکن ہوئے اور شریعت نافذ کی۔(۵۸)

علامہ عنایت اللہ چریا کوٹیؒ اپنی کتاب ''بشریٰ'' میں لکھتے ہیں کہ عبرانی زبان میں لفظ ''شیلو'' حضور ﷺ کے لیے استعمال ہوا ہے، ''پس شیلو کے معنی مخرج اور مہاجر کے ہوں گے، آپ کی ہجرت تو ایسی تھی کہ کتنے آدمی کفار کے جور سے مدینہ جا بسے اور یہ ہجرت مثل حضرت ابراہیم بموجب فرمان الٰہی تھی''۔

(۵۹) اور لکھتے ہیں کہ ''شیلو وہ شخص ہوگا جو شریعت دوسروں کی منسوخ کرے گا اور دوسری شریعت جاری کرے گا، ایسا سوائے ہمارے پیغمبر کے نہ ہوا نہ ہوگا، اور کوئی مصداق نہیں ہوگا۔'' (۶۰) اور یہی ہوا کہ آپ ﷺ نے حضرت ابراہیمؑ کی سنت کو زندہ کیا اور تمام شریعتوں کو کالعدم قرار دے دیا۔

....

حواشی اور تعلیقات:

(۱) سورہ آل عمران: ۱۶۴

(۲) علوم الحدیث، ڈاکٹر صبحی صالح۔ بیروت

(۳) ابوداؤد، مسند احمد، دارمی، حاکم، بیہقی فی المدخل بحوالہ سنت کی آئینی حیثیت، مولانا سید ابو الاعلی مودودیؒ، ص: ۳۵۱

(۴) بخاری

(۵) تفہیم القرآن سے اقتباسات

(۶) تفسیر سورہ لہب، امام حمید الدین فراہیؒ

(۷) دعوت دین اور اس کا طریقہ کار، ص: ۲۴، مولانا امین احسن اصلاحی

(۸) خطبات، مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ، ص: ۲۳۹

(۹) سورہ الممتحنہ: ۴

(۱۰) سورہ کافرون

(۱۱) ذبیح کون ہے؟ امام حمید الدین فراہیؒ

(۱۲) نفس مصدر

(۱۳) تفسیر سورہ فیل، امام حمید الدین فراہیؒ

(۱۴) سورہ بقرہ: ۱۲۸۔۱۲۹

(۱۵) تدبر قرآن، مولانا امین احسن اصلاحیؒ: ۱/۳۳۸

(۱۶) تفہیم القرآن، مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ، جلد اول، حاشیہ ۱۲۹

(۱۷) سورہ بقرہ: ۲۴۳

(۱۸) تدبر قرآن، مولانا امین احسن اصلاحیؒ: ۱/۵۶۶

(۱۹) سورہ بقرہ: ۱۲۵

(۲۰) تفہیم القرآن، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، جلد اول، حاشیہ ۱۲۶

(۲۱) خطبات، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ص: ۲۳۶

(۲۲) تفسیر سورہ لہب، امام حمید الدین فراہیؒ

(۲۳) سورہ حج، آیت: ۲۶/ تا ۲۹/

(۲۴) سورہ الحج، آیت: ۲۶/ تا ۲۹/

(۲۵) سورہ الغاشیہ، آیت: ۲۲

(۲۶) تفسیر سورہ عبس، امام حمید الدین فراہیؒ

(۲۷) تفہیم القرآن، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، جلد ۶، سورہ عبس

(۲۸) اساس دین کی تعمیر، مولانا صدر الدین اصلاحیؒ

(۲۹) تفسیر سورہ کافرون، امام حمید الدین فراہیؒ

(۳۰) سیرت سرور عالم، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، جلد سوم

(۳۱) تفہیم القرآن، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ: اول، ص ۴۷

(۳۲ الف) تفہیم القرآن، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، اول، ص ۴۷ـ۴۸

(۳۲ ب) سورۃ الحج: ۳۹ـ۴۰، مزید تفصیل کے لیے قرآن کہ ان سورتوں کی تفسیر کا مطالعہ مفید رہے گا: تفسیر سورہ کافرون از امام حمید الدین فراہیؒ، سورہ انفال، سورہ توبہ اور سورہ حج تفسیر تفہیم القرآن از مولانا مودودیؒ اور تدبر قرآن از مولانا امین احسن اصلاحیؒ اور ''سیرت سرور عالم باب اذن قتال اور حکم جہاد'' ص ۱۰۵ـ۱۱۱/ از مولانا مودودیؒ اور اس سلسلہ میں مولانا مودودیؒ کی ''الجہاد فی الاسلام'' کا مطالعہ بھی بہت مفید ہوگا۔ اس موضوع پر یہ کتابیں بھی بہت ہی مفید ہوں گی: ''دعوت دین اور اس کا طریقہ کار'' از مولانا امین احسن اصلاحی، اور ''اسلام ایک نظر میں'' کا باب ''امت مسلمہ کی ذمہ داریاں'' از مولانا صدر الدین اصلاحیؒ اور ''دعوت دین کا انبیائی طریق کار'' از ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادیؒ۔

(۳۳) تیسیر القرآن از مولانا صدالدرین اصلاحیؒ، ترتیب وتدوین: رضوان احمد فلاحی

(۳۴) تفہیم القرآن، از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، جلد ۵ حاشیہ ۵۱

(۳۵) تدبرقرآن، مولانا امین احسن اصلاحیؒ، جلد ۷ ص ۴۶۹

(۳۶) سورہ حدید: ۲۵

(۳۷) سیرت النبی، جلد اول ،ص: ۲۰۱، علامہ شبلیؒ ومولانا سید سلیمان ندویؒ

(۳۸ الف) ''یہود کی تاریخ: درحقیقت جو بات ثابت ہے وہ یہ ہے کہ جب ۷۰ء میں رومیوں نے فلسطین میں یہودیوں کا قتل عام کیا اور پھر ۱۳۲ء میں انہیں اس سرزمیں سے بالکل نکال باہر کیا، اس دور میں بہت سے یہودی قبائل بھاگ کر حجاز میں پناہ گزیں ہوگئے تھے، کیونکہ یہ علاقہ فلسطین کے جنوب میں ہی واقع تھا۔ یہاں آکر انھوں نے جہاں جہاں چشمے اور سرسبز مقامات دیکھے وہاں ٹھہر گئے اور پھر رفتہ رفتہ اپنے جوڑ توڑ اور سودخواری کے ذریعہ ان پر قبضہ جما لیا۔ ایلہ، مقنا، تبوک، تیماء، وادی القری، فدک اور خیبر پر ان کا تسلط اسی دور میں قائم ہوا، اور بنی نضیر، بنی بہدل اور نبی قینقاع بھی اسی دور میں آکر یثرب پر قابض ہوئے۔ (مزید تفصیل کے لیے ''یہودیت و نصرانیت'' از مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ ص: ۲۲۶۔۲۲۷)

(۳۸ب) سیرت سرور عالم، مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ، جلد سوم ص ۲۳۰

(۳۹) استثناء، باب ۲۰، آیت ۱۰۔۱۴، بحوالہ الجہاد فی الاسلام، ص: ۳۱۰

(۴۰) اس واقعے کی بنا پر مخالفین نے آنحضرت ﷺ پر بدعہدی کے اور سنگ دلی کے شدید الزامات لگائے ہیں۔۔۔[اس سلسلے میں حضرت سعد بن معاذ ؓ کے فیصلے کو]۔۔۔انتقام۔۔۔سختی اور سنگ دلی سے تعبیر کرنے سے پہلے چند امور کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے:

۱۔ بنو قریظہ اور ان کے ہم قوم بنی نظیر کی بدعہدیوں کو دیکھ کر یہ ناممکن تھا کہ ان سے از سرِ نو کوئی معاہدہ کیا جاتا اور یہ توقع قائم کی جاسکتی کہ پھر کسی نازک موقع پر وہ اسے نہ توڑ دیں گے۔

۲۔ ان کے قلعے مدینے سے بالکل متصل تھے اور ایسی صریح غداری کے بعد ان کے اتنے قریب رہنے سے ہر وقت خطرہ تھا کہ کب کسی دشمن کو عین مسلمانوں کے گھروں پر چڑھا لائیں۔

۳۔ ان کو جلا وطن بھی نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ان سے پہلے ان کے بھائی بنونظیر کو جلا وطن کرنے کے نتیجہ یہ ہوا تھا کہ انھوں نے مسلمانوں سے دور بیٹھ کر اطمینان کے ساتھ جنگ کی تیاریاں کیں اور فوجیں جمع کر کے مدینے پر چڑھ آئے۔

۴۔ ان باتوں کے باوجود آنحضرت ﷺ نے خود ان کے لیے کوئی سزا تجویز نہیں کی، بلکہ ان کی

مرضی اور اتفاق سے ایک ایسے شخص کو حکم بنایا جو خود ان کا پشتینی حلیف تھا۔

۵۔ثالثی اور پنچایت کے متعلق یہ تمام دنیا کا مسلمہ قانون ہے کہ جب فریقین کے اتفاق سے کوئی شخص حکم ،ثالث بنایا جائے تو جو فیصلہ وہ کر دے،اس کی پابندی فریقین پر لازم ہے۔

٦۔سعدؓ بن معاذ نے جو فیصلہ کیا وہ تورات کے احکام کے مطابق تھا،اسی لیے کسی یہودی نے اس کے خلاف ایک لفظ نہ کہا۔

۷۔ان میں سے صرف وہ مرد قتل کیے گئے جو ہتھیار اٹھانے کے قابل تھے، کیونکہ انھی سے جنگ و غدر کا اندیشہ تھا۔ باقی رہیں عورتیں اور بچے ان کے سرداروں کے قتل ہو جانے کے بعد ان کی پرورش کا، بجز اس کے اور کیا وسیلہ ہوسکتا تھا کہ مسلمان خود ان کے کفیل بنتے۔

۸۔ان وجوہ کو ذہن نشین کر لینے کے بعد یہ تسلیم کرنے میں کوئی روک باقی نہیں رہتی کہ بنوقریظہ کے ساتھ جو سلوک کیا گیا، وہ عین انصاف کے مطابق تھا اور اس کے سوا کوئی سلوک نہیں کیا جا سکتا تھا''۔

(سیرت سرورعالم،ازمولانا سیدابوالاعلیٰ مودودیؒ،جلد سوم ص ۲۳۰۔۲۳۱)

(۴۱) مدنی معاشرت عہد رسالت میں،تالیف: ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری،ترجمہ عذرا نسیم فاروقی، ص:۲٦۔۲۷

(۴۲الف) الجہاد فی الاسلام،ازمولانا سیدابوالاعلیٰ مودودیؒ،ص:۱٦

(۴۲ب) فی ظلال القرآن،سیدقطبؒ

(۴۳) مدنی معاشرہ عہد رسالت میں،از ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری،ترجمہ: عذرا نسیم فاروقی،ص: ۴۲۹۔۴۳۰

(۴۴) سورہ کافرون،امام فراہیؒ

(۴۵) سورہ لہب،امام فراہیؒ

(۴٦) سورہ بنی اسرائیل

(۴۷) حیات رسول امی ﷺ،خالد مسعودؒ

(۴۸) مزید معلومات کے لیے: تدبر قرآن،ازمولانا امین احسن اصلاحیؒ،جلد اول ص ۳۳۴

(۴۹) فقہ السنہ،محمد الغزالیؒ

(۵۰) سیرت النبی،علامہ شبلیؒ،جلد اول

(۵۱) تدبر قرآن مولانا امین احسن اصلاحیؒ، جلد سوم، ص: ۵۴۰
(۵۲) بخاری و مسلم
(۵۳) تدبر قرآن، از مولانا امین احسن اصلاحیؒ، جلد سوم، سورہ توبہ: ۵۴۰۔۵۴۱
(۵۴) سورہ بقرہ: ۱۴۳
(۵۵) سورہ اعراف: ۱۵۸
(۵۶) حیات رسول امی ﷺ، از خالد مسعودؒ ص: ۴۵۴
(۵۷) حیات رسول امی ﷺ
(۵۸) حیات رسول امی ﷺ ص ۴۸۸۔۴۸۹
(۵۹) بشریٰ، علامہ عنایت اللہ چڑیا کوٹیؒ
(۶۰) بشریٰ

داعیٔ اعظم کے بعض داعیانہ اوصاف واسالیب

(قرآن مجید کی روشنی میں)

مولانا محمد اسماعیل فلاحی،

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، نئی دہلی

داعی اعظم نبی اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی بابت ایک سوال کے جواب میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا: ''کان خلقه القرآن'' یعنی آپؐ مجسم قرآن تھے۔ قرآن کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ وہ اخلاق واوصاف جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں آپ کی سیرت مطہرہ ان کا کامل نمونہ تھی۔

قرآن اگر نظریہ (تھیوری) تھا تو آپؐ کی زندگی اس کا علمی مظہر (پریکٹیکل) تھی۔

قرآن اگر اللہ واحد کی بندگی اور عبادت کا نام تھا تو آپؐ پیکر عبودیت و بندگی تھے۔

قرآن اگر ایک تحریک تھا تو آپؐ سراپا تحریک تھے۔

قرآن اگر ایک دعوت تھا تو آپؐ کی حیات طیبہ اس دعوت کا عملی نمونہ تھی۔

خلاصہ یہ کہ قرآن جس اسلام وایمان، محبت واخلاص، قربانی وفدائیت، تقوی اور خشیت، رجاوتوکل، توبہ وانابت، بندگی واخلاص، سیاست وحکمرانی اور جہاد سے عبارت ہے، آپ اس کا مصداقِ کامل تھے۔

قرآن کریم میں مختلف انبیاء کرامؑ کے جو دعوتی تذکرے ہیں اور ان میں جو حکمت عملی اور اسلوبِ دعوت ملتا ہے، آپؐ کی داعیانہ زندگی میں ان تمام حکمت عملی اور اسالیبِ دعوت کا رنگ نمایاں ہے، لیکن اس مختصر سے مضمون میں آپؐ کی صرف ان چند صفات اور اسالیب کو نمایاں کیا گیا ہے جو قرآن پیش کرتا ہے، اگرچہ یہ اوصاف واسالیب دوسرے انبیاء کے یہاں بھی موجود ہیں۔

داعیانہ بصیرت

قرآن کا اشاد ہے: ''کہہ دو اے نبی یہ میری راہ ہے میں اللہ کی طرف بلا رہا ہوں اس حال میں کہ

میں اور میرے متبعین پوری بصیرت اور روشنی میں ہیں‘‘۔(سورہ یوسف۔۱۰۸)

یعنی پوری بصیرت کے ساتھ ہم نے اور ہمارے ساتھیوں نے یہ کام شروع کیا ہے اور کر رہے ہیں، اپنی ہر بات پر ہم دلیل رکھتے ہیں اندھیرے میں تیر نہیں چلا رہے ہیں۔اللہ تعالی نے سماعت، بصارت اور دل کی جو روشنی عطا فرمائی ہے اس کو بند کر کے رکھ نہیں دیا ہے۔اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔اس مفہوم کی متعدد آیات قرآن کریم میں مل جائیں گی۔

واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی داعی کے لیے پہلی چیز یہی ہے، داعی کو بالکل واضح اور دوٹوک انداز میں دلائل کے ساتھ اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ وہ کس چیز کی دعوت پیش کر رہا ہے؟ اس کے نکات کیا ہیں؟ اس کی بنیاد کیا ہے، اور اس بنیاد کی فروعات کیا ہیں؟ کون سی چیز مقدم اور کون سی چیز مؤخر ہے؟ کس چیز کا درجہ فرض وواجب کا ہے اور کون سی چیز محض ندب واستحباب کی حیثیت رکھتی ہے؟ اسے آغاز کہاں سے کرنا ہے اور جانا کہاں ہے؟ اس کی منزل کیا ہے؟ اس منزل کی راہ کیا ہے اور اس راہ کے نشیب وفراز کیا ہیں؟ اس راہ میں مشکلات اور موانع کیا کیا ہیں؟ شب خون مارنے والے کہاں کہاں ہیں اور کس کس طرح مارا کرتے ہیں؟ ان مدمقابل طاقتوں کا مزاج کیا ہے؟ نفسیات کیا ہے؟ ان کے نظریات اور ان نظریات کے دلائل کیا ہیں؟ ان کی روایات اور رسوم ورواج کیا ہیں؟ ان کی کمزوریاں کیا ہیں؟ ان کے مسائل کیا ہیں؟ ان مخالف طاقتوں کی مخالفت کس کس سطح پر ہے؟ کون لوگ سیاست وقیادت کے مقام پر ہیں؟ کون لوگ مذہبی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں؟ کون معاندین ہیں؟ کون سادہ قسم کے مخالفین ہیں؟ کون متربصین ہیں؟ کون سادہ قسم کے عوام ہیں جنہیں کسی سے کچھ لینا دینا نہیں ہے؟ ان میں کون سلیم الفطرت لوگ ہیں اور کون محض جھگڑالو، نور فطرت سے محروم؟ پھر ان میں اور داعی میں کیا کچھ باتوں کا اشتراک بھی ہے یا نہیں؟ اس پر مزید یہ کہ اپنی صفوں میں کون لوگ کس صلاحیت کے مالک ہیں؟ کس کے اندر کون سے نمایاں اوصاف ہیں اور خاص بات یہ کہ اپنے اندر کے مارِ آستین کون لوگ ہیں؟ دوست اور دشمن کی ان سب باتوں سے دلیل وبرہان کی بنیاد پر کامل واقفیت ایک داعی گروہ کے لیے اشد ضروری ہے۔

دعوت پر ایمان کامل

داعی جس چیز کی دعوت دے رہا ہے اس کی صحت پر اسے کامل یقین ہو۔اس میں کسی طرح کا شک وشبہ اور تذبذب نہ ہو، وہ خود سب سے آگے بڑھ کر، سب سے پہلے اس پر ایمان رکھتا ہو اور اس راہ پر چل پڑا ہو۔اس کی زندگی اور موت، اس کی نماز وقربانی سب اسی کے لیے ہو، دوسرے ساتھ نہ دیں تو بھی

اسے اس کی پروانہ ہو، وہ اکیلا ہی منزل کی طرف چل پڑے، اس یقین کے ساتھ کہ اللہ کا ہر وعدہ سچا اور ہر وعید برحق ہے:

''اے نبی کہہ دو میری نماز اور میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ رب العالمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں، مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے اپنے آپ کو حوالہ کرنے والا ہوں''۔

''کہہ دو اے لوگو! اگر تم دین کے انکار اور مخالفت پر تلے ہوئے ہو تو مجھے کچھ پروا نہیں، میں ان معبودوں کی عبادت نہیں کرسکتا جن کو تم پوجتے ہو بلکہ میں اس اللہ کی بندگی کرتا رہوں گا جو تمہیں موت دیتا ہے، مجھے اسی کا حکم دیا گیا کہ میں ایمان لانے والوں میں سے بنا رہوں''۔

اس مفہوم کی آیات ایک سے زیادہ مقامات پر آئی ہیں۔ اللہ کی آیات اور وعدوں اور وعیدوں پر یہ یقین ہی تو تھا کہ سفر ہجرت کے موقع پر بالکل غار ثور کے دہانے پر کفار جا پہنچے اور صدیق اکبر کو اندیشہ ہوا لیکن حضورؐ پورے اطمینان کے ساتھ تھے، اس موقع کا تذکرہ قرآن یوں کرتا ہے:

''جب کہ تم دونوں غار میں تھے اور جب کہ نبی اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا پریشان نہ ہو، رنج نہ کرو، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے''۔

اسی طرح کے ایک موقع پر حضرت موسیٰ نے فرمایا تھا، جبکہ سامنے ٹھاٹھیں مارتا سمندر اور اس کی خونخوار موجیں تھیں اور پیچھے فرعون کا لشکر جرار تھا، موسیٰ کے ساتھی گھبرا گئے اور کہنے لگے ''بس ہم تو ان کے ہاتھ آ گئے''، موسیٰ نے جواب دیا: ''ہرگز نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا، یقیناً میرے ساتھ میرا رب ہے، وہ میری رہنمائی کرتا رہے گا۔''

اللہ کی باتوں پر یہی یقین تھا کہ مشکل سے مشکل اور صبر آزما وقتوں میں آپ نے جس استقامت اور پامردی کا مظاہرہ کیا، وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔ آپ کو حکم الٰہی تھا: ''ثابت قدم رہو جس طرح اولوالعزم رسول ثابت قدم رہے''۔ (احقاف۔۵۳) اللہ کے وعدوں اور وعیدوں پر کامل ایمان وایقان کے نتیجہ میں آپ کی نمایاں صفت استقامت و پامردی ہی تھی جس کا مظاہرہ بار بار ہوا۔ مشرکین کے سخت دشمنانہ موقف اور محترم چچا کی طرف سے یہ محسوس ہونے کے بعد کہ شاید اب وہ بھی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیں گے، آپ پر کوئی اثر نہ پڑا، کوہ ہمالہ کی طرح جمے رہے، اور فرمایا: ''(چچا جان!) بخدا اگر یہ لوگ میرے

داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ کر یہ چاہیں کہ میں اس دعوت سے باز آجاؤں تو ایسا نہیں ہوسکتا تا آنکہ اللہ اس دین کو غالب کردے یا میں اس راہ میں کام آجاؤں''۔

غزوہ حنین کے موقع پر ایک دفعہ جب دس ہزار تیروں کی بارش ہو رہی تھی اور تھوڑی دیر کے لیے مسلمان پیچھے ہٹ گئے تھے، ایسے موقع پر آپ اپنی جگہ پر ثابت قدم تھے، اور ''میں پیغمبر ہوں، جھوٹ نہیں، میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں'' کا نعرہ آپؐ کی زبان اقدس سے بلند ہو رہا تھا۔

حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ میدان جنگ میں گھمسان کا رن پڑتا تو ہم لوگ آپ کی آڑ لیا کرتے تھے۔ (مسند احمد بن حنبل)

یہ اسی ایمان و یقین اور اللہ پر توکل و اعتماد کا نتیجہ تھا کہ عین اس حالت میں جبکہ دور دور تک دعوت کی کامیابی کے آثار نظر نہیں آتے تھے، آپ فرماتے ہیں اللہ تعالی اس دین کو غالب کر کے رہے گا اور ایک وقت وہ آئے گا کہ صفا سے حضر موت تک اکیلی ایک عورت سونا اچھالتی جائے گی اور اسے اللہ کے علاوہ کسی کا ڈر نہ ہوگا۔ سفر ہجرت کے موقع پر سراقہ بن جعشم کی درخواست پر امان نامہ لکھ کر دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تمہارا کیا حال ہوگا جب کسری کے کنگن تمہارے ہاتھ میں ہوں گے۔

اللہ کی ذات سے گہرا تعلق

دعوت کا کام اللہ کی ذات سے گہرے تعلق کے بغیر نہیں ہوسکتا، اہل ایمان کا وصف قرآن میں یوں بیان ہوا ہے: ''اہل ایمان اللہ تعالی سے سب بڑھ کر گہری محبت رکھتے ہیں'' (البقرہ:۱۶۵) اس محبت کے نتیجہ میں ان کا دوسرا وصف یہ بیان ہوا ہے: ''جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں اٹھتے بیٹھتے اور پہلوؤں کے بل'' (آل عمران:۱۹۱)۔ ایک اور جگہ ہے: ''ان کے پہلو خوابگاہوں سے دور رہتے ہیں اپنے رب کو خوف وطمع کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں بخشا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں'' (السجدہ: ۱۶)۔ ایک جگہ ہے: ''وہ راتوں کو بہت کم سوتے تھے اور رات کے پچھلے پہروں میں اپنے رب سے استغفار کرتے تھے''۔ (ذاریات:۱۷۔۱۸)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان اہل ایمان میں سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرنے والے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، اس کا ذکر کرنے والے، سب سے بڑھ کر راتوں میں اٹھ کر قیام لیل کرنے والے، اس سے دعا مانگنے والے، اس کی راہ میں صدقہ وخیرات دینے والے اور توبہ و استغفار کرنے والے تھے۔ خاص آپ کے بارے میں قرآن میں ہے: ''اے نبی بلاشبہ تمہارا رب جانتا ہے کہ تم کبھی دو تہائی رات

کے قریب اور کبھی آدھی رات اور کبھی ایک تہائی رات قیام لیل کرتے ہو اور تمہارے ساتھیوں میں سے ایک گروہ بھی ایسا ہی کرتا ہے۔ (المزمل: ۲۰)

دعوت کی راہ میں جب جب آزمائشیں بڑھی ہیں، زیادہ سے زیادہ اللہ سے تعلق اور لگاؤ پیدا کرنے کے لیے ابھارا گیا ہے، اللہ سے گہرے تعلق کے بغیر داعی دعوت کا کام نہیں کرسکتا، اللہ سے تعلق اور قرب کا سب سے بڑا ذریعہ نماز ہے، اس سے انسان کو غیر معمولی قوت حاصل ہوتی ہے، ہر چیز کو مادی نقطہ نظر سے دیکھنے والے اس بات کو نہیں سمجھ سکتے:

''سجدہ کرو اور اپنے رب کے قریب ہو جاؤ'' (العلق: ۱۹)

حدیث میں آتا ہے: ''بندہ سجدہ کی حالت میں اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے''۔

اس سے اللہ کی معیت اور نصرت حاصل ہوتی ہے، نماز تو اللہ کے ذکر ہی کا نام ہے، اس طرح روزہ، زکوۃ وانفاق، حج وقربانی، ہجرت وجہاد سب اللہ کے ذکر سے عبارت ہیں۔ ان ساری عبادتوں میں آپؐ سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ اس سب کے باوجود آپؐ کا حال یہ تھا کہ ہر وقت توبہ واستغفار کرتے رہتے۔ آپؐ کا ارشاد ہے: ''اے لوگو! اللہ سے توبہ کرو میں دن میں سو سو بار اللہ سے توبہ کیا کرتا ہوں''۔

اخلاق و کردار کی بلندی

آپؐ کے سلسلے میں قرآن کی شہادت ہے: ''بلاشبہ آپ اخلاق کے اونچے درجہ پر فائز ہیں، آپؐ نے اپنے بارے میں خود فرمایا ہے: ''میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں''۔ مکارم اخلاق بڑا وسیع لفظ ہے، صداقت وامانت، عفت وعصمت، ایفائے عہد، عفو و درگزر، صلہ رحمی، مہمان نوازی، زبان کی حفاظت، وقار وسنجیدگی، سلیقہ وصفائی، تواضع وخاکساری، شرم وحیا، اکل حلال، مخلوق پر رحم، غیرت حق، انسانوں کی خدمت، پڑوسیوں کی خبر گیری، یتیموں کی تکریم، غریبوں کی مدد، مریضوں کی عیادت، رزق حلال، جود وسخا، حسن معاملہ، نظم وضبط، غرض زندگی کے تمام شعبوں میں حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کی ادائیگی اور بندوں کا دل دکھانے سے احتراز، یہ سب چیزیں مکارم اخلاق میں داخل ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؓ فرشتۂ وحی کی پہلی آمد کے بعد آپؐ کو تسلی دیتے ہوئے فرماتی ہیں: ''آپ خوش ہو جایئے، قسم ہے اللہ کی! اللہ آپ کو ہرگز رسوا نہیں کرے گا، آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، سچی باتیں کرتے ہیں، دوسروں کے بوجھ خود اٹھا لیتے ہیں، بے روزگار آدمی کے لیے کام

فراہم کرتے ہیں، مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں، حق کی حمایت کرتے اور مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں''۔(تفسیر ابن کثیر۔۶۸۷)

ایک مرتبہ کفار قریش کے دوسردار اخنس بن شریق اور ابوجہل کی تنہائی میں ملاقات ہوئی، اخنس نے ابوجہل سے پوچھا: اے ابوالحکم محمدؐ کے بارے میں بتاؤ، تمہارا کیا خیال ہے، آیا وہ سچا ہے یا جھوٹا؟ یہاں میرے اور تمہارے علاوہ کوئی دوسرا نہیں جو ہماری باتیں سن رہا ہو(ابوالحکم ابوجہل کی کنیت تھی) ابوجہل جیسے کٹر دشمن رسولؐ کا جواب سننے کے قابل ہے اس نے کہا:''بھلے آدمی، بخدا محمد سچا ہے وہ کبھی جھوٹ نہیں بولا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بنوقصی نے ساری خوبیاں لے لیں، جھنڈا ان کے ہاتھ میں ہے، حاجیوں کو پانی پلانے کی ذمہ داری ان کے ذمہ ہے، کعبہ کی دربانی اور کنجی ان کے پاس ہے، ساتھ ہی نبوت بھی انھیں مل جائے تو قریش کے بقیہ قبائل کے لیے کیا رہ جائے گا''۔(تفسیر ابن کثیر، جلد۳، صفحہ۱۷۷)

قاضی ثناءاللہؒ پانی پتی کی تفسیر مظہری میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ابوجہل نے ایک بار خود حضورؐ سے کہا کہ محمد ہمیں تم پر جھوٹ کا کوئی گمان نہیں، نہ ہم تمہاری تکذیب کرتے ہیں، البتہ ہم اس کتاب یا دین کی تکذیب کرتے ہیں جو تم لے کر آئے ہو۔(بحوالہ معارف القرآن)

قیصر روم کے دربار میں نبی کریمؐ کا قاصد پہنچا ہوا ہے، اس موقع پر قیصر تحقیق حال کرنا چاہتا ہے اتفاق سے اسے ابوسفیان مل جاتا ہے، وہ ابوسفیان جو چھ برس تک مسلسل آپ کے خلاف فوجیں لے کر آتا رہا اور جو دل و جان سے آپ کو ختم کرنا اور مٹانا چاہتا تھا۔ قیصر کے سوال کے جواب میں کہ کیا کبھی تم لوگوں کو محمد کی نسبت جھوٹ کا بھی تجربہ ہے؟ ابوسفیان کہتا ہے: نہیں۔ ایک دوسرے سوال کے جواب میں کہ کیا کبھی وہ اپنے عہد و قرار سے بھی پھرا ہے؟ ابوسفیان نے کہا: ابھی تک تو نہیں، مگر آئندہ دیکھیں گے۔

کوہ صفا پر چڑھ کر نبیؐ نے لوگوں کو پکارا، لوگ جمع ہو گئے تو پوچھا: اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر جرار ہے تو کیا تم کو یقین آئے گا؟ سب نے یک زبان ہو کر کہا: کیوں نہیں، ہم نے تو تم کو کبھی جھوٹ بولتے دیکھا نہیں۔

نبی اکرمؐ سے کفار قریش کی دشمنی کا حال معلوم ہے لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ ان میں سے بہتوں نے اپنی امانتیں آپ کے سپرد کر رکھی تھیں، آپ نے شب ہجرت یہ ساری امانتیں حضرت علیؓ کے حوالہ کیں کہ وہ لوگوں کو ان کی امانتیں واپس کر کے مناسب وقت میں رخت سفر باندھ لیں۔

یہی قریش ہیں جنھوں نے بیت اللہ کی تعمیر کے موقع پر حجر اسود کو اس کی جگہ نصب کرنے کے معاملہ

کو لے کر اٹھ کھڑے ہونے والے نزاع میں آپ کو حکم مان کر اپنا جھگڑا ختم کیا تھا۔

داعی کا اعلیٰ کردار ایسا ہو کہ دوست تو دوست دشمن بھی اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائے، اسی وجہ سے نبیؐ کی زبان سے قرآن میں یہ کہلوایا گیا: ''(اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ یہ کلام خدا کا نہیں اور میں نے اللہ کی طرف غلط منسوب کیا ہے تو یہ سوچو کہ) میں تمہارے درمیان اس سے پہلے بھی ایک عمر رہا ہوں (اور کسی انسان کی جانب کبھی جھوٹ بات منسوب نہیں کی تو اب اللہ پر کیسے افترا کروں گا)''(یونس:۱۰) یعنی میری اب تک کی پوری زندگی میری اور میری دعوت کی صداقت کی گواہ ہے، تم نے مجھے امین وصادق کا لقب عطا کیا، تم نے مجھے اپنا حکم تسلیم کیا ہے، کیا میرے دعوے کی صداقت کے لیے یہ بات کافی نہیں؟

دعوت میں بے لوثی

داعی کا بے غرض اور بے لوث ہونا دعوت کے لیے بنیادی اہمیت کا حامل ہے، دعوت سے داعی کا کوئی مفاد وابستہ نہیں، دعوت کا محرک محض مدعو کی خیر خواہی اور اللہ کی رضا ہے۔ قرآن نبیؐ کی بے غرضی اور بے لوثی یوں بیان کرتا ہے:

''تم تو ان سے دعوت وتبلیغ کے اس کام پر کسی اجر کے طالب نہیں ہو، یہ تو بس دنیا کے لوگوں کے لیے ایک یاد دہانی ہے''(یوسف:۱۰۴)۔

دوسری جگہ فرمایا: ''کہہ دو اے لوگو! میں تم سے اس کام پر کسی اجر کا طالب نہیں، میں تو بس قرابت کے سلسلہ میں حق مؤدت ومحبت ادا کر رہا ہوں''(شوریٰ:۳۳)

آپ کی بے غرضی اور بے لوثی سورہ سبا آیت:۴ اور الانعام آیت:۹۰ میں بھی بیان کی گئی ہے مطلب یہ ہے کہ تم نے کوئی دوکان تو کھولی نہیں ہے ایک چیز مفت پائی ہے مفت بانٹ رہے ہو، یہ تمہیں اجر بھی کیا دے سکتے ہیں تمہارا اجر تو اللہ رب العالمین کے ذمہ ہے۔ تم ان کی ناقدری اور ظلم وتعدی کے باجود لوٹ لوٹ کر اور تڑپ تڑپ کر دعوت پہنچا رہے ہو، اس میں تمہارا اپنا کوئی مفاد نہیں ہے، یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ تم ان کے خیر خواہ ہو اور اللہ کی رضا چاہتے ہو۔ یہ تمہارے قرابت مند ہیں تم حق قرابت ادا کر رہے ہو، تم انھیں جہنم کی آگ سے بچانا چاہتے ہو، انھیں سوچنا چاہیے کہ تمہارا اچھا خاصا کاروبار تھا، تجارت چمک رہی تھی، لوگوں کے درمیان تمہیں عزت کا وہ مقام حاصل تھا جو کسی اور کو نہیں حاصل تھا، تم نے سب کچھ داؤ پر لگا دیا، تمہاری تجارت برباد ہوئی، تمہیں عزت واحترام کی جگہ گالیوں اور دشنام طرازیوں کا سامنا کرنا پڑا، اس بے غرضی اور بے لوثی کے بعد ان کا اس طرح بدکنا اور بھاگنا کس قدر

حیرت انگیز ہے۔

بندگان خدا سے خیر خواہی اور محبت

آپ کے بارے میں ارشاد ربانی ہے: ''ہم نے تمہیں سارے عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے''۔

اللہ کے بندوں سے محبت، ان کے لیے خیر خواہی آپ کا نمایاں وصف ہے۔ یہ آپ کی محبت اور تڑپ ہی تو تھی جو آپ کو پارے کی طرح متحرک رکھتی، کیسے اللہ کے بندے اللہ کے بندے بن جائیں، کس طرح وہ اللہ کے عذاب سے بچ جائیں، ہمیشہ اسی فکر میں رہتے، نہ صحت کا خیال، نہ کھانے پینے کی فکر، بخار میں تپ رہے ہیں، خبر ملتی ہے کہ کوئی قافلہ آیا ہوا ہے، اسی عالم میں چل دیتے ہیں، حق نصح ادا کرنے، دوپہر دیکھتے ہیں نہ رات، طائف کے لوگوں نے آپ کے ساتھ کیسا ظالمانہ برتاؤ کیا، پتھروں کی بارش سے ٹانگوں سے خون بہہ کر جوتے میں آ گیا، اس موقع پر پہاڑوں پر مامور فرشتے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر آپ کہیں تو طائف والوں کو دونوں پہاڑوں سے پیس کر رکھ دیں، لیکن آپ نے اس کو پسند نہیں کیا۔

جنگ احد میں دندانِ مبارک شہید ہیں، خود کی کڑیاں سر مبارک میں دھنسی ہوئی، چہرہ انور خون سے تر، قریش آپ کے قتل کے درپے، اس موقع پر بھی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلتے ہیں: مولی میری قوم کو ہدایت دے، یہ لوگ جانتے نہیں۔

۸ھ میں طائف کے محاصرہ میں بہت سے مسلمان شہید ہو جاتے ہیں، قلعہ فتح نہیں ہوتا، اہل طائف کے خلاف بددعا کرنے کی درخواست کی جاتی ہے لیکن آپ کا ہاتھ اٹھتا ہے تو اس طرح کے الفاظ زبان پر آتے ہیں: 'مولی! اہل طائف کو ہدایت دے اور ان کے دل میں اسلام اتار دے'۔

آپ لوگوں کی ہدایت کے حد درجہ حریص تھے، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے، اللہ کی سنت کے مطابق جو ہدایت کا مستحق ہوتا ہے ہدایت اسی کو ملتی ہے اور جس نے اپنے آپ کو ضلالت وگمراہی کا مستحق بنالیا، اسے ہدایت کیسے مل سکتی ہے؟

''ان (رؤساء) کی اکثریت ایمان نہیں لاسکتی خواہ تم ان کے ایمان کے کتنے بھی متمنی ہو''۔ (یوسف:۱۰۳) ''تم ہدایت نہیں دے سکتے جسے چاہو، بلکہ اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے وہ ہدایت کے مستحق لوگوں کو خوب جانتا ہے''۔(القصص:۵۶)

دعوت کے سلسلہ میں آپؐ کی حد سے بڑھی ہوئی بے تابی اور اس بنا پر اپنے آپ کو ہلکان کرنا اور گھلائے دینا اتنا بڑھا کہ اللہ تعالی کو بار بار یہ کہنا پڑا کہ ''یہ قرآن تم پر ہم نے اس لیے نہیں نازل کیا کہ تم تکلیف اٹھاؤ او مشقت میں پڑ جاؤ''، ''لگتا ہے کہ تم اپنے آپ کو ان کے پیچھے غم میں ہلاک کر ڈالو گے اگر یہ اس کلام پر ایمان نہیں لاتے''۔(کہف۔٦) ''لگتا ہے کہ تم اپنی جان ہلاک کر ڈالو گے اس وجہ سے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں (شعراء۔٣)۔''تو کیا وہ شخص ایمان لا سکتا ہے جس کی نگاہوں میں اس کا برا عمل دکھا دیا گیا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ وہ اس کو اچھا سمجھنے لگا ہے، اللہ ہی جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے تو تمہاری جان ان کے غم میں حسر وافسوس بن کر نکل نہ جائے، اللہ باخبر ہے ان کاموں سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں''۔(فاطر۔٨)

مولانا امین احسن اصلاحیؒ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں تو اس میں تمہاری کسی تقصیر کو دخل نہیں ہے، بلکہ یہ قانون الٰہی کی زد میں آئے ہوئے لوگ ہیں تو ان کے غم میں اپنے کو ہلکان نہ کرو، ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو یہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے، تو جب وہ باخبر ہے تو ان کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کے وہ مستحق ہوں گے۔۔۔''

''تمہاری جان ان کے غم میں حسرت وافسوس بن کر نکل نہ جائے، اللہ باخبر ہے ان کاموں سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں'' کی وضاحت یوں کرتے ہیں: ''مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے غم میں ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، انھوں نے خود عقلی وروحانی خودکشی کی ہے، اگر یہ ایمان نہیں لا رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تمہاری دعوت میں کوئی کسر ہے بلکہ ان کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے، تو ان کا غم کھانے کے بجائے ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو، وہ ان کی ساری کارستانیاں دیکھ رہا ہے ان کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کے یہ سزاوار ہوں گے۔(تدبر قرآن، ج٦ ص٣٥٨۔٣٥٩)

یہ آپؐ کی انسانوں سے محبت ہی تھی کہ فتح مکہ کے موقع پر آپ نے ظالموں، قاتلوں، اور جانی دشمنوں سب کو معاف کر دیا، آپ نے پوچھا تھا تمہارا کیا خیال ہے، میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟ لوگوں نے جواب دیا تھا: 'آپ شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کے لخت جگر ہیں'۔ آپ نے اس موقع پر حضرت یوسفؑ کی طرح فرمایا تھا: ''آج تم پر کوئی ملامت نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو''۔ قرآن آپؐ کے بارے میں کہتا ہے: ''یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تم ان کے لیے نرم ہو'' (آل عمران:١٥٩)

لفظ ''انذار'' اور لفظ ''نذیر'' سے بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوسکتی ہے، حالانکہ ان کا وہ مفہوم نہیں ہے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں ان الفاظ کے اندر بھی محبت اور ہمدردی کا وصف نمایاں ہے، اس کی تھوڑی وضاحت کی ضرورت ہے۔ آپ کی زبان سے قرآن میں بار بار یہ اعلان کرایا گیا ہے کہ ''اے لوگو! میں تو بس تمہارے لیے کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں، اللہ کی طرف دوڑ بھاگو، میں تمہارے لیے کھلا ڈرانے والا ہوں''۔

عربوں میں طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنی بستی کے قریب یا سفر میں کہیں پڑاؤ ڈالتے، کسی اونچے ٹیلے یا پہاڑی پر ایک دیدبان مقرر کردیتے جو پہرہ دیتا اور چاروں طرف نگاہ رکھتا، جونہی اسے کسی جانب سے دشمن کے خطرے یا حملے کا اندیشہ ہوتا، وہ دیدبان اپنے کپڑے اتار کر ننگی حالت میں زور زور سے 'وا صباحاہ' کا نعرہ لگاتا، جس کی آواز سنتے ہی لوگ جس حال میں ہوتے اور دفاع کا جو سامان ان کے پاس ہوتا، اسے لے کر اس کے پاس پہنچ جاتے اور اس دیدبان کے شکر گزار ہوتے کہ اس نے خطرہ سر آنے سے پہلے ہمیں اس سے آگاہ کردیا، ورنہ دشمن بے خبری اور غفلت کی حالت میں ہمیں تباہ و تاراج کردیتا۔ اس دیدبان کو ان کی اصطلاح میں 'نذیر عریاں' کہا جاتا، قرآن نے اس کی عریانیت ختم کرکے نبیؐ کے لیے اس لفظ کو 'نذیر مبین' بنا کر استعمال کیا، تاکہ اس میں تلمیح نذیر عریاں ہی کی رہے کہ یہ نبی اسی نذیر عریاں کی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر تمہارا ہمدرد و خیر خواہ ہے اور تمہیں آنے والے شدید خطرہ سے وقت سے پہلے آگاہ کررہا ہے، تمہیں اس کا احسان مند ہونا چاہیے، تمہیں اس خطرہ سے بچنے کے لیے پیشگی تیاری کرنا چاہیے، یہ تمہارا بدخواہ اور دشمن نہیں ہے جیسے کہ وہ نذیر عریاں تمہارا بدخواہ اور دشمن نہیں ہوتا، بلکہ تمہاری محبت ہی ہے جو اسے تمہارے انذار کے لیے مجبور کرتی ہے۔ نبیؐ کو جب حکم دیا گیا کہ ''اٹھو اور ڈراؤ'' تو آپ اسی قاعدہ کے مطابق کوہ صفا پر چڑھ گئے اور 'واصباحاہ' کا نعرہ بلند کیا، فوراً لوگ آپؐ کے اردگرد جمع ہوگئے اور آپؐ نے انھیں ان کی زندگی کے شدید ترین خطرات سے آگاہ کیا۔ یہ واضح رہے کہ انذار کا لفظ چور، ڈاکو، یا پولیس وغیرہ سے ڈرانے کے لیے نہیں آتا، بلکہ خیرخواہ، ہمدرد اور ناصح شفیق کی جانب سے کسی خطرہ سے اس آگاہی اور خبرداری کے لیے آتا ہے جس میں اس شخص کے ساتھ خیرخواہی اور محبت کا جذبہ پایا جاتا ہے، جس کو آگاہ کیا جارہا ہے اور ڈرایا جارہا ہے۔

انذار کے حکم کے جواب میں نبی اکرمؐ کے اس عمل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اپنی بات دوسروں تک پہنچانے یا اپنے ہدف کو حاصل کرنے کے لیے ہر جائز اور رائج طریقہ کو اختیار کیا جاسکتا ہے، اگر اس کے اندر خرابی کا کوئی پہلو ہے تو اس پہلو کو دور کرکے یا اس پہلو سے اپنے کو بچا کر اسے استعمال

کرنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ داعی کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس حیثیت کو مکے کی اپنی سب سے پہلی تقریر میں واضح فرمایا ہے کہ ''یقیناً قوم کا دیدبان قوم سے جھوٹ نہیں بولتا، بخدا اگر میں (بفرض محال) سارے لوگوں سے جھوٹ بولوں تو تم سے تو نہیں بول سکتا اور اگر سارے لوگوں کو دھوکہ دوں تو تمہیں تو نہیں دے سکتا۔ اس اللہ کی قسم جس کے علاوہ کوئی الہ نہیں، میں تمہاری جانب بطور خاص اور سارے انسانوں کی جانب بطور عام اللہ کا رسول ہوں۔ بخدا یقیناً تم مروگے، جیسے تم سوتے ہو اور یقیناً دوبارہ اٹھائے جاؤگے جیسے بیدار ہوتے ہو، پھر تمہیں اپنے عمل کا حساب دینا ہوگا اور احسان اور نیکی کا بدلہ احسان سے اور برائی کا بدلہ برائی سے پاکر رہوگے، اس کے بعد یا تو ہمیشہ کے لیے جنت میں ہوگے یا ہمیشہ کے لیے دوزخ کی آگ میں۔ (بحوالہ السیرہ الحلبیہ :۱۔۲۷۲)

دعوت کے سلسلہ میں کچھ خاص باتوں کا اہتمام :

(الف) مکی زندگی میں سب سے بڑھ کر اسلام کی بنیادوں توحید، رسالت اور آخرت پر زور دیا گیا ہے۔ یہ بنیادیں جب دلوں میں راسخ کردی گئیں، تب جاکر احکام آئے اس کے ساتھ ہی انہیں ان معروفات پر ابھارا گیا جو فطرت انسانی کے اندر پیوست ہیں لیکن زمانہ نے ان پر گردوغبار کی دبیز تہیں ڈال رکھی تھیں، اور ان منکرات کی شناعت واضح کی گئی جو فطرت انسانی سے میل نہیں کھاتیں لیکن فطرت کے بگاڑ کے سبب ان کی برائی نگاہوں میں کم ہوگئی تھی۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک، رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی، مسکینوں اور معذوروں کے ساتھ ہمدردی، یتیموں کے سر پر دستِ شفقت، ایفائے عہد اور ادائے حقوق وغیرہ کو فطرت کی پکار کہا گیا۔ اس کے مقابلے میں بخل، اسراف وتبذیر، قتل اولاد، ارتکابِ فواحش، زنا، شراب نوشی، ناحق انسانوں کی جان لینا، ناپ تول میں کمی کرنا، قذف، بہتان، تکبر، لوگوں کی عزت وناموس اور مال ودولت پر دست درازی وغیرہ کو ایسی برائیاں بتا گیا جن سے انسان کی فطرت گھن کھاتی ہے اور اس سے گھن کھانا بھی چاہیے۔

(ب) دعوت میں ان باتوں سے آغاز کی رہنمائی کی گئی جو داعی اور مدعو کے درمیان مشترک ہیں، فرمان الٰہی ہے:

''اے نبی کہہ دو کہ اے اہل کتاب آؤ ایک ایسے کلمہ کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے کہ ہم اللہ کے علاوہ کسی کی بندگی نہ کریں اور اس کا ذرا بھی شریک نہ ٹھہرائیں اور اللہ کو چھوڑ کر

ہم میں کا بعض بعض کو رب نہ بنائے''۔

(ج) دعوت کا طریقہ یہ بتایا گیا کہ جو بات سمجھنے پر آمادہ ہے اس کے مقام ومرتبہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس سے گفتگو کی جائے، رہے وہ لوگ جو مناظرہ کے لیے تیار اور لڑنے کے لیے آستین چڑھائے ہوئے ہیں، انھیں منہ نہ لگایا جائے اور دعوت احسن طریقہ سے دی جائے، احسن طریقہ یہ بتایا گیا:

''(ان اہل کتاب سے) بتادو کہ ہم (صرف اپنی کتاب پر ایمان نہیں رکھتے بلکہ) اپنی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو تمہاری جانب نازل کی گئی ہے، ہمارا تمہارا الہ ایک الہ ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں''۔(عنکبوت: ۴۶)''ہم رسولوں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے (تمام رسولوں پر ایمان لاتے ہیں)''۔(بقرہ۔۲۸۵)

بحث وگفتگو میں مخاطب کی نفسیات کو ملحوظ رکھنا اور اشتعال انگیزی سے بچنا بھی بہت ضروری ہے، اس کے لیے کبھی کبھی اپنی دعوت کی حقانیت پر یقین کامل رکھتے ہوئے بھی بطریقِ فرض اپنے مقام سے تنازل کر کے گفتگو کی ضرورت ہو تو کر سکتے ہیں۔ مثالوں سے بات واضح ہوگی:

''اور بلاشبہ ہم میں اور تم میں سے کوئی ایک ہی ہدایت پر ہے یا کھلی ہوئی گمراہی میں ہے، ان سے کہہ دو کہ ہمارے جرائم کی تم سے باز پرس نہیں ہوگی اور ہم سے تمہارے اعمال کی باز پرس نہیں ہوگی۔''(سبا: ۲۴۔۲۵)

ان آیات سے پہلے والی آیات میں دلائل سے اللہ کا خالق، مالک، رازق، اور قادر مطلق ہونا ثابت کیا گیا ہے، اس کے بعد یہ بات طے ہو چکی کہ کون ہدایت یاب ہے اور کون گمراہ، اب ان کو گمراہ اور کافر کہنے کے بجائے یہ مشفقانہ انداز اختیار کیا گیا کہ ان دلائل کی روشنی میں کوئی سمجھ دار آدمی نہیں کہہ سکتا کہ توحید اور شرک دونوں باتیں درست ہیں اور اہل توحید اور اہل شرک دونوں حق پر ہیں، بلکہ یقینی امر ہے کہ دونوں میں سے کوئی ایک ہی حق پر ہے، دوسرا گمراہی میں ہے، اب تم خود فیصلہ کرو کہ ہم حق پر ہیں یا تم، اس کے بعد مزید حد درجہ نرمی اور ملاطفت اختیار کرتے ہوئے یہ کہا گیا کہ اگر ہم خطاوار اور مجرم ہیں تو تم سے ہمارے جرائم کی باز پرس نہ ہوگی اور ہم سے تمہارے اعمال کی باز پرس نہ ہوگی، اس سے زیادہ مخاطب کی رعایت اور کیا ہو سکتی ہے کہ مخاطب کے اعمال کو جرائم سے تعبیر نہ کر کے (بفرض محال) اپنی جانب جرائم کی نسبت کی گئی۔

اسی سورہ میں آگے چل کر ایک آیت یہ آتی ہے:

''کہہ دو اگر میں گمراہی میں ہوں تو میری گمراہی کا وبال مجھ پر آئے گا، اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو یہ اس وحی کی بدولت ہے جو میرا رب میری طرف کر رہا ہے''۔ (سبا: ۵)

اس میں لفظ ''اگر'' پر نگاہ رہے۔ نبیؐ کے ضلالت پر ہونے کا سوال نہیں، آپ کا ہدایت پر ہونا طے ہے، اس آیت پر صاحب تدبر کا اشہب قلم یوں چلتا ہے: ''ان سے کہہ دو کہ اگر میں گمراہ ہوں جیسا کہ تم سمجھتے ہو تو اس گمراہی کا خمیازہ بہر حال مجھ ہی کو بھگتنا ہے، تم اس کے وبال سے محفوظ ہو، اس لیے کہ تم اس میں میرا ساتھ نہیں دے رہے ہو، لیکن اس مسئلہ کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے، اس پر اچھی طرح غور کر لو، وہ یہ کہ اگر میں ہدایت پر ہوں تو یہ ہدایت اس وحی کی بدولت مجھے حاصل ہوئی ہے، جو میرا پروردگار مجھ پر نازل فرما رہا ہے، اس صورت میں میری تکذیب تمہارے لیے کوئی سہل چیز نہیں ہے، بلکہ تم وحی الٰہی کو جھٹلانے والے ٹھہرتے ہو اور وحی الٰہی کی تکذیب کرنے والوں کا جو انجام ہونا چاہیے اور ہوگا، وہ کوئی معمولی بات نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ اس کے نتائج وعواقب کو بہت دور تک سوچ لو!'' (تدبر قرآن ج۶ص۱۴۳)

ذرا یہ آیت ملاحظہ فرمائیے: ''کہہ دو اگر رحمٰن کی اولاد ہو تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرنے والا ہوں گا''۔ خدائے رحمٰن کے اولاد ہونے کا سوال نہیں، لیکن یہ اسلوب اختیار کر کے بتایا گیا کہ ضد اور ہٹ دھرمی کی نہیں، تعصب اور تقلید اعمی کی نہیں، بات دلیل وبرہان کی ہے، اگر دلیل وبرہان سے یہ ثابت ہو جائے کہ رحمٰن کی اولاد ہے تو تم مجھے پیچھے نہیں پاؤ گے سب سے آگے بڑھ کر میں اس کی عبادت کرنے والا ہوں گا۔ میں ضدی، ہٹ دھرم اور متعصب آدمی نہیں ہوں۔ میں خدائے رحمان کی اولاد کی عبادت نہیں کرتا، اس لیے کہ اس کے اولاد ہونا ثابت ہی نہیں۔

اللہ تعالی کی ان ہدایات کے بموجب نبی کریمؐ اس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اور ان اوصاف سے متصف ہو کر جن کا گزشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا حکمت، موعظہ حسنہ اور جدالِ احسن کے ساتھ دعوت کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ اللہ تعالی ہمیں بھی آپ کے اسوہ حسنہ کی پیروی کی توفیق دے۔ آمین

نبی اکرم ﷺ کی دعوتی جدوجہد

سراج احمد برکت اللہ فلاحی،

مدیر معاون سہ ماہی پیغام، نیپال

اسلام اپنی فطرت میں ہی ایک تبلیغی دین ہے۔ چنانچہ آج بھی دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں دعوتی سرگرمیاں کسی نہ کسی سطح پر جاری ہیں ۔ ہر جگہ علمائے کرام اور داعیان دین دعوتی کاموں میں مصروف ہیں۔ بعض ممالک میں دینی جماعتوں، طلبہ تنظیموں اور اصلاحی انجمنوں کی نگرانی میں باقاعدہ منظم ڈھنگ سے دعوت دین کا کام ہورہا ہے۔ آج عالم اسلام میں اور بعض دیگر غیر مسلم ممالک میں بھی اسلامی بیداری کی جولہر دکھائی دے رہی ہے، مسلمان دینی تعلیم سے جڑ رہے ہیں، حج اور عمرہ کے لیے زائرین حرم کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے، جگہ جگہ اسلامی نظام کے قیام کے لیے مطالبہ ہوتا رہتا ہے، یہ سب ظاہر ہے اسی اصلاحی اور دعوتی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ الحمدللہ ملک نیپال میں بھی علمائے کرام اور داعیان دین متعدد پلیٹ فارم سے دعوت دین کا کام کررہے ہیں۔ البتہ ابھی تک یہاں وہ بیداری نہیں آئی ہے جو ایک غیر مسلم اکثریتی خطہ کے لیے ضروری ہے۔ ضرورت ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ جو رہتی دنیا تک تمام انسانوں کے لیے ایک مکمل نمونہ ہے، اس کو عام کیا جائے، آپ ﷺ کی دعوتی سرگرمیوں سے لوگوں کو متعارف کرایا جائے اور اس راستہ میں آپ ﷺ نے جو جانی و مالی اور وقت کی قربانیاں دی ہیں، ان سے عوام الناس کو واقف کرایا جائے۔ ذیل کی تحریر میں اسی ضرورت کو سامنے رکھ کر قارئین کی خدمت میں چند گزارشات پیش کی جارہی ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کی پوری زندگی دعوتی جدوجہد سے عبارت ہے۔ ۴۰ر سال کی عمر میں جب آپ ﷺ کو نبوت ملی اور "قم فأنذر" کے الفاظ میں دعوت دین کی ذمہ داری دی گئی تو آپ ﷺ بلاتاخیر دعوتی کام میں لگ گئے اور اپنے گھر سے دعوت کی ابتداء کی۔ آپ ﷺ کی اہلیہ حضرت خدیجہؓ، آزادہ کردہ غلام حضرت زید بن حارثؓ، آپ ﷺ کے چچازاد بھائی حضرت علیؓ اور آپ ﷺ کے جگری دوست حضرت ابوبکر صدیقؓ پہلے ہی روز آپ ﷺ کی دعوت پر ایمان لے آئے۔ (حقوق النبیؐ: محمد

اقبال کیلانی ص ۱۱/)

شروع کے تین سال تک آپ ﷺ نے دعوت کا کام خاموش انداز سے جاری رکھا، لوگوں سے انفرادی ملاقات کرتے، تنہائی میں گفتگو کرتے، رات میں ان سے ملتے اور دوپہر کے سناٹے میں دعوتی بات چیت کرتے، غرض ہر طرح سے اسلام کی دعوت پہنچاتے رہے۔ اس تین سال کے عرصہ میں صحابہؓ کی ایک جماعت تیار ہوگئی جن کی تعداد ۲۸/ تک پہنچتی ہے۔ (حقوق النبیؐ: محمد اقبال کیلانی ص ۱۲/)

شروع کے تین سال تک دعوت کا کام خاموشی کے ساتھ کیا جاتا رہا۔ مختلف واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش کو اس کی خبر ہوچکی تھی۔ لیکن انہوں نے اسے قابل توجہ نہیں سمجھا۔ البتہ بعض اہل قریش نے آپ ﷺ کی خبر کے پھیلاؤ اور اثر کے بڑھ جانے سے کچھ اندیشے ضرور محسوس کیے تھے۔ (الرحیق المختوم، صفی الرحمٰن مبارک پوری ص ۱۳۶)

تین سال کے بعد " وأنـذر عشيرتك الأقربين "یعنی" اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو عذاب سے ڈراؤ اور دین کی دعوت دو" کا حکم نازل ہوا تو آپ ﷺ نے اپنے خاندان والوں کو جمع کیا، کل ۴۵/ لوگ تھے۔ ان کے لیے کھانے کا انتظام کیا اور ان کے سامنے دین کی دعوت پیش کی۔ پہلی مجلس میں ابو لہب دخل انداز ہوگیا اور آپ ﷺ اپنی بات مکمل طور پر نہ رکھ سکے۔ آپ ﷺ نے دوبارہ اسی طرح کی مجلس کا اہتمام کیا، ان کے سامنے ایک خطبہ دیا اور بہت واضح لفظوں میں ایک ایک کو مخاطب کر کے عذاب آخرت سے ڈرایا اور دین اسلام قبول کر لینے کی دعوت دی۔ (الرحیق المختوم ص ۱۳۸)

اس مجلس سے متأثر ہوکر ابوطالب نے حمایت کا وعدہ کیا۔ جب ابوطالب کی حمایت مل گئی تو آپ ﷺ ایک دن کوہ صفا پر چڑھے اور قریش کے قبائل کو آواز دینا شروع کی۔ ہر قبیلہ کا نام لے کر ان کو بلایا یہاں تک کہ سب جمع ہو گئے تو آپ ﷺ نے ان کے سامنے اپنی نبوت کا اعلان کیا اور ان کو عذاب آخرت سے ڈرایا۔

موسم حج میں آپ ﷺ کی دعوتی جدو جہد بہت بڑھ جاتی تھی۔ دن رات ایک کر کے آپ ﷺ دعوت وتبلیغ میں لگ جاتے، دن ہو یا رات جب بھی موقع ملتا مکہ، منی، مزدلفہ، عرفات جہاں بھی حجاج قیام پذیر ہوتے آپ ﷺ وہاں جاتے۔ بالخصوص ان کے شرفاء وسرداروں سے ملتے اور اسلام کا تعارف کراتے۔ آپ ﷺ اپنا سارا آرام قربان کر کے دعوت کا یہ کام کرتے تھے۔ ایک بار آپ ﷺ کو سخت بخار تھا، پورا جسم مبارک تپ رہا تھا، کسی نے خبر دی کہ ایک وفد آیا ہے اور آپ ﷺ سے ملنا چاہتا

ہے۔گھر والوں نے روکا، آپ ﷺ کو سخت بخار ہے، مت جایئے لیکن آپ ﷺ نے کہا: اگر یہ قافلہ لوٹ گیا اور میری ملاقات نہ ہوسکی تو ان تک اسلام کی دعوت کون پہنچائے گا اور کل میں اللہ کے حضور کیا جواب دوں گا۔'' غرض آپ ﷺ بیماری کے باجود گئے اور ان کو اسلام کی دعوت دی۔

آپ ﷺ نے صحابہؓ کی تعلیم اور دعوتی تربیت کے لیے مکہ میں دار ارقم کو اپنا دعوتی مرکز بنایا تھا۔ جہاں آپ ﷺ روزانہ صحابہؓ کو دین کی تعلیم دیتے اور ان کی تربیت کرتے اور اسلام کی دعوت کیسے عام ہو اس کے لیے رائے ومشورہ اور منصوبہ بندی بھی فرماتے تھے۔آپ ﷺ کو سخت اذیتیں دی جاتی تھیں۔ابولہب، حکم بن ابی العاص، عقبہ ابی معیط، ابی بن حمراءثقفی اور ابن الأ صداء ہذلی آپ ﷺ کے پڑوسی تھے۔لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ کو بہت تنگ کرتے تھے۔راستہ میں کانٹے بچھانا، گندگیاں ڈالنا، آپ ﷺ کے گھر میں غلاظت پھینکنا، آپ ﷺ کے ہانڈی برتن میں بکری کی بچہ دانی اور دیگر گندی چیزیں ڈال دینا اور آپ ﷺ کو جسمانی تکلیفیں پہنچانا، ان کا معمول تھا۔

ابوجہل اور عقبہ بن ابی معیط نے تو آپ ﷺ پر قاتلانہ حملہ کردیا اور جان سے مارڈالنے کی پوری کوشش کی۔ابی بن خلف بار بار آپ ﷺ کو قتل کرنے کی دھمکی دیا کرتا تھا۔مشہور واقعہ ہے حضرت عمر بن الخطابؓ بھی آپ ﷺ کو جان سے مارڈالنے کے لیے ہی شمشیر بکف گھر سے نکلے تھے۔ہمارے لیے عبرت یہ ہے کہ ان سخت حالات کے باوجود بھی آپ ﷺ نے اپنی دعوتی جدوجہد جاری رکھی، پیچھے نہ ہٹے، نہ کوئی حیلہ بہانہ کیا اور لوگ اسلام قبول کرتے رہے۔

نبی اکرم ﷺ کا معمول تھا کہ آپ ﷺ روزانہ خانہ کعبہ تشریف لے جاتے، وہاں نماز ادا کرتے، طواف کرتے اور بلند آواز سے قرآن مجید کی تلاوت کرتے تا کہ دوسرے لوگ بھی اسے سنیں اور ان کو اسلام کا علم ہوسکے۔حرم میں بھی موسم حج کے علاوہ دیگر ایام میں عمرہ کے لیے جو حضرات آتے تھے یا جو بھی نئے اور اجنبی افراد حرم میں نظر آتے تھے، ان سے نبی ﷺ ملتے اور انہیں اسلام کی دعوت دیتے تھے۔سوید بن صامتؓ، ایاس بن معاذؓ، ابوذر غفاریؓ، طفیل بن عمرو دوسیؓ، ضماداز دیؓ، وغیرہ ایسے ہی حضرات ہیں جن کے سامنے آپ ﷺ نے دعوت پیش کی۔انہوں نے یہ دعوت قبول کی اور واپس اپنی قوم میں جا کر دعوت کے کام میں لگ گئے۔

مکہ میں آپ ﷺ گھر گھر جاتے، مردوں اور عورتوں کو اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ایک گھر کے لوگ بات نہیں سنتے تو دوسرے گھر جاتے، ایک قبیلہ آپ ﷺ کی دعوت قبول نہیں کرتا تو دوسرے قبیلہ والوں کے

سامنے دعوت پیش کرتے، دن میں دعوت کا کام نہیں کرنے دیا جاتا تو راتوں کو گھر سے نکلتے، جہاں کوئی روشنی نظر آتی یا آواز سنائی دیتی، وہاں جاتے اور لوگوں کو دین کی باتیں سناتے۔ مکہ میں پریشان کیا گیا اور سماجی بائیکاٹ کر دیا گیا تو شعب ابی طالب میں تین سال محصور رہے، مکہ والے ایمان نہیں لائے تو طائف تشریف لے گئے، جب اہل ایمان کو بہت ستایا جانے لگا تو ان کو حبشہ ہجرت کر جانے کا حکم دیا۔

نبی اکرم ﷺ کو دعوت کے کاموں سے روکنے کی بارہا کوششیں کی گئیں۔ سرداران قریش وفد کی شکل میں آپ ﷺ کے پاس آئے، ابوطالب سے ملے، مفاہمت کی بار بار کوشش کی، لالچ دیا، ڈرایا بھی لیکن آپ ﷺ نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ ''اگر میرے ایک ہاتھ میں سورج رکھ دو اور دوسرے ہاتھ میں چاند رکھ دو تب بھی میں اس دعوت کے کام سے باز نہیں آ سکتا''۔ ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد جب مکہ والوں کی عداوت حد سے زیادہ بڑھ گئی اور وہ علانیہ ظلم اور قتل پر اتر آئے تو مدینہ کی طرف ہجرت کا عام حکم دے دیا اور دھیرے دھیرے سارے اہل ایمان کو مدینہ بھیج دیا۔ لیکن آپ ﷺ دعوت کے کام سے کسی صورت باز نہ آئے، بلکہ پے در پے اور مسلسل دعوتی کام کرتے رہے۔ آپ ﷺ نے یہ کام اس لگن اور محنت کے ساتھ کیا کہ آپ ﷺ مکہ میں قیام پذیر تھے لیکن آپ ﷺ کی دعوت کا چرچا مکہ سے باہر طائف، مدینہ اور یمن تک تھا اور تقریباً عرب کے تمام قبائل تک آپ ﷺ کی دعوت کی سن گن ہو چکی تھی۔ ہر جگہ کے لوگ اس تلاش میں تھے کہ آخر حقیقت کیا ہے اور محمد ﷺ کس دین کی دعوت دے رہے ہیں۔

آپ ﷺ ہمیشہ اور ہر وقت اسی سوچ و فکر میں رہتے کہ دعوت کا کام کیسے ہو اور لوگ کیسے اسلام قبول کریں؟ اس کے لیے آپ ﷺ نئی نئی تدبیریں اپناتے رہتے تھے۔ سیرت کی کتابوں میں منقول ہے کہ آپ ﷺ برابر لوگوں کے لیے دعائیں بھی کرتے تھے کہ اللہ ان کو ہدایت دے۔ طائف کے سفر میں جہاں آپ ﷺ صرف اور صرف دعوت دین کے لیے گئے تھے، وہاں لوگوں نے نہ صرف یہ کہ آپ ﷺ کی دعوت کو ٹھکرا دیا بلکہ آپ ﷺ کے پیچھے اوباشوں کو لگا دیا۔ ان ظالموں نے پتھر سے مار مار کر آپ ﷺ کو لہولہان کر دیا، آپ ﷺ زخمی ہو گئے پھر بھی آپ ﷺ نے ان کے لیے دعا کی۔ اے اللہ! یہ نادان اور جاہل ہیں، تو ان کو ہدایت کی توفیق دے۔ دعوت کے لیے آپ ﷺ نے سخت تکلیف دہ سفر کیا، پتھر کی چوٹ کھائی، پھر بھی دعا دی، اے اللہ! ان کو ہدایت دے۔ آپ ﷺ نے اپنی اس دعوتی جماعت کو مضبوط کرنے کے لیے قریش کے سرداروں کے حق میں یہ دعا کی۔ اے اللہ! تو فلاں فلاں کو قبول اسلام کی توفیق دے۔ ابوجہل اور عمر بن خطاب کے لیے آپ ﷺ نے خاص دعا کی تھی۔ (الرحیق المختوم، صفی

الرحمٰن مبارک پوری،ص ۱۷۷)

موسم حج میں پہلی بار مدینہ کے جن چھ افراد سے آپ ﷺ کی ملاقات ہوئی۔اس کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کس قدر حکمت سے کام کرتے تھے۔رات کا سناٹا،عقبہ کی گھاٹی،منیٰ کا راستہ، ساتھ میں حضرت ابوبکرؓ وحضرت علیؓ چلے جارہے ہیں۔کہیں سے کوئی آواز سنائی دیتی تو وہاں جاتے۔ حضرت ابوبکرؓ جو ماہر انساب تھے۔قبائل کی تاریخ اوران کے نسب کی تفصیلی معلومات رکھتے تھے۔پہلے وہ اپنے ساتھیوں کا تعارف کراتے پھر آپ ﷺ انہیں اسلام کی دعوت دیتے۔مدینہ والوں نے پہلے ہی سے یہودیوں سے سن رکھا تھا کہ ایک نبی آنے والا ہے جس کی مدد سے ہم تم فتح پر حاصل کریں گے اور تمہیں عاد ارم کی طرح قتل کرڈالیں گے،رسول اللہ ﷺ نے ان کے پاس پہنچ کر دریافت کیا کہ آپ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا: ہم قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے ہیں۔آپ ﷺ نے فرمایا: یعنی یہود کے حلیف،بولے! ہاں، فرمایا: پھر کیوں نہ آپ حضرات سے کچھ بات چیت کی جائے،وہ لوگ بیٹھ گئے آپ ﷺ نے ان کے سامنے اسلام کی حقیقت بیان فرمائی،انہیں اللہ عزوجل کی طرف دعوت دی اور قرآن کی تلاوت فرمائی۔ انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا! بھئی دیکھو یہ تو وہی نبی معلوم ہوتے ہیں جن کا حوالہ دے کر یہود تمہیں دھمکیاں دیا کرتے تھے۔لہٰذا یہود تم پر سبقت نہ لے جانے پائیں۔اس کے بعد فوراً انہوں نے آپ ﷺ کی دعوت قبول کرلی اور مسلمان ہوگئے۔(الرحیق المختوم ص ۲۳۵)

موسم حج میں مکہ کے آس پاس جو بازار لگتے تھے وہاں بھی آپ ﷺ پابندی سے جاتے اور اسلام کی حقیقت لوگوں کے سامنے بیان فرماتے تھے۔عرب میں عکاظ،عیینہ اور ذی المجاز کے میلے بہت مشہور تھے۔دور دور سے لوگ وہاں آیا کرتے تھے۔نبی ﷺ ان مقامات پر جاتے اور میلے میں آئے ہوئے لوگوں کو اسلام اور توحید کی دعوت دیا کرتے تھے۔(رحمۃ للعالمین،قاضی محمد سلیمان منصور پوری ج ا ص ۴۹)

جب آپ ﷺ کی دعوت مکہ سے باہر پھیل گئی اور خاص کر مدینہ میں مسلمان جمع ہونے لگے تو قریش اپنے انجام سے گھبرانے لگے اور نبی ﷺ کو قتل کرنے کا ناپاک منصوبہ بنایا۔اللہ کی توفیق سے آپ ﷺ بچ کر مدینہ پہنچے،راستہ میں پیچھا بھی کیا گیا اور بعد میں مدینہ پر حملہ بھی کیا گیا تا کہ یہ دعوت ختم ہو جائے،لیکن نبی ﷺ خوف کھا کر گوشۂ عافیت میں نہیں بیٹھ گئے بلکہ اس دعوت کو بچانے کے لئے صحابہؓ کے ساتھ جہاد کیا،کفار کا زور توڑا،دعوت کے راستوں کی رکاوٹیں دور کیں،مدینہ کے باہر اسلام کی دعوت

پہنچائی اور جب جب دشمن نے اس دعوت کونقصان پہنچانے کے لیے مدینہ پر حملہ کیا تو خبر ملتے ہی مدینہ سے باہر نکل کرآپ ﷺ نے ان کو روکا، جان و مال کی بازی لگا دی اور ہرصورت میں دعوت دین کا کام جاری رکھا۔

صلح حدیبیہ کے بعد جب کچھ دنوں کے لیے جنگ کی حالت نہ رہی تو آپ ﷺ نے نجاشی شاہ حبش، مقوقس اور دیگر شاہان عرب کے پاس اپنا قاصد بھیجا اور مختصر مکتوب کے ذریعہ ان کو اسلام کی دعوت کی ۔ ظاہر ہے آپ ﷺ کا دعوتی جذبہ ہی تھا کہ جیسے ہی اندرون ملک سے فرصت ملی ، باہر کے بادشاہوں کو دین کی دعوت دی ۔ جنگ بندی کے ان ایام میں جو وفود مدینہ آتے تھے، ان کی تفصیلات پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ ان کے ٹھہرنے کا انتظام، ان سے ملاقات، ان کے سامنے اسلام کی حقیقت کا بیان اور اسلام کی دعوت کا ایک سلسلہ تھا، بکثرت وفود آتے تھے اور آپ ﷺ ان کو اسلام کی دعوت دیتے تھے ،ان کو مسجد نبوی لاتے اور ان کی تعلیم وتربیت کا انتظام فرماتے اور ان کو ہدایت دیتے کہ واپس جا کر اپنے اپنے قبائل کو اسلام کی دعوت دو۔ اس سے بھی آپ ﷺ کی دعوتی جد و جہد کا علم ہوتا ہے۔

آپ ﷺ پوری زندگی دعوتی جد و جہد میں لگے رہے، آخری ایام میں حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے صحابہ کے ایک عظیم مجمع میں فرمایا: اے میرے صحابہؓ! تم سے میرے متعلق پوچھا جانے والا ہے، تو تم لوگ کیا کہو گے؟ صحابہؓ نے کہا کہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ ﷺ نے تبلیغ کر دی، پیغام پہنچا دیا اور خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ (الرحیق المختوم، صفی الرحمٰن مبارک پوری ص ۷۳۴)

نبی اکرم ﷺ نے گیارہ شادیاں کیں۔ ان کی تفصیلات اور حقیقت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوتی ضرورت اور دعوت وتبلیغ کے کاموں میں وسعت اور آسانی کو پیش نظر رکھ کر آپ ﷺ نے یہ شادیاں کی تھیں۔ مختلف قبائل کے سرداروں کے یہاں رشتہ قائم کر کے، ان سے اپنا تعلق مضبوط کیا۔ اس سے دعوت کے کاموں میں زبردست مدد ملی ۔ رسول اکرم ﷺ کے ہر کام میں دعوتی ضرورت اور حکمت پیش نظر ہوتی تھی اور ہر وقت آپ ﷺ پر دعوت وتبلیغ کی ہی دھن سوار رہتی تھی۔ اس تعلق سے آپ ﷺ اس قدر فکرمند رہا کرتے تھے کہ آپ ﷺ کی صحت خراب ہو جایا کرتی تھی۔ قرآن مجید میں اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے: فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَى آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَذَا الْحَدِيثِ أَسَفاً۔ (سورہ کہف: ۶)

سید قطب شہیدؒ نے نبی اکرم ﷺ کی دعوتی جد و جہد پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "یا أیھا

المدثر قم فأنذر" (سورہ مدثر:۱-۲)''اے چادر پوش! اٹھ اور ڈرا'' گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ جسے اپنے لیے جینا ہے وہ تو راحت کی زندگی گزار سکتا ہے لیکن آپ ﷺ جو اس زبردست بوجھ کو اٹھا رہے ہیں، آپ ﷺ کا نیند سے کیا تعلق؟ آپ ﷺ کو راحت سے کیا سروکار؟ آپ ﷺ کو گرم بستر سے کیا مطلب؟ پرسکون زندگی سے کیا نسبت؟ راحت بخش ساز وسامان سے کیا واسطہ؟ آپ ﷺ اٹھ جایئے، اس کار عظیم کے لیے جو آپ ﷺ کا منتظر ہے، اس بارگراں کے لیے جو آپ ﷺ کی خاطر تیار ہے، اٹھ جایئے جہد و مشقت کے لیے، تکان اور محنت کے لیے، اٹھ جایئے کہ اب نینداور راحت کا وقت گزر چکا، اب آج سے پیہم بیداری ہے اور طویل و پرمشقت جہاد ہے، اٹھ جایئے اور اس کام کے لیے مستعد اور تیار ہو جایئے۔ .... پھر...... رسول اللہ ﷺ اٹھ گئے اور بیس سال سے زیادہ عرصے تک مسلسل حرکت میں رہے۔ راحت وسکون تج دیا، زندگی اپنے لیے اور اپنے اہل وعیال کے لیے نہ رہی۔ آپ ﷺ اٹھے تو اٹھے ہی رہے، کام اللہ کی طرف دعوت دینا تھا۔ آپ ﷺ نے یہ کمرتوڑ بارگراں اپنے شانے پر کسی دباؤ کے بغیر اٹھا لیا۔ یہ بوجھ تھا اس روئے زمین پر امانت کبریٰ کا بوجھ۔ ساری انسانیت کا بوجھ، سارے عقیدے کا بوجھ، اور مختلف میدانوں میں جہاد و دفاع کا بوجھ۔ آپ ﷺ نے بیس سال سے زیادہ عرصے تک پیہم اور ہمہ گیر معرکہ آرائی میں زندگی بسر کی، اور اس پورے عرصے میں یعنی جب سے آپ ﷺ نے وہ آسمانی ندائے جلیل سنی اور یہ گراں بار ذمہ داری پائی، آپ ﷺ کو کوئی ایک حالت کسی دوسری حالت سے غافل نہ کر سکی۔ (الرحیق المختوم، مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری ص ۱۲۸-۱۲۹ بحوالہ فی ظلال القرآن تفسیر سورہ مدثر)

نبی اکرم ﷺ اور صحابہؓ کی زندگی بہت متحرک زندگی تھی۔ صحابہؓ جہاں بھی جاتے دعوت دین کے کام میں لگے رہتے۔ غزوات وسرایا کے لیے صحابہؓ مدینہ سے باہر نکلتے رہتے تھے۔ ظاہر ہے اس کا مقصد دعوت ہی تھا۔ جب لوگ دعوت قبول نہیں کرتے اور جزیہ دینے سے بھی انکار کر دیتے، تب جہاد اور قتال کی نوبت آتی تھی۔ صحابہ کرامؓ کو اموال زکوٰۃ کی وصولی کے لیے بھی ہر سال مختلف علاقوں میں بھیجا جاتا تھا، وہ وصولی کے ساتھ ساتھ دعوت کا کام کیا کرتے تھے۔ حادثہ رجیع اور بئر معونہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو وفود مدینہ آتے تھے واپسی میں ان کے ساتھ آپ ﷺ کوئی معلم اور داعی روانہ کرتے تھے۔ بلکہ مطالبہ ہوتا تو کئی کئی صحابہ کو دعوت دین کے لیے روانہ کرتے تھے۔''بعض لوگ خاص اشاعت اسلام کی غرض سے بھیجے جاتے تھے۔ اس قسم کے دعاۃ کے نام حسب ذیل ہیں:

حضرت علیؓ بن ابی طالب قبیلۂ ہمدان، جذیمہ ومدحج کے لیے، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ علاقہ نجران کے لیے، حضرت وبر بن نخیسؓ ابنائے فارس کے لیے، حضرت محیصہ بن مسعودؓ علاقہ فدک کے لیے، حضرت احنفؓ قبیلۂ سلیمہ کے لیے، حضرت خالد بن ولیدؓ اطراف مکہ کے لیے، حضرت عمرو بن عاصؓ عمان کے لیے اور حضرت مہاجر بن ابی امیہؓ یمن کے لیے۔'' (سیرۃ النبی، حصہ دوم ص ۲۴۔۲۵)

نبی اکرم ﷺ کی دعوتی جدوجہد کا خلاصہ کرتے ہوئے محمد اقبال کیلانی رقمطراز ہیں: ''بعثت مبارک کے بعد رسول اکرم ﷺ نے اپنی ساری زندگی دعوت اسلام اور غلبۂ اسلام کے لیے اس طرح کھپا دی کہ واقعی منصب رسالت کا حق ادا کر دیا۔ آپ ﷺ نے کسی کے مذاق اور استہزاء کی پروا کی، نہ کسی چھوٹے یا بڑے کی مخالفت کو خاطر میں لائے، کسی اپنے یا پرائے کی دھمکی اور دباؤ کے سامنے نہ جھکے، نہ کسی کے ظلم اور جبر سے خوف زدہ ہوئے، قتل کی دھمکیوں سے مرعوب ہوئے اور نہ قتل کی پے در پے سازشوں اور وارداتوں سے ڈگمگائے، کسی قسم کا طمع یا لالچ آپ ﷺ کو راستے سے ہٹا سکا اور نہ ہی کسی کی تکذیب اور تکفیر آپ ﷺ کی منزل کھوٹی کر سکی۔ جب تک خفیہ دعوت کی اجازت تھی خفیہ دعوت دی، جب کنبہ اور قبیلہ کو دعوت دینے کا حکم ملا تو کنبہ اور قبیلہ کو دعوت دینی شروع کر دی، جب علی الاعلان دعوت کا حکم ملا تو فوراً علی الاعلان دعوت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، ایک ایک دروازے پر دستک دی، ایک ایک فرد کو سمجھایا، سرداروں کو بھی عامیوں کو بھی، اپنوں کو بھی غیروں کو بھی، امیروں کو بھی غریبوں کو بھی، مردوں کو بھی عورتوں کو بھی، بچوں کو بھی بوڑھوں کو بھی۔ دن کے وقت بھی سمجھایا راتوں کو بھی سمجھایا، ہانکے پکارے بھی سمجھایا اور چپکے چپکے بھی سمجھایا، کبھی حرم کے اندر کبھی حرم کے باہر، کبھی گلیوں میں کبھی گھروں میں، کبھی عکاظ کے میلوں میں کبھی ذوالمجاز کے بازاروں میں، کبھی منیٰ کی گھاٹیوں میں کبھی مزدلفہ اور عرفات کے میدانوں میں، کبھی شعب ابی طالب کے مصائب وآلام کے دوران کبھی طائف میں برستے پتھروں کی بارش میں، دن یہاں اور رات وہاں، نہ اِدھر قرار نہ اُدھر چین۔

مکی زندگی کے بعد مدنی زندگی کا آغاز ہوا تو ایک نئے انداز سے کشمکش شروع ہو گئی۔ مکہ میں صرف ایک دشمن سے واسطہ تھا، مدینہ منورہ میں چومکھی لڑائی لڑنی پڑی۔ آج میدان بدر میں ہیں تو کل غزوۂ بنوقینقاع درپیش ہے، ابھی غزوۂ احد کے صدمے سے سنبھل نہیں پائے کہ رجیع اور بئر معونہ کے جگر پاش اور المناک حادثوں نے آلیا، کبھی غزوۂ بنونظیر ہے تو کبھی غزوۂ دومۃ الجندل ہے، اِدھر غزوۂ احزاب سے فارغ ہوئے اُدھر غزوۂ بنوقریظہ کا حکم آ گیا، غزوۂ بنومصطلق سے ابھی مدینہ منورہ واپسی بھی نہیں ہوئی تھی کہ واقعۂ افک کے

زہرناک فتنہ نے آلیا۔

غزوۂ حدیبیہ سے فرصت ملی تو غزوۂ خیبر کی تیاری شروع ہوگئی، غزوۂ ذات الرقاع سے واپسی ہوئی تو معرکۂ موتہ درپیش تھا، غزوۂ مکہ سے فارغ ہوئے تو ساتھ ہی غزوۂ حنین اور غزوۂ طائف کے لیے روانہ ہونا پڑا، ملک کے اندر غزوات وسرایا سے قدرے سکون ملا تو غیر ملکی مہمات کا سلسلہ تیار تھا۔ انتہائی کٹھن اور مشکل حالات میں پہلے غزوۂ تبوک کا معرکہ سر کیا، پھر عین مرض الموت میں سریہ اسامہ بن زیدؓ روانہ فرمایا۔ ساری زندگی اسی کشمکش اور جدوجہد میں گزر گئی۔ ''یا أیھا المزمل'' کے دن سے لے کر'' بل الرفیق الاعلیٰ'' کے لمحہ تک نہ تو کوئی چین کا دن نصیب ہوا نہ آرام کی رات میسر آئی۔ رسول اکرم ﷺ کی یہ ساری جاں گسل کشمکش اور دن رات کی مسلسل جدوجہد کسی خطۂ زمین پر قبضہ کرنے کے لیے تھی نہ مال ودولت سمیٹنے کے لیے، جاہ وحشمت کا حصول مطلوب تھا نہ ہی اپنی بادشاہت کا سکہ جمانا مقصود تھا، صرف ایک ہی بات پیش نظر تھی کہ منصب رسالت کا حق ادا ہو جائے۔ (حقوق النبی ﷺ، محمد اقبال کیلانی، ص ۳۷۔۳۸)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فریضۂ نبوت اور دعوت دین کی ادائیگی میں اپنی پوری زندگی کھپادی اور مسلسل اسی جدوجہد میں لگے رہے۔ ضرورت ہے کہ آج بھی امت محمد یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ادائیگی کے لیے اٹھ کھڑی ہو اور اپنے محبوب رسول ﷺ کے نقش قدم کی پیروی میں واقعی رسول ﷺ کی سی جدوجہد کرے اور ہر ممکن طریقہ سے دعوت کے کاموں کو وسیع سے وسیع کرے تاکہ اب تکمیل نبوت کے بعد دعوت دین کی وہ ذمہ داری جو امت محمدیہ کے کاندھوں پر ڈالی گئی ہے اس کا حق ادا کیا جا سکے۔

●◻●

مکی دورِ دعوت: مشکلات ومسائل

ذوالفقار علی فلاحی، نیپال

پہلی وحی اقْـرَأْ بِـاسْـمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (پڑھو اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا) کے نزول کے ساتھ ہی تحریک اسلامی کے سفر کا آغاز ہو گیا۔ چنانچہ داعئ اسلام کو اس کے لیے تیاری کا حکم دیا گیا کہ: یَـا أَیُّهَـا الْـمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِیَابَكَ فَطَهِّرْ۔ (اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے اٹھ اور لوگوں کو ڈرا اور اپنے رب کے لیے صبر کر اور اپنے کپڑے صاف رکھ) لہٰذا داعئ اسلام اس کام پر مامور ہو گئے اور اس وقت تک دم نہیں لیا جب تک کام کی تکمیل نہیں ہو گئی جس کی کل مدت مکی دور تیرہ سال اور مدنی دور دس سال ملا کر تیئیس سال بنتی ہے۔

مذکورہ آیات میں جہاں ایک طرف آپ ﷺ کو دعوت کا حکم دیا گیا وہیں موضوعات دعوت بھی بیان کر دیے گئے جو درج ذیل ہیں:

الف۔ توحید

ب۔ یوم آخرت پر ایمان

ج۔ تزکیۂ نفس کا اہتمام

د۔ اپنے تمام معاملات اللہ کے سپرد کر دینا اور اللہ کی پسند و ناپسند کے معیار کو اپنا معیار پسند ناپسند بنا لینا

ہ۔ مذکورہ تمام امور نبی ﷺ کی رسالت پر ایمان لا کر آپ ﷺ کی قیادت وامامت میں انجام دینا

مکی دور میں آپ ﷺ کی دعوت کے کل تین مراحل تھے:

پہلا مرحلہ خاموش دعوت کا تین سال تک، دوسرا مرحلہ علانیہ دعوت کا سات سال تک، اور تیسرا مرحلہ مکہ سے باہر تین سال تک کا ہے۔ اس طرح کل مکی دور میں دعوت تیرہ سال رہی۔

پہلا مرحلہ: خاموش دعوت: طریقے اور حکمتیں

اس مرحلہ میں آپ ﷺ نے اپنی دعوت کو اپنے احباب اور دوستوں تک محدود رکھا جس کی حکمت یہ تھی کہ وہ لوگ جو آپؐ سے انتہائی قریب تھے اور آپ ﷺ کی شبانہ روز کی سرگرمیوں سے آگاہ تھے، آپ

کے مزاج اور نفسیات سے واقف تھے، آپ کی دعوت پر پہلے مرحلہ ہی میں یقین کر لیتے اور ہوا بھی ایسا ہی کہ جن جن افراد کو آپ نے دعوت دی وہ سب کے سب دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

اس طریقۂ کار میں ایک دوسری حکمت یہ بھی تھی کہ ان افراد کی خاموش تربیت کے ذریعے کار دعوت کو استحکام حاصل ہو، چنانچہ آپ ﷺ نے انتہائی خاموش طریقہ سے ان افراد کی تربیت کی اور ان کے اندر ایمان و اخلاق کو راسخ کیا۔

ابتدائی قافلۂ حق:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے نتیجے میں اولین قافلۂ حق جو دائرۂ اسلام میں داخل ہوا، ان میں ام المومنین حضرت خدیجہؓ، زیدؓ بن حارثہ، علیؓ ابن ابی طالب اور ابو بکرؓ صدیق شامل ہیں۔ اس زندہ اور متحرک دعوت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ جو افراد بھی اس دائرہ میں داخل ہوتے گئے وہ سب کے سب سراپا دعوت بنتے چلے گئے۔ اس ابتدائی مرحلہ میں صرف حضرت ابو بکر صدیقؓ کی دعوت پر حضرت عثمانؓ بن عفان، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، سعد ابن ابی وقاصؓ، طلحہ بن عبیداللہؓ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ گویا یہ دوسرا قافلہ تھا جو ہراول دستہ کے ساتھ جا ملا۔

دعوتی کوششوں کے آگے بڑھنے کے نتیجے میں تیسرا قافلۂ حق جو اسلام میں داخل ہوا ان میں بلال حبشیؓ، ابوعبیدہ بن الجراحؓ، ابوسلمیؓ، ارقمؓ، عثمان بن مظعونؓ، قدامہ، عبداللہ، عبیداللہ، سعید بن زید، فاطمہ بنت خطاب اور خباب بن ارت رضی اللہ عنہم ہیں۔

خاموش دعوت کے دور میں ذرائع تربیت

اس مرحلہ میں آپ ﷺ نے اپنے جانثاروں کی فکری و عملی تربیت کے لیے درج ذیل امور کو وسیلہ بنایا:

۱۔ جنت دوزخ کے تذکرہ پر مشتمل دل میں اترنے والی چھوٹی سورتوں کی تعلیم دی۔

۲۔ صبر و ثبات کی تلقین کی، اور

۳۔ دو وقت کی نمازیں، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ۔ (سورہ مومن: ۵۵)

''پس اے نبی ﷺ! تو صبر کر، اللہ کا وعدہ بالکل سچا ہے تو اپنے گناہ کی معافی مانگتا رہ اور صبح و شام اپنے پروردگار کی تسبیح اور حمد بیان کرتا رہ۔

اس کے بعد جب مرد وخواتین کی ایک بڑی جماعت اسلام میں داخل ہوگئی تو قریش میں اس دعوت کا خوب چرچا ہوا۔قریش کواس دعوت سے کچھ اندیشہ تو ہوا تاہم اس کو خاطرخواہ اہمیت نہ دی۔اس کی وجہ یہ تھی امیہ بن ابی الصلت، قس بن ساعدہ اور عمرو بن نفیل وغیرہ اسی طرح کی توحید کی باتیں کیا کرتے تھے،اس لیے لوگوں نے محمدﷺ کو بھی اسی طرح کا کوئی فرد سمجھا۔

دوسرا مرحلہ: علانیہ دعوت

علانیہ دعوت اوراس کے لیے پیش آنے والے حالات کے لیے پیشگی اطلاع اور تیاری کی ترغیب۔ جب اللہ کی جانب سے یہ حکم وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ (شعراء:۲۱۴) نازل ہوا تو آپﷺ نے اپنے قبیلہ کے لوگوں کو بلایا جن پر مشتمل علانیہ دعوت کا یہ پہلا اجتماع تھا۔اس اجتماع میں خاندان کے ۴۵/افراد جمع ہوئے مگر ابولہب کی دھمکی آمیز مداخلت کے سبب دعوت نہ دی بلکہ خاموش اٹھ گئے۔اس کے بعد آپﷺ نے دوبارہ اپنے اہل خاندان کو جمع کیا اور ارشاد فرمایا:

ساری حمد وثنا اللہ کے لیے ہے، میں اسی کی حمد کرتا ہوں،اسی سے مدد چاہتا ہوں،اسی پر ایمان رکھتا ہوں اوراسی پر بھروسہ رکھتا ہوں۔میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے، وہ تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔اس کے بعد آپﷺ نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: رہنما اپنے گھر کے لوگوں سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔اس اللہ کی قسم جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، میں تمہاری طرف خصوصاً اور لوگوں کی طرف عموماً اللہ کا رسول ہوں۔اللہ کی قسم تم لوگ اسی طرح موت سے دوچار ہوگے جس طرح سوجاتے ہواوراسی طرح دوبارہ زندہ کیے جاؤ گے جس طرح سوکر اٹھتے ہو۔اس کے بعد تم سے حساب لیا جائے گا،اوراس کے بعد ہمیشہ کے لیے یا تو جنت ہے یا ہمیشہ کے لیے جہنم۔''

جناب ابوطالب نے آپﷺ کی ان باتوں کی بھرپور تائید کی اور مکمل ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ البتہ آباء واجداد کا دین چھوڑنے پر مائل نہ ہوئے۔ابوطالب کے اس ساتھ دینے کے وعدے پر ابولہب نے کہا یہ برائی ہے۔اس کا ہاتھ تم خود پکڑلو،مگر ابوطالب نے کہا: جب تک میری جان میں جان ہے ہم اس کی حفاظت کرتے رہیں گے۔

سرگزشت موسی کی حکمت:

سورہ شعراء کی ان آیات کے ذریعے موسیٰؑ کی سرگزشت دعوت جو تمام مراحل پر مشتمل تھی سنائی گئی۔سورہ مزمل میں بھی اس کی طرف اجمالی اشارہ ہے جیسا کہ فرمایا:

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولاً شَاهِداً عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَى فِرْعَوْنَ رَسُولاً ۔

اس سورہ شعراء میں موسیٰ علیہ السلام کی مکمل سرگزشت سنائی گئی جس کے درج ذیل مقاصد تھے:

پہلا یہ کہ صحابہ کرامؓ کو حالات کی پیشگی خبر دے دی جائے اور وہ اس کے مطابق ان حالات کا سامنا کرنے کے لیے ابھی سے تیار رہیں۔

دوسرا یہ کہ انہیں تسلی بھی دی جائے کہ اس دعوت کے حاملین مغلوب نہیں ہوں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت پہلے سے رہی ہے۔

تیسرا مقصد یہ تھا کہ اہل باطل کو روز اول سے ہی اس بات کی خبر دے دی جائے کہ کفر وشرک کو ترک نہ کرنا ان کے لیے کسی خیر کا موجب نہیں ہوگا۔

قرآن مجید میں سب سے تفصیلی ذکر موسیٰؑ کا ہے جس کے پیچھے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ کوئی غالب قوم اہل حق پر یہ سمجھ کر نہ نظر اٹھائے کہ یہ پس ماندہ لوگ ہیں اور ہم ان کا خاتمہ آسانی سے کر دیں گے، یقیناً یہ ان کی خام خیالی ہوگی، نیز یہ کہ غلبہ اور کامرانی مادی شان وشوکت کی بنا پر نہیں بلکہ ایمان ویقین کی دولت سے ملتی ہے۔ سارے مادی وسائل مہیا ہوں مگر اللہ کی مدد حاصل نہ ہو تو ایسی جماعت کامیاب نہیں ہوسکتی۔

ابتلاء و آزمائش کی امنڈتی موجیں:

آپ ﷺ نے ابوطالب کی مدد سے اپنی دعوت آگے بڑھائی۔ ایک دن کوہ صفا پر چڑھ کر تمام قبائل عرب کو دعوت دی۔ ایک ایک کا نام لے کر پکارا۔ جب سارے قبائل کے لوگ جمع ہو گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم لوگ یہ بتاؤ! اگر میں یہ خبر دوں کہ ادھر وادی میں شہسواروں کی ایک جماعت ہے جو تم پر چھاپہ مارنا چاہتی ہے تو کیا تم مجھے سچ مانو گے؟ لوگوں نے کہا ہاں۔ ہم نے آپ پر سچ کا ہی تجربہ کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا! اچھا تو میں تمہیں ایک سخت عذاب سے پہلے خبردار کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ اس پر چچا ابولہب نے کہا، تو سارے دن غارت ہو، تو نے ہمیں اسی بات کے لیے جمع کیا تھا؟ اس پر سورہ تبت یدا ابی لھب وتب نازل ہوئی۔ دوسری جانب مشرکین کے ردعمل کے جواب میں نبی ﷺ کو حکم ہوا فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ۔ (حجر:۹۴) یعنی آپ کو جو حکم دیا جارہا ہے کھول کر سنا دیجئے اور مشرکوں سے منھ موڑ لیجئے۔

علانیہ دعوت میں آپ ﷺ کی حکمت عملی:

اس مرحلہ میں بھی آپ ﷺ نے اپنے مخالفین سے اعراض اور موافقین کی تلاش کی حکمت عملی اپنائی

اوراپنے مشن کوایک دن کے لیے بھی بغیر کسی انقطاع کے جاری رکھا۔

ابتلا ء و آزمائش کی شروعات اور اس کی امنڈتی موجیں:

اس کے بعد پھر کیا تھا ابتلاء وآزمائش کی شروعات ہوگئی اور آپ ﷺ کی دعوت کو روکنے کے لیے نت نئے حربے استعمال کیے جانے لگے، لیکن دعوت حق تھی کہ اسے جتنا دبانے کی کوشش ہوئی وہ اتنی ہی ابھرتی چلی گئی، گویا سچائی کو جتنا دبانے کی کوشش کی گئی اس کی لو اتنی ہی تیز ہوتی چلی گئی۔ آپ ﷺ کی دعوت کی راہ میں ڈالی جانے والی رکاوٹوں کو درج ذیل نکات میں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ ابو طالب پر مزید سخت دباؤ ڈالا گیا کہ کسی بھی طرح وہ آپ ﷺ کا ساتھ دینے سے باز آجائیں۔

۲۔ آپ ﷺ پر جادوگری کا بھی الزام لگایا گیا۔ چنانچہ ولید بن مغیرہ نے تجویز پیش کی کہ آپ ﷺ کو جادوگر کہہ کر مشتہر کیا جائے تاکہ لوگ آپ سے دور رہیں۔ جس پر سورہ مدثر کی آیات (۱۔۱۶) نازل ہوئیں، جن میں ولید بن مغیرہ کے اس طرز عمل کی منظر کشی کی گئی اور اس کی بدبختی کو واشگاف کردیا گیا۔

۳۔ میلوں اور مذہبی تہواروں میں ابولہب نے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے پیچھے جا کر کہنا شروع کردیا کہ یہ شخص جھوٹا اور بددین ہے۔ اس تدبیر کا مثبت اثر یہ پڑا کہ پورے عرب میں نبی ﷺ کی نبوت کا چرچا عام ہوگیا۔

۳۔ جب آپ ﷺ دعوت دے رہے ہوتے تو آپ کے ساتھ ہنسی اور ٹھٹھا کیا جاتا تاکہ لوگ آپ کو حقیر سمجھ کر آپ کی بات نہ سنیں۔

۴۔ ام جمیل کے ہجویانہ اشعار آج بھی تاریخ کے صفحات میں اس کی حق دشمنی کی واضح مثال ہیں:

"مذمما عصينا ـــ وأمره ابينا ـــ ودينه قلينا" بھی اسی کا حصہ ہیں۔

۵۔ تعلیمات نبوی کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی تاکہ لوگ ان کو اہمیت نہ دیں۔

۶۔ قرآن مجید کے مقابلے میں رستم واسفندیار کے قصے کہانیاں گھڑے گئے اور یہ گھڑنے والا نضر بن حارث تھا۔

۷۔ ان سب تدبیروں سے بھی جب اس دعوت کو روکا نہ جا سکا تو مداہنت اور 'لو اور دو' کی پالیسی اپنائی گئی لیکن بالآخر یہ بھی ناکام رہی۔

۷۔ان سے بھی آگے بڑھ کر ظلم و جور کا طریقہ اپنایا گیا، چنانچہ آپ ﷺ کی بیٹیوں کو طلاق دلوانا، عبداللہ کے انتقال پر ابتر کے نام کا اعلان کرنا بھی راہ دعوت کی رکاوٹوں میں سے ہی تھا۔

۸۔عبادات کے اوقات میں بھی آپ ﷺ کو ستایا گیا، چنانچہ عقبہ بن ابی معیط نے عین نماز کی حالت میں آپ ﷺ پر اونٹ کی اوجھڑال دی۔

ظلم و ستم جب حد سے بڑھ گیا تو نبی ﷺ نے عتبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، امیہ بن خلف اور عقبہ بن ابی معیط کے خلاف بددعا کی جس کے بعد وہ لوگ بہت زیادہ خوف زدہ رہنے لگے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا نبی ﷺ سے وعدہ تھا واللہ یعصمك من الناس ۔اس کا ایک مظاہرہ اس وقت ہوا، جب عین نماز کی حالت میں ابوجہل بدنیتی سے حملہ کے ارادے سے آگے بڑھا اور پھر خوف کھا کر تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ جب اس سے دریافت کیا گیا کہ ایسا کیوں کیا تو اس نے بتایا کہ میں نے آگے بڑھنا چاہا تو ایک بہت ہی خوفناک شیر میرے اوپر حملہ آور ہونے والا تھا جس کی وجہ سے میں بھاگ کھڑا ہوا۔

دار ارقم (دار تربیت) :

اس پورے عرصے میں دار ارقم مسلمانوں کی خاموش تعلیم و تربیت کا مرکز تھا جبکہ دعوت علانیہ ہو رہی تھی۔ دار ارقم کو تربیت گاہ بنانے کا مقصد یہ تھا کہ حضرت ارقمؓ ایک کم عمر صحابی تھے جس کی وجہ سے عام لوگوں کی توجہ ان کی جانب نہیں تھی۔ لہٰذا اس گھر کو تربیت گاہ بنانے کا مقصد عام مسلمانوں کو آزمائشوں سے بچانا تھا۔

ہجرت حبشہ اور اس میں پنہاں دروس و نتائج:

جور و ستم نبوت کے پانچویں سال میں انتہائی شدید ہوا تو ہجرت کا مرحلہ آیا۔ اسی دور میں رہنمائی کے لیے سورہ کہف نازل ہوئی۔ حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام کے واقعہ میں ظاہری واقعہ کے باطنی نتیجہ کی طرف اشارہ ہے کہ اہل ایمان تمام تر ناموافق حالات کے باوجود فتح یاب ہوں گے۔ واقعۂ ذوالقرنین میں یہ سبق ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی مدد ایسی جگہوں سے بھی کرا دے گا جہاں اس کا گمان بھی نہیں جا سکتا۔ اس سورہ میں یہ بھی سبق ہے کہ اللہ اپنی زمین کا وارث اپنے صالح بندوں کو ہی بناتا ہے۔ ظلم و جور کا خاتمہ کرنے کے لیے اللہ اپنے بندوں کو بھیجتا رہتا ہے، انسان کی نجات راہ ایمان میں ہے نہ کہ کفر و شرک میں۔

رجب ۵ نبوی میں پہلی ہجرت ہوئی جس میں ۱۲ر مرد اور ۴ر خواتین قافلۂ ہجرت میں شامل تھیں۔

یہ ہجرت اصحمہ نجاشی شاہ حبش کے ملک کی طرف ہوئی تھی ۔ سالار قافلہ عثمانؓ بن عفان مع زوجہ حضرت رقیہؓ تھے۔ جہاں وہ طویل عرصہ تک مقیم رہے۔ پھر جب مکہ میں مسلمانوں کے لیے حالات کی سازگاری کی خبر ملی تو یہ قافلہ واپس لوٹا لیکن یہ خبر غلط تھی۔ مکہ میں مسلمانوں کا جب دوبارہ جینا دوبھر ہوگیا تو دوسری دفعہ بھی مسلمانوں نے حبشہ ہی کی طرف ہجرت کی ۔۸۳/مرد اور ۱۸/خواتین پر مشتمل کل ایک سو ایک افراد کا یہ کارواں سالار قافلہ حضرت جعفر طیارؓ کی قیادت میں روانہ ہوا۔ مشرکین مکہ کی طرف سے مہاجرین کو واپس لانے کے لیے غلط بیانی پر مشتمل سفارتی کوششیں بھی ہوئیں لیکن شاہ حبشہ نے اپنی دانشمندی سے حقیقت کو بھانپ لیا اور ان کی سفارتی کوششوں کو ٹھکرا دیا اور مسلمان وہاں امن کے ساتھ رہنے لگے۔

حبشہ میں ان مہاجر مسلمانوں نے یہ ثابت کردیا کہ ایمان اور اسلام کی خاطر سب کچھ قربان کیا جا سکتا ہے۔ اللہ کی مدد تبھی آئے گی جب مسلمان اسلام کو مضبوطی سے تھامے رہیں گے۔ اس ہجرت سے انہیں اچھی طرح یہ محسوس ہوگیا کہ جب بندہ اللہ کی محبت کو دیگر ساری محبتوں پر فوقیت دے دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ سب کے مقابلے میں اکیلا ہی کافی ہوتا ہے۔ اس واقعے سے یہ بھی سبق ملتا ہے کہ اہل حق کبھی بھی حق گوئی سے نہیں چوکتے چاہے جتنی مشکلات کا بھی سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔ چنانچہ حضرت جعفرؓ نے قریش کے وفد کے سامنے ہی نجاشی کے سوالوں کے جو جوابات دیے ان کا ایک ایک جملہ اس کی صداقت پر دلیل ہے۔ ان کی تقریر کے ماحصل کو ہم درج ذیل نکات میں سمیٹ سکتے ہیں جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے تعلق سے نجاشی کے دربار میں کی تھی:

(۱) توحید (۲) رسالت (۳) صداقت و دیانت (۴) امانت داری (۵) صلہ رحمی (۶) پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک (۷) محرمات سے پرہیز (۸) خوں ریزی سے گریز (۹) بدکاری سے اجتناب (۱۰) کذب بیانی سے دوری (۱۱) یتیم کا مال کھانے سے پرہیز (۱۲) پاک دامن خواتین پر الزام تراشی سے گریز (۱۳) اقامت صلوۃ (۱۴) ایتاء زکاۃ (۱۵) اور (۱۵) صیام رمضان۔

ہجرت حبشہ میں تمام مسلمانوں کے لیے درج ذیل اسباق ہیں:

سب سے پہلے تو ہم اس قافلہ کے افراد میں یہ دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اتحاد و اتفاق اور اجتماعیت کا مظاہرہ کیا۔

دوسرا سبق یہ کہ انہوں نے باہمی مشورہ سے اپنا ایک امیر منتخب کرلیا۔

تیسرا سبق یہ کہ گرچہ ان کے لیے حالات بالکل ناسازگار تھے پھر بھی انہوں نے حق وصداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور جس ایمان کی حفاظت کی خاطر گھر بار چھوڑا تھا اس سے چمٹے رہے۔ ساتھ ہی انہوں نے جذباتیت سے بھی گریز کیا۔ حکمت وبصیرت اور صبر واستقامت کا دامن تھامے رہے۔ اس ملک میں عدل وانصاف کی جو خوبیاں تھیں انہیں خوب سراہا اور ان کو اپنے تحفظ کے لیے بھرپور طریقے سے استعمال کیا۔ جب تک وہاں رہے ایک امن پسند شہری کی حیثیت سے رہے۔ اہل حبشہ کے مزاج اور تہذیب وتمدن سے آگاہی حاصل کی اور پرامن بقائے باہم کا طریقہ کار اختیار کیا۔ کسی اقلیتی ملک میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے اس واقعہ میں مذکور سارے پہلوؤں میں قابل عمل اسباق موجود ہیں۔

دعوت حق کو روکنے کی مزید کوششیں :

سودے بازی :

مشرکین کی جب ساری تدبیریں ناکام ہوگئیں تو ان لوگوں نے سودے بازی کا طریقہ اختیار کیا۔ ہر دور میں اہل باطل کا طریقہ رہا ہے کہ جب طاقت سے حق کو نہیں دبا پاتے ہیں تو مداہنت کی بات اور سودے بازی کرتے ہیں۔ چنانچہ یہاں پر بھی وہی حربہ اختیار کیا گیا۔ چنانچہ ان لوگوں نے مال واسباب، سرداری اور بادشاہت تک کی پیش کش کی، بلکہ یہ بھی کہا کہ اگر آپ کو کسی طرح کا مرض لاحق ہے تو ہم اس کا بھی علاج کرائے دیں گے مگر اپنے اس مشن سے باز آجائیں۔ جس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے انہیں سورہ حم سجدہ کی ابتدائی آیات سنائیں، جنہیں عتبہ چپ چاپ سنتا رہا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابوالولید! تمہیں جو کچھ سننا تھا سن چکے اب تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ عتبہ اٹھا اور سیدھا اپنے ساتھیوں کے پاس آیا۔ چونکہ جو پیغام اس نے سنا تھا اس کا صاف اثر اس کے اوپر ظاہر تھا۔ سرداران قریش کے استفسار کے جواب میں عتبہ نے کہا: واللہ میں نے ایسا کلام سنا ہے جو میں نے کبھی نہیں سنا تھا۔ اس کا تعلق ان میں سے کسی بات سے نہیں جو ہم سوچتے ہیں۔ میری بات مانو اور اس کا معاملہ میرے اوپر چھوڑ دو۔ اگر عرب نے اس شخص کو مار ڈالا تو تمہارا کام ہو چکے گا اور اگر وہ غالب آگیا تو اس کی بادشاہت تمہاری بادشاہت ہو گی۔ مگر لوگوں نے ہٹ دھرمی کے سبب کہا عتبہ پر بھی اس کا جادو چل گیا ہے۔ اس پر اس نے کہا اس شخص کے بارے میں میری رائے یہی ہے اب تمہیں جو مناسب معلوم ہوتا ہے کرو۔

شعب ابی طالب میں محاصرہ:

شعب ابی طالب میں بائیکاٹ کرنے سے پہلے مشرکین کو چار بڑے جھٹکے لگے۔ پہلا اور دوسرا یہ

کہ حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ اسلام لائے، حضرت حمزہ سنہ ۶ میں اسلام لائے اور ان کے اسلام لانے کا سبب ابوجہل کا رسول اللہ کو ستانا تھا۔ اور حضرت حمزہؓ کے ایمان لانے کے صرف تین دن بعد دعائے نبی ﷺ کے بعد حضرت عمر بن خطابؓ اسلام لائے۔ خود انہی کے بقول ان کے دل میں ایمان رسولؐ ہی کی زبان سے سورہ الحاقہ سن کر جاگزیں ہو چکا تھا۔ تیسرا یہ کہ مشرکین کی مذکورہ سودے بازی کو ٹھکرا دیا گیا۔ اور چوتھا یہ کہ بنی ہاشم و بنی عبدالمطلب کے سارے افراد نے متفق ہو کر نبی ﷺ کی حفاظت کا عہد و پیمان کیا تھا۔ ان باتوں نے قریش کی بے چینی کو اور بڑھا دیا۔

مقاطعہ (بائیکاٹ) کے اثرات و نتائج:

یہ مقاطعہ ۷ر نبوی سے ۱۰ر نبوی تین سال تک مسلسل جاری رہا۔ اس مقاطعہ نے اسلام کی دعوت میں مزید پختگی پیدا کی۔ بائیکاٹ سے پہلے ہی ابوطالب نے بنی ہاشم اور بنی عبدمناف کو جمع کر کے رسول اللہ کی حفاظت کا وعدہ لے لیا تھا اور دونوں قبیلوں کے سارے افراد کی مکمل تائید حاصل کر لی تھی۔ مدت بائیکاٹ تین سال تک یعنی محرم سن ۷ سے محرم سن ۱۰ تک رہی۔ اس کے خاتمے کی اطلاع رسول ﷺ نے دی کہ کیڑوں نے قبائل قریش کے اس حلف نامہ کو کھا لیا ہے۔ جس کا اعلان ابوطالب نے خانہ کعبہ میں جبکہ سرداران قریش موجود تھے کیا۔ اسی درمیان مقاطعہ کے خلاف آوازیں بھی اٹھنے لگی تھیں۔ مقاطعہ کے خلاف قدم اٹھانے والے سرداران میں ہشام بن عمرو بن الحارث، مطعم بن عدی، زہیر بن امیہ، ابوالبختری بن ہشام اور زمعہ بن اسود تھے جو اس کو ختم کرنے کے لیے باہم متحد ہو چکے تھے۔ اہل ایمان جو پہلے ہی سے اپنے ایمان میں پختہ تھے اس مقاطعہ نے ان کے اندر کی رہی سہی کمی کو بھی ختم کر دیا اور وہ سب کھرے اور کندن بن کر شعب ابی طالب سے نکلے۔

مشرکین کا آخری وفد:

نکلتے ہی دعوت کا کام پھر شروع ہو گیا مگر قریش کا دباؤ بدستور جاری تھا۔ ابوطالب اپنی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی حمایت میں تھے۔ چونکہ مسلسل دباؤ اور درازئ عمر کے سبب قویٰ مضمحل ہو چکے تھے۔ قریش کو پھر خیال آیا کہ کم از کم اب تو ابوطالب سے عہد و پیمان ہو جائے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کو پابند کر دیا جائے کہ اپنے مشن کو اب اسی جگہ روک دیں۔ چنانچہ عتبہ و شیبہ، بنی ربیعہ، ابوجہل، امیہ بن خلف اور سفیان بن حرب کے ساتھ پچیس کی تعداد میں اشراف قریش کا وفد ابوطالب کے پاس حاضر ہوا اور ان سے سارے اندیشوں اور حوالوں کے ساتھ بات کی۔ ابوطالب نے بھی رسول اللہ ﷺ کو بلا کر بات ان

کے سامنے رکھ دی۔ جواب میں رسول اللہ ﷺ نے وفد کو مخاطب کر کے فرمایا: آپ لوگ یہ بتائیں کہ اگر میں ایک ایسی بات پیش کروں جس کے آپ اگر قائل ہو جائیں تو عرب کے بادشاہ بن جائیں اور عجم آپ کی ماتحتی قبول کر لیں تو آپ کی کیا رائے ہوگی؟ اس بات کو سن کر وہ لوگ قدرے توقف میں پڑ گئے۔ خاموشی توڑتے ہوئے ابوجہل نے دریافت کیا کہ وہ کون سی بات ہے؟ ہم ایک نہیں ایسی دس باتیں ماننے کو تیار ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''لا الہ الا اللہ'' کا اقرار کر لیں اور اس اللہ کے سوا کی عبادت چھوڑ دیں۔ یہ سن کر تعجب کرتے ہوئے سب نے تالیاں بجا بجا کر کہا: محمد تم یہ چاہتے ہو کہ سارے خداؤں کی جگہ بس ایک خدا بنا ڈالیں، یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ چنانچہ وہ لوگ آپس میں یہ باتیں کرتے ہوئے واپس لوٹ گئے کہ یہ شخص ہماری بات ماننے والا نہیں۔ چلو اللہ ہی اس کے معاملہ میں فیصلہ فرمائے گا۔ اس کے بعد ہی سورہ ص کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔

اس واقعہ میں داعیانہ حکمت:

یہاں داعی کے لیے ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ مخالفت اور دباؤ جتنا شدید ہو داعی کو اپنی بات اتنے ہی مختصر، جامع اور سٹیک الفاظ میں رکھ دینی چاہیے تاکہ مدعو پر معاملہ دو اور دو چار کی طرح بالکل واضح ہو جائے۔

غم کا سال اور دعوتی سفر میں تیز گامی :

رجب میں حضرت ابوطالب کا انتقال ہوا اور اس کے معاً بعد ہی رمضان میں حضرت خدیجہؓ مالک حقیقی سے جا ملیں۔ یہ دونوں حادثے رسول اللہ کے لیے کسی پہاڑ کے ٹوٹنے سے کم نہ تھے جس کا اظہار بعد میں بھی آپ ﷺ فرماتے رہے۔ مگر اللہ کا دین غالب ہونے کے لیے کسی انسان کا محتاج نہیں۔ ابوطالب ایمان نہیں لائے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنے دین کا کام لے لیا۔ حضرت عمرؓ جیسے جری شخص ایمان لائے لیکن اللہ نے ان کو بھی آزمائش میں ڈال کر اپنی قدرت کا مظاہرہ فرمایا، یہاں تک کہ ابوعمرو عاص بن وائل سہمی نے دلاسہ دیا اور دشمنوں کو ان پر حملہ آور ہونے سے روکا۔ جب اللہ کے رسول ﷺ آزمائے گئے تو آزمائش سے اور کون بچ سکتا ہے۔

ابتلاء و آزمائش میں ثبات قدمی کے عوامل :

صحابہ کرامؓ اجمعین کی اس ابتلاء و آزمائش میں ثابت قدمی کے درج ذیل اسباب و عوامل تھے، جن سے رسول اللہ ﷺ نے مدد لی:

الف۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل ایمان اور پہاڑ سے بھی مضبوط اور اس سے نہ ختم ہونے والی محبت۔ نبی کریمﷺ کی پرکشش قیادت: قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ۔ (الانعام:۳۳)

ب۔ احساس ذمہ داری

ج۔ آخرت پر ایمان

د۔ آزمائشوں کے مقابل بشارتوں کا نزول

ہ۔ آزمائشوں کو کھرا ہونے کا ذریعہ سمجھنا

تیسرا مرحلہ: بیرون مکہ دعوت اسلام

طائف:

۱۰ ؍نبوی میں آپؐ مکہ سے ۶۰ میل دور اس دعوت کو لے کر طائف گئے، راستے میں آپﷺ قبائل کو دعوت دیتے گئے۔ طائف میں دس دن دعوتی قیام کیا اور بنو ثقیف کے سرداران عبد یالیل، مسعود اور حبیب کو دعوت دی لیکن ان سب سرداروں نے آپﷺ کی دعوت کو ٹھکرا دیا۔ واپسی میں اوباشوں نے انہی سرداروں کے اشارے پر آپﷺ کو ستانا شروع کیا اور طائف سے تین میل دور کے باغ تک پیچھا کیا۔ باغ عتبہ اور شیبہ بن ربیع کے تھے۔ آپﷺ نے باغ میں پناہ لی، انگور کی بیل کے سائے میں دیوار سے ٹیک لگا کر آپﷺ نے وہ تاریخی دعا کی جس میں ہر داعی کے لیے عظیم سبق ہے۔

سفر طائف میں تحریک اسلامی کے لیے اسباق:

ا۔ اہل طائف کے لیے دعا: یوں تو آپﷺ کی پوری زندگی داعیانہ تڑپ سے بھری ہوئی ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں بار بار ہوا ہے۔ لیکن آپﷺ نے ان اذیتوں کے بعد بھی جو اہل طائف نے پہنچائیں، ان کے لیے جو دعا کی وہ دعاۃ کرام کے لیے ایک بے مثال نمونہ ہے۔ ہر داعی کو آج کے دور میں یہ دعا ازبر ہونی چاہیے۔ آپﷺ نے دعا کی:

" اللهم أشكو ضعف قوتي وقلة حيلتي وهواني على الناس يا أرحم الراحمين أنت رب المستضعفين وأنت ربي الى من تكلني؟ الى بعيد يتجهمني ام الى عدوملكته أمري ؟ ان لم يكن بك على غضب فلا أبالي ولكن عافيتك هي أوسع لي، أعوذ بنور وجهك الذي أشرقت له الظلمات وصلح عليه أمر الدنيا

والآخرة من ان تنزل بی غضبك او یحل علی سخطك ، لك العتبیٰ حتی ترضی ولاحول ولاقوة الا بك ۔ "

''اے اللہ میں تجھ سے اپنی کمزوری اور بے بسی اور لوگوں کے نزدیک اپنی بے قدری کا شکوہ کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! تو کمزوروں کا رب ہے اور تو ہی میرا بھی رب ہے۔ تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کیا کسی بے گانے کے جو میرے ساتھ سختی سے پیش آئے، یا کسی دشمن کے حوالے جس کو تو نے میرے معاملے کا مالک بنادیا ہے؟ اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں ہے تو پھر مجھے کوئی پرواہ نہیں مگر تیری عافیت میرے لیے زیادہ کشادہ ہے۔ میں تیرے چہرے کے نور کی پناہ چاہتا ہوں جس سے تاریکیاں روشن ہوگئیں اور جس پر دنیا و آخرت کے معاملات کی درستگی ہوئی کہ تو مجھ پر اپنا غضب نازل کرے یا میں تیرے عتاب کا شکار بنوں۔ تیری ہی رضا مطلوب ہے یہاں تک کہ تو خوش ہو جائے، اور ساری طاقت اور سارا زور تو تیرے ہی پاس ہے۔''

۲۔ جب انسانوں نے حق کی دعوت ٹھکرادی تو اللہ تعالیٰ نے مکہ پہنچنے سے پہلے ہی اپنی دوسری مخلوق جنوں کی جماعت کے قبول اسلام کے ذریعہ رسول ﷺ کی تائید غیبی کی اور آپ ﷺ کے دل کو تسلی اور اطمینان بخشا۔ طائف سے واپسی پر مطعم بن عدی (جو مقاطعہ کو ختم کرانے والی ٹیم میں شامل تھے) کی پناہ میں مکہ میں داخلہ فرمایا۔

۳۔ موسم حج میں آنے والے افراد اور قبائل کو اسلام کی دعوت: مدینہ سے آنے والے وفود میں بنو کلب، بنوصعصعہ اور بنوعامر ہیں، سب نے دعوت ٹھکرادی۔ افراد میں سے سوید بن صامت نے، قبیلہ اوس کے ایاس بن معاذ نے ۱۱ نبوی میں، ابوذر غفاریؓ نے، یمن سے طفیل بن عمرو دوسیؓ (شاعر تھے)، اور ضماد ازدیؓ (جھاڑ پھونک کرنے والے تھے) نے اسلام قبول کیا اور داعی بن کر اپنے اپنے قبیلے میں لوٹے۔

بیعت عقبہ اولیٰ:

یہ بیعت نبوت کے بارہویں سال میں ہوئی۔ اس بیعت میں وہی پانچ افراد تھے جو سن ۱۱/ نبوی میں اسلام قبول کر کے اپنے قبیلوں میں داعی بن کر گئے تھے، البتہ سات افراد نئے بھی تھے، گویا بارہ افراد پر مشتمل یہ ایک قافلہ تھا جن میں سے پانچ افراد قبیلہ اوس کے اور دو افراد قبیلہ خزرج کے تھے۔ چونکہ منیٰ

سے قریب ایک گھاٹی میں ان سے ملاقات اور باتیں ہوئی تھیں اور آپ ﷺ نے ان سے وہیں پر بیعت لی تھی اس لیے اس بیعت کا نام بیعت عقبہ رکھا گیا۔

اس وفد کے ایک شریک عبادہ بن صامتؓ کی روایت جس کو امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں درج کیا ہے، یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آؤ مجھ سے اس بات پر بیعت کرو کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو گے، چوری نہ کرو گے، زنا نہ کرو گے، اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے، اپنے ہاتھ پاؤں کے درمیان سے گھڑ کر کوئی بہتان نہ لاؤ گے، اور کسی بھلی بات میں میری نافرمانی نہ کرو گے، جو شخص یہ باتیں پوری کرے گا بس اس کا اجر اللہ پر ہے، اور جو شخص ان میں سے کسی بات کا ارتکاب کر بیٹھے گا پھر اسے دنیا میں ہی اس کی سزا دے دی جائے گی تو یہ اس کے لیے کفارہ ہوگی اور جو شخص ان میں سے کسی چیز کا ارتکاب کر بیٹھے گا پھر اللہ اس پر پردہ ڈال دے گا تو اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے چاہے گا تو سزا دے گا اور چاہے گا تو معاف کر دے گا۔ حضرت عبادہؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس پر آپ ﷺ سے بیعت کی۔

حج کے اختتام پر آپ ﷺ نے مدینہ میں اپنا پہلا سفیر بھیجا جو حضرت مصعب بن عمیرؓ بنائے گئے تھے۔ یہ مکہ کے ایک امیر ترین گھرانے کے نوجوان تھے۔ ان کے ذمہ مسلمانوں کی تربیت اور دیگر لوگوں میں دعوت کا کام تھا۔ پہلے ہی مرحلہ میں انہیں قابل رشک دعوتی کامیابی ملی۔ آپ کے دل پذیر انداز گفتگو نے حضرت اسیدؓ کو آغوش اسلام میں لے لیا اور ان کے بعد اسعد بن زرارہ بھی دائرۂ اسلام میں داخل ہونے سے نہ رہ سکے۔ ان دونوں کا اسلام قبول کرنا تھا کہ شام تک پورا قبیلہ بنی عبدالاشہل ایک فرد کے علاوہ اسلام میں داخل ہو چکا تھا۔

واقعہ اسراء و معراج میں اسباق:

داعی اسلام اپنے مشن میں رواں دواں تھے ہی کہ اسراء اور معراج کا واقعہ پیش آ گیا۔ جس میں پیشین گوئی تھی کہ:

۱۔ اب اہل ایمان کے لیے ایسی جگہ منتقلی قریب ہے جہاں وہ آزاد اسلامی ماحول میں زندگی گزار سکیں گے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو بہترین ٹھکانہ دینے والا ہے اور اہل کفر و شرک ذلیل ہو کر رہیں گے۔

۳۔ مسلمانوں کی یہ وحدت ایسی ہوگی کہ اب اقوام اسی کے ارد گرد چلیں گی۔

۴۔ اسی کے ساتھ جلد ہی مدینہ میں قائم ہونے والے اسلامی معاشرہ کے لیے دینی اور تمدنی قواعد بھی

سورہ بنی اسرائیل میں بیان کیے گئے۔

بیعت عقبہ ثانیہ:

دعوت دین کا یہ کارواں مدینہ میں اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہا۔اس ایک سال کے عرصے میں ایک معتد بہ تعداد دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئی۔ چنانچہ نبوت کے تیرہویں سال پھر مدینہ سے قافلۂ حجاج کے ساتھ ستر سے زائد مسلمان مشرکین کے وفد میں ہی شامل ہوکر حج کرنے مکہ آئے۔لیکن انہیں اپنے اسلامی بھائیوں کی مکے کی پرآشوب زندگی تڑپا رہی تھی اور وہ متفکر تھے کہ کسی طرح راستہ نکالا جائے۔ چنانچہ مکہ پہنچ کرانہوں نے خاموش طریقے سے رسول اللہ ﷺ سے رابطہ کر کے پھر منیٰ میں جمع ہوکر کسی حل کے نکالنے کی بات طے کی۔دعوت حق کی چنگاری چونکہ ہر جگہ جلتی رہتی تھی چنانچہ یہ مشن اس نازک گھڑی میں بھی نہیں رکا۔ مدینہ سے آنے والے وفد نے یوں تو رازداری برت رکھی تھی تاہم ایک معزز سردار عبداللہ بن حرام کو انہوں نے ساتھ لے لیا تھا اور ایک نہایت ہی حسین پیرایے میں انہیں اسلام کی دعوت دی گئی،جس سے انہوں نے اسی وقت اسلام قبول کرلیا اور اپنے قبیلے کے لیے اسلام کے نقیب بھی مقرر ہوگئے۔

تہتر مرد اور دو خواتین پر مشتمل جاں نثاروں کا یہ قافلہ ایک ایک کر کے طے شدہ مقام پر جمع ہوا جس میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کے چچا عباس بن عبدالمطلب جو ابھی اسلام نہیں لائے تھے رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کے لیے اور اہل قافلہ سے عہد و پیمان لینے کے لیے موجود تھے۔حضرت عباسؓ نے ایک مختصر تقریر کی جس کے بعد حضرت کعبؓ نے کہا کہ ہم نے عباس کی گفتگو سن لی ہے اور اے رسول اللہ آپ گفتگو فرمائیں اور ہم سے اپنے رب کے لیے جو چاہیں عہد و پیمان لے لیں۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح اہل یثرب اپنی ذمہ داری کے تئیں مخلص تھے۔رسول اللہ ﷺ نے مختصر اور پراثر وعظ و نصیحت کے بعد ان سے جن باتوں پر بیعت لی وہ یہ تھیں:

۱۔ چستی اور سستی ہر حال میں سمع و طاعت کا دامن تھامے رہیں گے۔

۲۔ تنگی اور خوش حالی ہر حال میں مال خرچ کریں گے۔

۳۔ بھلائی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔

۴۔ اللہ کی راہ میں اٹھ کھڑے ہوں گے اور اللہ کے معاملے میں کسی ملامت گر کی ملامت کو قبول نہیں کریں گے۔

۵۔اور جب رسول اللہﷺ ان کے پاس جائیں گے تو وہ ان کی مدد کریں گے اور جس چیز سے اپنی جان اور اولاد کی حفاظت کرتے ہیں اس سے رسول اللہﷺ کی بھی حفاظت کریں گے۔

بیعت کی دفعات کی مکرر یاددہانی کے بعد رسول اللہﷺ نے ایک ایک سے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیعت لی لیکن عورتوں سے صرف زبانی عہد لیا ان سے مصافحہ نہیں کیا۔اس کے بعد اپنی اپنی قوم کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے اوس سے تین اور خزرج سے نو نقباء مقرر کیے جو اپنی قوم میں ان دفعات کو نافذ کرائیں گے۔

اس موقع سے ایک عجیب بات یہ پیش آئی کہ معاہدہ کے مکمل ہو جانے کے بعد شیطان نے اس کا انکشاف کردیا، جس کے نتیجے میں قریش متحرک ہو گئے لیکن اس سے پہلے کہ یہ لوگ کوئی کارروائی کرتے حجاج کرام اپنے گھروں کی طرف نکل گئے۔صرف سعدؓ بن عبادہ پکڑ لیے گئے، لیکن چونکہ مطعم بن عدی اور حارث بن حرب کا تجارتی قافلہ حضرت سعدؓ کی ہی پناہ میں مدینے سے گزرتا تھا اس لیے انہوں نے ان کو چھڑا لیا۔ یہ سارا معاملہ جو پیش آیا وہ محض اس ایمان کی بدولت تھا جو انہیں قرآن مجید اور رسول اللہﷺ کی تعلیمات سے حاصل ہوا تھا۔

بہر حال ان حالات نے اس بات کے لیے راستہ ہموار کر دیا کہ اب رسول اللہﷺ اور ان کے جاں نثاران زیادہ دنوں تک اذیت ناک حالات سے دوچار نہیں رہیں گے، جلد ہی مدینہ میں ایک اسلامی ریاست وجود میں آجائے گی۔مسلمان وہاں آزادی کی سانس لے سکیں گے، اور دعوت اسلامی کا قافلہ زیادہ مستحکم انداز میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا چلا جائے گا۔

کامیاب منصوبہ بندی واقدام
ہجرت نبویؐ کی روشنی میں

اشتیاق عالم فلاحی، دوحہ۔قطر

صحیح منصوبہ بندی درست اقدام کی پہلی منزل ہے۔کسی مثبت نتیجے کےحصول کے لیے انسان کئی سمتوں میں ہزار کوششیں کرسکتا ہے پر ہر کوشش قابلِ ستائش اور بہتر نتیجہ کی ضامن نہیں ہوتی۔ اہداف تک پہنچنے کے لیے کم سے کم دستیاب وسائل کا بہتر استعمال ضروری ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب منزل کو پانے کے لیے بہترین منصوبہ بندی کی جائے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ منصوبہ بندی کامیابی کا ایک لازمی حصہ ہے۔قرآن کی متعدد آیات میں منصوبہ بندی اور مستقبل کے لیے پیشگی تیاری کی تاکید کی گئی ہے' مثلاً وَأَعِدُّواْ لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدْوَّ اللّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لاَ تَعْلَمُونَهُمُ اللّهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنفِقُواْ مِن شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لاَ تُظْلَمُونَ۔ (الانفال60)

(اورتم لوگ، جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے اُن کے مقابلہ کے لیے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعداء کو خوف زدہ کرو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کروگے اس کا پورا پورا بدل تمہاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمہارے ساتھ ہرگز ظلم نہ ہوگا۔)

اگر جنگ' جس کا مرحلہ کم آتا ہے' کی تیاری کا حکم دیا گیا ہے تو زندگی کے دیگر اہم معاملات کی منصوبہ بندی تو اور بھی اہم ہے کہ زندگی چیلنجز اور امکانات سے بھرپور ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا ہر مرحلہ خواہ وہ خاموش دعوت سے علانیہ دعوت کی طرف منتقلی ہو یا غزوات ہوں، بہترین اور مثالی منصوبہ بندی کا آئینہ دار ہے۔ واقعہ ہجرت جو حق کے لیے امکانات کی

تلاش اور جد وجہد کی انتہائی منزل ہے، اپنے اندر منصوبہ بندی اور تیاری کے انمول نمونے اور لازوال دروس رکھتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی منصوبہ بندی کا مطالعہ کرنے سے منصوبہ بندی کے جو زبردست نقوش ملتے ہیں ان میں سے چند حسب ذیل ہیں:

1۔ واضح وژن:

ہمارے نبیؐ کے سامنے نبوت کے اول روز سے یہ بات واضح تھی کہ آپؐ کو سارے انسانوں کے لیے بھیجا گیا ہے۔ آپ کی قوم آپ کی دشمن بن جائے گی۔ ورقہ بن نوفل نے بھی آپؐ کے پاس جبریل امین کی آمد کی خبر سننے کے بعد اس کی طرف اشارہ کیا تھا کہ: یہی وہ ناموس ہے، جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمایا تھا، کاش میں نوجوان ہوتا، کاش میں اس وقت تک زندہ رہتا، جب تمہاری قوم تمہیں نکال دے گی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا! کیا میری قوم مجھے یہاں سے نکال دے گی؟ ورقہ نے جواب دیا، ہاں! جو پیغام لے کر تم آئے ہو اسے لے کر جو بھی آیا لوگ اس کے دشمن بن گئے اگر میں اس وقت تک زندہ رہا تو تمہاری بھرپور مدد کروں گا۔ (بخاری بدء الوحی)۔

آپ ﷺ کو یہ بات معلوم تھی کہ حق غالب آکر رہے گا اور اہل ایمان کی چھوٹی سی جماعت پھلے پھولے گی، چنانچہ اسی انداز میں آپ نے صحابہ کرام کی تربیت کی کہ وہ اپنی صلاحیتوں، شعور اور فہم کے اعتبار سے ایک ریاست کے نمائندے بن سکیں۔ حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کی روایت سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ایک بار رسول اللہ ﷺ بیت اللہ کی دیوار کے سائے میں چادر اوڑھے تشریف فرما تھے، ہم نے حاضر ہو کر کہا، آپ ہمارے لیے نصرت کی دعا کیوں نہیں مانگتے؟ آپ کا چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا، بیٹھے بیٹھے ارشاد فرمایا، تم سے پہلی امتوں کے اہل ایمان کو گڑھا کھود کر زمین میں گاڑ دیا گیا اور آروں سے انہیں چیرا گیا لیکن وہ دین متین سے نہ ہٹے۔ لوہے کی کنگھیوں سے ان کے گوشت نوچے گئے، یہ ظلم بھی انھیں راہ حق سے ہٹا نہ سکا۔ اللہ اس کار نبوت کا اتمام ضرور کرے گا حتیٰ کہ ایک سوار یمن کے مرکزی شہر صنعا سے ساحلی علاقے حضرموت تک جائے گا اور اسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا۔ ہاں اسے بھیڑیوں سے اپنی بکریوں کی حفاظت کرنا ہوگی۔ تم ذرا جلد بازی کر رہے ہو۔ (بخاری۔ کتاب الاکراہ)۔ آپ ﷺ کے سامنے مستقبل کا پورا نقشہ واضح تھا۔ اس نقشہ میں رنگ بھرنے کے لیے ہر طرح کی قربانی، خواہ وہ ہجرت ہی کیوں نہ ہو، کے لیے آپ ﷺ تیار تھے اور اپنے ساتھیوں کی بھی آپ نے اسی انداز سے تربیت فرمائی۔

2۔ہدف کا تعین:

اللہ کے دین کی اقامت: بندۂ مومن کے نزدیک دین اور اس کی اقامت سے زیادہ قیمتی کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کا اشارہ ملا کہ اللہ کی سرزمین کشادہ ہے۔ اللہ کے نبیؐ نے اپنے ساتھیوں کو اس سرزمین کی طرف جانے کا حکم دیا جہاں دین کے قیام کے امکانات تھے۔ اللہ کے رسولؐ کے پیش نظر یہ بھی تھا کہ جن ساتھیوں نے اسلام قبول کیا ہے انہیں مشرکین کے ظلم و جور سے بچانے کی تدبیر کی جائے اور جو صلاحیتیں موجود ہیں انہیں کارِ دعوت کے لیے نئے میدان میں استعمال کیا جائے اور مسلمانوں کی جماعت کو اتنی طاقت حاصل ہو جائے کہ اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی جاسکے۔

3۔منزل کا انتخاب اور وہاں دعوتی کام:

باوجود اس کے کہ اللہ کے رسول ﷺ کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ اللہ کی حفاظت میں ہیں، آپؐ نے تمام انسانی، مادی اور معنوی وسائل کا استعمال کیا۔ اول و آخر اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھنے کے ساتھ ساتھ، حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے بھرپور تیاری ضروری ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ ایسی جگہوں کے بارے میں غور فرماتے رہتے تھے جہاں دین کے قیام کا امکان ہو۔ آپؐ نے ایام حج میں بھی مختلف قبائل کے لوگوں سے بات کی۔ اور پھر منظرنامہ پر یثرب (مدینہ) کے نیک نفس انسانوں کا ظہور ہوا۔ بیعتِ عقبہ اولیٰ اور ثانیہ کے بعد مدینہ میں مسلمانوں کے لیے ایک نئے وطن کی بنیاد رکھی گئی۔ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے وہاں دعوت کا کام کیا۔ مصعب بن عمیر اور اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہما کی کوششوں کے نتیجے میں مدینہ کے اندر شیدایانِ رسول کی ایک زبردست جماعت تیار ہو چکی تھی۔ صحابہ کرام نے رسول اللہ کے حکم سے وہاں کا رخ کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے استقبال کی تیاری کی گئی۔

4-مناسب وقت کا انتخاب:

اللہ کی طرف سے آپ ﷺ کو ہجرت کی اجازت ہوئی تو آپ دوپہر کے وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس جاتے ہیں۔ یہ ایسا وقت ہے جبکہ عموماً لوگ گھروں میں آرام کر رہے ہوتے ہیں۔ ان دنوں قریش کے لوگ آپ ﷺ کو قتل کرنے کی سازشیں کر رہے تھے۔ ایسے موقع پر ایک ایک مرحلہ انتہائی احتیاط کے ساتھ طے کرنا ضروری تھا۔

5۔مناسب سمت اور راستہ:

آپ ﷺ نے آبادی سے نکل کر شمال کے بجائے جنوب کا راستہ اختیار فرمایا۔ فوری مدینہ کی

طرف روانہ ہونے کے بجائے آپ نے غارِ ثور میں تین دن قیام فرمایا۔ اوران ساری تدبیروں کے ساتھ ساتھ وہ مثالی توکل ہمارے سامنے آتا ہے کہ جب مشرکین غار کے دہانے تک پہنچ گئے تو آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ: ما ظنك يا ابا بكر باثنين الله ثالثهما! (اے ابوبکر ان دو افراد کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جن کے ساتھ تیسرا اللہ ہو)۔

6۔پیشگی تیاری:

ہجرت سے کافی پہلے آپ ﷺ نے ضروری تیاری مکمل کر لی تھی تا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے روانگی کا پروانہ ملنے پر کسی تاخیر کے بغیر اقدام کیا جا سکے۔ ہجرت سے تقریباً چار ماہ قبل ہی سواری کا انتظام کر لیا گیا تھا۔ اور وہ بھی اتنے راز دارانہ طریقے سے کہ مشرکینِ مکہ کو خبر بھی نہ ہوئی۔

7۔افراد اور صلاحیتوں کا استعمال:

ہجرت کے لیے آپ ﷺ یوں ہی نہیں نکل پڑے بلکہ یہ اقدام بھرپور منصوبہ بندی کے ساتھ کیا گیا۔ ایک ایک بات نہایت باریکی کے ساتھ طے کی گئی چنانچہ متعدد افراد کو مختلف ذمہ داریاں دی گئیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سفر میں رفاقت کے لیے منتخب کیا گیا۔ وہ آپ ﷺ کے ایسے دوست تھے جو اس مہم کو کامیابی کے ساتھ انجام دینے میں ہر لمحہ آپ کے ساتھ رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لوگوں کی امانتیں واپس کرنے کا کام سونپا گیا۔ انہوں نے آپ ﷺ کے بستر پر آرام کیا تا کہ کفار کو یہ گمان نہ ہو کہ حجرہ میں کوئی موجود نہیں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک طاقتور ساتھی تھے۔ ان کو ان کی صلاحیت کے مطابق کام دیا گیا۔

صرف اس تدبیر پر اکتفا نہیں کیا گیا کہ پیارے نبیؐ چند دنوں تک غار میں قیام فرمائیں اور اندازے کی بنیاد پر وہاں سے نکل کھڑے ہوں بلکہ اس کا بھی اہتمام کیا گیا کہ کفار کے منصوبوں سے واقفیت حاصل کی جائے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہ دن کا وقت اہل مکہ کے درمیان گزارتے وہاں کے حالات معلوم کرتے اور پھر رات میں نبی ﷺ کے پاس آ کر انہیں حالات سے باخبر کرتے اور فجر سے پہلے واپس مکہ چلے جاتے۔ حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا دشوار گزار راستہ طے کر کے غار تک کھانا پہنچاتیں۔ روانگی کے وقت حضرت اسماء اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما نے انتہائی مستعدی کا مظاہرہ فرمایا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ہم نے ان دونوں کے لیے جلدی جلدی سامان تیار کیا۔ اسماء نے جلدی میں سامان باندھنے کے لیے اپنے کمربند (نطاق) کے دو ٹکڑے کیے، اسی

لیے انہیں ذات النطاقین کہا جاتا ہے۔ حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ سے بھی کام لیا گیا، وہ ادھر سے بکریوں کا ریوڑ لے کر گزرتے تاکہ پیارے نبی ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بکریوں کا دودھ بھی پی لیں اور ریوڑ کی وجہ سے ان کے پاس آنے والوں کے قدموں کے نشانات باقی نہ رہیں۔

8۔ تجربہ کار شخص کی خدمات کا حصول:

اللہ کے رسول ﷺ نے عام راستے سے ہٹ کر مختصر اور محفوظ راستہ اختیار فرمایا۔ اس راستے میں رہنمائی کے لیے عبداللہ بن اریقط نامی شخص کی خدمات اجرت پر حاصل کیں۔ گو کہ وہ مشرک تھا لیکن راستوں کا اسے بھرپور علم تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی بھی کام کو بہتر طریقے سے انجام دینے کے لیے مطلوبہ صلاحیت کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ بعض کام وہ ہیں جہاں مطلوبہ صلاحیتوں کے سلسلہ میں سمجھوتا نہیں کیا جاسکتا خواہ یہ زمینی راستے ہوں یا زندگی کا راستہ۔

ان تمام تدابیر کے ساتھ ہمیں ہرگز اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اللہ کی تائید و نصرت آپ کو حاصل تھی۔ آپ کو قتل کرنے کے ارادے سے جمع مشرکین کے درمیان سے آپ ﷺ گزرے اور انہیں خبر نہ ہوئی۔ کفار غار کے دہانے تک پہنچ گئے پر اللہ نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ سراقہ بن مالک سو اونٹ کے انعام کی لالچ میں آپ کے قریب تک پہنچ گیا پر اس کے گھوڑے کے پیر زمین میں دھنس گئے۔ اس پورے سفر میں قدم قدم پر پروردگار کی رحمت شامل حال رہی۔

ہمارے رہبر ﷺ نے ہجرت کے موقع پر جو منصوبہ بندی فرمائی وہ سخت حالات میں ہمارے لیے منصوبہ بندی کے میدان میں بہترین رہنمائی ہے۔ یہاں قوت (Strength) کا بھی بھرپور اندازہ کیا گیا، جو کمزور پہلو تھے ان کو بھی سامنے رکھا گیا، اور ان سے نمٹنے کی بھرپور تدبیر کی گئی۔ جو مواقع میسر تھے ان سے بھرپور طریقے سے فائدہ اٹھایا گیا اور جو اندیشے (Threats) سد راہ بن سکتے تھے ان کو دور کیا گیا، اور نتیجہ یہ ہوا کہ منزل نے قدم چوم لیا۔

صلح حدیبیہ: ایک مطالعہ

ضمیر الحسن خاں فلاحی، لکھنؤ

قرآن پاک کتاب دعوتِ ہے اور صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم اس کا عملی نمونہ ہیں۔ نبیؐ کی سیرت کا مطالعہ تمام سیرتوں سے بے نیاز کر سکتا ہے لیکن بڑی ہستیوں کی سیرت کا مطالعہ، سیرت رسولؐ سے بے نیاز نہیں کر سکتا۔ قرآن مجید کی صراحت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصدِ اولیں اظہارِ دین اور دعوتِ دین تھا، آپؐ نے اپنی پوری زندگی اس مقصد کے حصول کے لیے وقف کر دی، نبی پاکؐ نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں جو کام بھی انجام دیے، وہ سب اسی بنیادی مقصد ''اظہارِ دین'' کے ساتھ مربوط تھے، آپؐ کی زندگی گویا ہدایت کا آفتاب ہے جس کے طلوع ہونے کے بعد کسی اور روشنی کی ضرورت وافادیت باقی نہیں رہی۔ آپؐ قرآن کی اصطلاح میں سراجِ منیر ہیں یعنی دنیا کے اندر ہدایت کا سرچشمہ آپؐ کی ذات گرامی ہی ہے۔ آپؐ نے اپنے مشن کی تبلیغ واشاعت کے لیے جو طریقے اختیار کیے، ان کا مطالعہ ہر داعی کے لیے یکساں طور پر مفید اور اہم ہے، آپؐ نے مختلف حالات میں اپنے مخاطبین کے مزاج کا کیا نوٹس لیا اور ان کی مخصوص ذہنیت کی بنا پر اپنے اسلوبِ دعوت میں کس طرح تنوع پیدا کیا، ان باتوں کے پیش نظر اگر سیرت پاک کا مطالعہ کیا جائے تو یقیناً بڑی رہنمائی ملتی ہے۔

سطور ذیل میں صلح حدیبیہ کے واقعہ کا سورہ الفتح کی روشنی میں مطالعہ کیا گیا ہے۔ صلح حدیبیہ نبی آخرؐ کی پیغمبرانہ زندگی کے اہم ترین اور نازک ترین واقعات میں سے ایک ہے، اس اہم اور نازک موقع پر آپؐ نے کس طرح اپنے بنیادی مقصد کو پیش نظر رکھا اور اس کے لیے کیا کیا طریقے اختیار فرمائے، یہ کتابِ دعوت وتبلیغ کا روشن باب ہے۔

۶ رہجری میں آپؐ نے خواب دیکھا کہ آپؐ صحابہ کرامؓ کے ساتھ اللہ کے گھر کا طواف کر رہے ہیں، صبح کو جب اس خواب کا تذکرہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحابؓ سے کیا تو ان کے چہرے خوشی سے کھل اُٹھے اور انہیں اُمید ہو چلی کہ خانہ کعبہ جس کی زیارت وطواف سے وہ ایک مدت سے محروم تھے، اب وہ اس نعمت سے محظوظ ہونے والے ہیں۔ چنانچہ آپؐ نے تیاری کا اعلان کر دیا اور بالآخر ۱۴ رسو

صحابہ نے رخت سفر باندھ لیا۔ آپؐ مکہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ اسی دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی کہ قریش آپؐ کو کسی صورت مسجد حرام تک جانے کی اجازت دینے کو تیار نہیں ہیں اور انہوں نے اس کی قسم کھا رکھی ہے کہ مومنین کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کے ساتھ مقام حدیبیہ پہنچے جو مکہ سے کافی قریب واقع ہے، چنانچہ قریش کا وفد جس کی سربراہی بدیل بن ورقا کے ذمہ تھی رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مختصر گفت وشنید کے بعد اس نے واپس جا کر قریش کو بتایا کہ محمد لڑنے نہیں آئے ہیں بلکہ ان کا مقصد بیت اللہ کی زیارت ہے، مگر قریش جو دشمنی کی آگ میں بھن رہے تھے، کہنے لگے! مقصد جو بھی ہو لیکن ہم مکہ میں کسی قیمت پر داخل نہیں ہونے دیں گے۔

وفود کے ساتھ گفت وشنید کا یہ سلسلہ جاری رہا، اس دوران کفار مکہ چھاپہ ماری اور دیگر حرکتوں کے ذریعہ مسلمانوں کو مشتعل کرنے کی کوششیں کرتے رہے، انہوں نے بہت چاہا کہ کسی طرح سے یہ مشتعل ہو جائیں اور کوئی ایسا اقدام کر بیٹھیں کہ لڑنے کا موقع ہاتھ آ جائے مگر حکمتِ رسولؐ اور فراستِ مومن کے سامنے ان کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں، بالآخر قریش نے سہیل بن عمرو کو صلح کی پیش کش کے ساتھ نبی کریمؐ کی خدمت میں بھیجا۔ سہیل نے آ کر گفتگو کی اور ان شرطوں پر فریقین کے درمیان صلح ہوئی، معاہدہ صلح کی پہلی شرط یہ تھی کہ دس سال تک ایک دوسرے سے جنگ نہیں کریں گے، ہر فریق مامون ہوگا۔ دوسری شرط یہ طے پائی کہ مکہ کا کوئی آدمی اگر اپنے سرپرست کی اجازت ومرضی کے بغیر مدینہ چلا جائے تو آپؐ کو واپس کرنا ہوگا لیکن اگر مدینہ سے کوئی فرد ہمارے پاس آ جائے تو اس کو لوٹایا نہیں جائے گا، یہ بھی طے ہوا کہ قبائل عرب میں سے جو چاہے محمدؐ کا حلیف بن سکتا ہے اور جو چاہے وہ قریش کے ساتھ ہو جائے، اور آخری شرط یہ تھی کہ اس سال مسلمانوں کو عمرہ کیے بغیر واپس جانا ہوگا، آئندہ سال وہ آئیں اور عمرہ کریں ہم تین دن کے لیے مکہ کو ان کے لیے خالی کر دیں گے۔

معاہدہ کی یہ شرطیں طے ہو گئیں، بظاہر ایسا لگتا تھا کہ اس سے زیادہ دب کر صلح کرنے کی کوئی اور شکل نہیں ہو سکتی، مسلمان اس صلح کو اپنی ذلت آمیز شکست اور قریش اپنی فتح تصور کر رہے تھے۔ حضرت عمرؓ جیسے باحمیت وغیور مسلمان عجیب پیچ وتاب میں تھے، کبھی ابوبکرؓ کے پاس جاتے، کبھی خود نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور پوچھتے کہ کیا آپ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟ جواب ملتا: کیوں نہیں، بلاشبہ میں اللہ کا رسول ہوں، پوچھتے: کیا ہم مسلم اور یہ لوگ مشرک نہیں ہیں؟ جواب ملتا: کیوں نہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا آخر اپنے دین کے معاملہ میں ہم یہ ذلت کیوں قبول کریں؟ آپؐ نے فرمایا: میں اللہ کا بندہ اور اس

کا رسول ہوں، اس کی مشیت کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتا اور مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے ضائع نہیں کرے گا۔ روایتوں میں آتا ہے کہ عمرؓ مدتوں نوافل وصدقات کا اہتمام کرتے رہے کہ اللہ تعالیٰ اس گستاخی کو معاف فرمادے جو اس دن شانِ رسالت میں ہوئی تھی۔

مسلمان مضطرب و پریشان تھے، معاہدہ کی حکمت ان کی سمجھ سے باہر تھی، معاہدۂ صلح لکھا جا رہا تھا کہ ابوجندل بیڑیوں میں جکڑے وہاں پہنچ جاتے ہیں، قریش کا وفد مطالبہ کرتا ہے کہ معاہدہ طے ہو چکا ہے از روئے معاہدہ اس شخص کو واپس کرنا ہوگا۔ آپؐ اس مطالبہ کو بھی تسلیم کر لیتے ہیں، مسلمانوں کا اضطراب اور بڑھ جاتا ہے۔ مگر داعیٔ اعظم حضرت ابوجندل کو یہ کہہ کر واپس کر دیتے ہیں کہ!''ابوجندل! صبر سے کام لو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اور تم جیسے مظلوموں کے لیے ضرور کوئی سبیل پیدا فرمائے گا۔ ہمارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو چکا ہے اور ہم معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے''۔

معاہدہ طے ہونے کے بعد آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو قربانی کے جانوروں کو ذبح کرنے اور اپنے بال منڈوانے کا حکم دیا۔ صحابہ کرامؓ کا عالم یہ تھا کہ تین بار حکم دینے کے باوجود کوئی ایک ہاتھ بھی تعمیل حکم میں آگے نہیں بڑھا، چنانچہ آپؐ نے ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے مشورہ پر خود آگے بڑھ کر قربانی کی اور بال منڈوائے پھر صحابہؓ نے بھی آپ کی اقتدا کی۔ قربانی سے فراغت کے بعد مدینہ کا رخ کیا۔ غم سے صحابہ کرامؓ بدحال تھے اور صلح کو اپنی شکست سمجھ رہے تھے چنانچہ راستہ ہی میں سورہ الفتح نازل ہوتی ہے اور خداوند قدوس کی طرف سے اعلان ہوتا ہے کہ یہ صلح جس کو تم اپنی ہزیمت سمجھ رہے ہو یہ فتح مبین ہے، اور بعد کے حالات و واقعات نے واضح طور سے ثابت کر دیا کہ واقعی یہ فتح مبین تھی۔

اس سورہ میں اللہ رب العزت نے بتایا کہ یہ امت، امت دعوت ہے، اس کا عقیدہ پختہ ہونا چاہیے، اس کی ایمانی کیفیت مساوی ہونی چاہیے، اور آزمائشوں پر پوری طرح مطمئن اور ثابت قدم رہنا چاہیے، اس لحاظ سے پوری طرح تیار ہونا چاہیے کہ داعی اعظمؐ کی حکمتِ دعوت کے سامنے اپنی غیرت و حمیت کو قربان کر کے سرِ اطاعت خم کر دے۔ یہ امت اس وقت تک امتِ مسلمہ بن ہی نہیں سکتی جب تک اسے اللہ کے ان فرامین پر یقینِ محکم نہ ہو کہ ''تم کمزوری نہ دکھاؤ، صلح کی بھیک نہ مانگو تم ہی غالب ہو گے، اللہ تمہارے ساتھ ہے وہ تمہاری مساعی کو ضائع نہیں کرے گا'' اور ''اللہ تو غنی و بے نیاز ہے محتاج تو تم ہو، اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے''۔

چنانچہ سورہ شروع ہوتی ہے فتح عظیم، مغفرت اور اتمام نعمت کی بشارت کے ساتھ۔ فتح کا یہ مژدہ

سننے کے بعد یقین کر پانا مشکل ہو رہا تھا کہ اس صلح کو آخر فتح کیسے کہا جاسکتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے رسول اکرمؐ سے پوچھا! کیا یہ فتح ہے؟ اے اللہ کے رسول، آپؐ نے فرمایا؟ انہ لفتح! ایک دوسرے صحابی حاضر ہوئے، انہوں نے بھی یہی سوال دہرایا، آپؐ نے جواب دیا؟ ہاں، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے بلاشبہ یہ فتح ہے۔

اس صلح کے مختلف دعوتی پہلو بیان کیے جاتے ہیں، جن میں سے اہم درج ذیل ہیں:

۱) اس کو قرآن مجید میں اللہ تعالی نے فتح مبین کہا ہے، اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ اس صلح کے نتیجہ میں اسلام کی دعوت اتنی تیزی سے پھیلی کہ فتح مکہ تک صرف دو سال کے عرصہ میں مسلمانوں کی اتنی تعداد ہوگئی جو گزشتہ انیس سال کی جاں گسل محنت کے نتیجہ میں بھی نہیں ہوئی تھی، اس کی دلیل یہ ہے کہ جو قافلہ صلح حدیبیہ کے وقت صرف ڈیڑھ ہزار کے قریب مسلمانوں پر مشتمل تھا، دو سال کے بعد فتح مکہ کے وقت دس ہزار تک پہنچ گیا، اور حضرت خالد بن ولیدؓ اور عمرو بن العاصؓ جیسے عظیم سپہ سالار اس قافلہ کا حصہ بن گئے۔

۲) اہل ایمان و دعوت کے لیے سب سے بڑی مصیبت کفر وفسق کا وہ غلبہ ہوتا ہے، جو بندگی رب کی راہ میں رکاوٹ اور اعلاء کلمۃ اللہ کے راستہ میں مزاحم ہوتا ہے، قرآن مجید اس مصیبت کو ''فتنۃ'' سے تعبیر کرتا ہے، اس صلح اور داعی اعظم کی دعوتی پالیسی وحکمت عملی کی بنا پر اہل اسلام کو اس عظیم فتنہ سے نجات مل گئی، مسلمان ہر خوف، ہر مزاحمت اور ہر طرح کی بیرونی مداخلت سے محفوظ ہو کر اسلامی تمدن وتہذیب کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے آزاد ہو گئے اور انہیں یہ طاقت حاصل ہوگئی کہ اللہ کی زمین پر اللہ کا کلمہ بلند کرسکیں۔

۳) قابل غور بات یہ بھی ہے کہ پہلی بار اہل کفر نے اہل اسلام کی طاقت کو تسلیم کیا اور اپنی طاقت کو تسلیم کرانے کے لیے انہیں کسی کا سہارا نہیں لینا پڑا، تاریخ میں پہلی بار کفار کو احساس ہوا کہ اس جماعت سے مقابلہ کرنا اتنا آسان نہیں ہے، حالانکہ اب تک وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔

۴) اس معاہدہ سے فائدہ اُٹھا کر آپؐ اور آپؐ کی دعوت کو یہ موقع ملا کہ خیبر کے یہودیوں کے خطرہ ومزاحمت سے اسلامی دعوت کے راستہ کو صاف کرسکیں۔

۵) بیت اللہ جس کی زیارت سے آپؐ کو روک دیا گیا تھا، ایک سال کے بعد نہ صرف زیارت کی اجازت حاصل ہوگئی بلکہ تین دن کے لیے مکہ کو مسلمانوں کے لیے خالی کر دینے کا عہد کیا گیا، یہ وہ غیر معمولی انعام تھا جو اس صلح کے نتیجہ میں مسلمانوں کو حاصل ہوا۔

۶) سب سے بڑی بات یہ کہ صلح کی پیشکش دشمن کی طرف سے ہوئی، نبیؐ کو نہیں کرنی پڑی۔

۷)اس صلح کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ عرب جو قریش کو اپنا امام و پیشوا سمجھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ رسولؐ اور ان کے ساتھی زندہ و سلامت لوٹ کر نہیں آئیں گے، انہیں منہ کی کھانی پڑی۔ اس کے نتیجہ میں اسلامی دعوت کی قبولیت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔

۸)اسی معاہدۂ صلح کے نتیجہ میں دعوت اسلام کو وہ خوش گوار ایام دیکھنا نصیب ہوئے جس کو قرآن "یدخلون فی دین اللّٰہ افواجاً" کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔

۹)پھر یہ بھی ہوا کہ دل پر اسلامی تعلیمات کا اثر راسخ ہوا اور مومنین کو "رضی اللّٰہ عن المؤمنین اذ یبایعونك تحت الشجرۃ" کا خطاب اور انعام ملا۔ دلوں پر حکمرانی اور یہ بات کہ اسلامی جماعت اپنے قائد کے اشارہ پر فدا ہونے کو تیار ہو جائے، کتاب دعوت کا اہم باب ہے، یہ اور اس طرح کے متعدد دعوتی پہلو ہیں جو اس واقعہ اور سورہ الفتح کے مطالعہ سے سمجھ میں آتے ہیں اور پھر دلوں میں یہ یقین راسخ ہوتا چلا جاتا ہے کہ جو اللہ کے راستے میں جدوجہد کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کے لیے نئے نئے راستے نکالے گا۔ "والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا" اور " ان تنصروا اللّٰہ ینصرکم"۔

اسلامی تحریکات آج بھی اگر دعوت پر اپنی توجہ مرکوز کر دیں اور اخلاص کے ساتھ کام کریں، تو انہیں اپنی طاقت منوانے کے لیے کسی سہارے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ دنیا خود مجبور ہوگی کہ ان کی طاقت کو، ان کے پرسنل لاء کو، ان کے بنیادی حقوق کو، اور ہر اس حق کو ماننے جو ایک شہری ہونے کی حیثیت سے انہیں حاصل ہے، انہیں ریزرویشن بھی ملے گا، حکومت میں ان کی شرکت بھی ہوگی بلکہ ایک دن وہ اسلامی حکومت تشکیل دینے کی پوزیشن حاصل کر لیں گے۔ عصر حاضر میں اخوان کی دعوتی کوششیں بہترین مثال ہیں کہ وہ کیسی کیسی ہوش ربا آزمائشوں سے گزرے، تعذیب کے کون سے طریقے ہیں جو ان پر آزمائے نہیں گئے، مگر ہر امتحان میں کامیابی سے گذرنے کے بعد بالآخر انہیں اپنی کوششوں کا انعام مل کر رہا۔ دعوت کے راستہ کو چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا گیا تو ہم منزل سے ہمکنار ہونے کے بجائے اور دور ہو جائیں گے۔ اخلاص کے ساتھ دعوت کا کام کرنے کے صلہ میں ہماری آواز دلوں پر دستک دے گی، اور دلوں میں اترے گی۔ یہ بات اچھی طرح ذہنوں میں مستحضر رہنی چاہیے کہ دعوت کے مراحل میں دشمنانِ اسلام نئی نئی حرکتوں اور سازشوں کے ذریعہ اسلامی خیمہ میں اشتعال پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ماضی اور حال دونوں سے اس کی شہادت ملتی ہے۔ ایسے حالات میں ہمارا فرض کیا ہے، صلح حدیبیہ اس کا بہترین نمونہ ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاص کے ساتھ اپنا فرض منصبی سمجھنے اور اسے ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خطبۂ حجۃ الوداع

حقوق انسانی کاعالمی منشور

پروفیسر توقیر عالم فلاحی

ڈین،فیکلٹی آف تھیالوجی،صدر،شعبہ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ(یوپی)

افکار ونظریات اور ادیان ومذاہب کی بزم میں اسلام اللہ رب العزت کا وہ عطا فرمودہ طریقۂ حیات اور ضابطۂ زندگی ہے جو جغرافیائی حدود وقیود سے پرے، رنگ ونسل کے امتیاز سے مافوق، دنیا کے تمام انسانوں کے لیے ہے۔ اللہ رب العزت کی اسی بیش قیمت روحانی نعمت کو مخصوص قوم اور محدود خطہ ارض کے لیے کم وبیش سوا لاکھ انبیاء کرام اپنے اپنے زمانے میں لے کر آتے رہے اور انسانیت کی ہدایت کا عظیم الشان فریضہ انجام دیتے رہے۔ حضرت آدمؑ ہوں یا حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ ہوں یا حضرت موسیٰؑ وعیسیٰؑ، اسی طریقۂ زندگی کے علمبردار(۱) رہے اور اسی طریقہ زندگی کا درس انسانیت کو دیا۔ رشد وہدایت کے مقدس اور مبارک سلسلے کی آخری کڑی نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی ہے جن کے ذریعہ اس نعمت عظمیٰ کی تکمیل ہوئی (۲) اور بارگاہِ رب العزت میں دین اسلام کے ہی شرف قبولیت سے ہمکنار ہونے کا اعلان فرمادیا گیا۔(۳)

قیامت تک کے لیے حذف واضافہ سے پاک اور غیر مبدل ومحرف کتاب قرآن مجید کا خاتم الانبیاء ﷺ پر نزول، تاریخ کی روشن ترین صداقت اور دنیائے انسانیت کا عظیم ترین واقعہ ہے جس نے تیئس سال کی قلیل مدت میں فکر وخیال کی دھاراؤں کا رخ موڑ دیا، صدیوں سے تمام قسم کی خباثتوں اور رذالتوں میں ملوث اور وحشت ودرندگی کی خوگر قوم کو جینے کا سلیقہ سکھایا، انسانیت، محبت اور سیادت وقیادت کے ایسے زریں اسباق سکھائے کہ وہ قوم دنیائے انسانیت کے لیے قابل رشک اور لائق تقلید بن گئی۔ یہ کتاب سراپا ہدایت (۴)، رحمت (۵)، شفاء(۶) تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لانے والی (۷) اور تمام معاملات زندگی میں راست روی (۸) کی نقیب وپاسباں ہے۔ خاتم الانبیاء ﷺ پر

اس کتاب کا نزول اس صداقت پر بین دلیل ہے کہ قیامت تک اب رب العالمین کی طرف سے نہ ہی کوئی نبی آئے گا اور نہ ہی کوئی نوشتۂ ہدایت آئے گا، اس لیے اس کتاب کے پوری انسانی برادری کے لیے ضابطۂ زندگی اور اس کے عظیم المرتبت حامل محبوب خدا، سید المرسلین ﷺ کے پوری دنیائے انسانیت کے لیے ہادی و مرشد ہونے کی بات ناقابل تردید حقیقت بن جاتی ہے۔ قرآن مجید جب پوری انسانی برادری کے لیے ہے(۹) تو اس میں بھی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ آپ ﷺ کی سیرت پاک بھی یا آپ ﷺ کی تعلیمات بھی پوری انسانی برادری کے لیے ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ رسول اللہ کی اطاعت کا بہ تکرار حکم کیا جانا، (۱۰) رسول اللہ ﷺ کی اتباع کو اللہ کی محبت کی دلیل قرار دیا جانا (۱۱)، وحیٔ الٰہی کے مطابق رسول اکرم ﷺ کی گویائی کا اعلان (۱۲) اور اخلاق حسنہ کی انتہائی بلندی پر آپ کے متمکن ہونے کا اعلامیہ (۱۳)، آپ ﷺ پر اللہ رب العزت کی مخصوص عنایت و التفات کا اظہار، (۱۴) آپ کی انتہائی موقر و محترم شخصیت کے قانون ساز ہونے کی بندگان خدا کو تعلیم و تذکیر (۱۵) اور ساری دنیا کے لیے آپ کے سراپا رحمت (۱۶) اور معارف الٰہیہ کے شارح اور مفسر ہونے کی سند (۱۷)، یہ سارے حقائق اس امر کو تشنۂ وضاحت نہیں چھوڑتے کہ آپ ﷺ کی شخصیت عالمگیر کتاب ہدایت کی تفسیر ہے اور ہر اس شخص کے لیے بہترین نمونہ عمل ہے جو اللہ کی رضا اور آخرت کی فوز و فلاح کا امیدوار ہو جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوْ اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الآخِرَ وذَكَرَ الله كَثِيْراً۔ (۱۸)

[بالیقین تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول ﷺ میں ایک بہترین نمونہ ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخرت کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔]

آج پوری دنیا میں حقوق انسانی کا موضوع دلچسپ اور مرکز توجہ بنا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں ہفتہ اور عشرہ تقریبات منائی جا رہی ہیں، مقالات اور کتب منظر عام پر آ رہے ہیں، سمینار اور سمپوزیم منعقد کیے جا رہے ہیں۔ علاقائی، ضلعی، صوبائی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر پر جوش مذاکرات ہو رہے ہیں، لیکن سچ تو یہ ہے کہ حقوق انسانی کے پرچم تلے پامالیٔ حقوق کے المناک اور دلدوز مظاہر سامنے آ رہے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ ہر فرد اور ہر گروہ، ہر قوم اور ہر ملک اپنے حقوق کی بازیافت کے لیے تو کوشاں اور سرگرم عمل ہے، لیکن دوسروں کے تئیں اپنے فرائض کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک خطہ دوسرے خطہ پر،

ایک قوم دوسری قوم پر، ایک مذہب دوسرے مذہب پر اور ایک ملک دوسرے ملک پر جارحانہ اقدامات اور غاصبانہ کارروائیوں کو طرۂ امتیاز قرار دیتا ہے اور نتیجہ یوں سامنے آتا ہے کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ خالق کائنات کے سلسلے میں صاف وشفاف تصور رکھنا اور خالق ومخلوق کے رشتے کو عبد ومعبود کے رشتے سے تعبیر کرنا، دنیا کے تمام انسانوں کو ایک ہی ماں باپ کی اولاد قرار دیا جانا اور اس بنا پر عالمگیر اخوت ومحبت کے رشتے سے تمام بنی نوع انساں کو منسلک کر دینا، اس دنیائے فانی اور یہاں کی زوال پذیر لذتوں کے بعد ابدی اور لافانی دنیا اور وہاں کی دائمی لذتوں کے تصور کو فروغ دینا، زندگی کو امانت سمجھتے ہوئے زندگی دینے والے کے سامنے جوابدہی کا احساس وشعور پیدا کرنا۔ ہر فرد بشر اور ہر گروہ انسانی کی عزت وناموس کی حفاظت اور اس کی جان ومال کی حرمت کی تعلیمات گوش گزار کرنا اور معاشرۂ انسانی کے اہم ترین عنصر، خواتین کی عظمت اور ان کے حقوق ومراعات کی نگہداشت کا علم اٹھانا، یہ وہ بین اور درخشاں تعلیمات ہیں جن کو کماحقہٗ جامۂ عمل پہنا دیا جائے تو یقینی طور پر انسانی معاشرہ ہمدردی ومحبت، عدل وانصاف، اخوت وبھائی چارگی، امن وآشتی اور خیر وفلاح کا نقیب وعلمبردار بن جائے گا اور انفرادی واجتماعی طور پر انسان ایک دوسرے کی عظمت ورفعت کا پاسبان بن جائے گا۔

تمام انسان اللہ کے خاندان کے لوگ ہیں۔(۱۹) اللہ سے محبت کی دلیل یہ ہے کہ اللہ کے بندوں سے محبت کی جائے اور ان کے ساتھ رحمت ورأفت، عدل ومساوات اور ہمدردی وغمگساری کا معاملہ کیا جائے۔ بندوں کا حق ہے کہ ان کی جان، مال اور عزت وآبرو کی حفاظت کی جائے۔ سارے بندگان خدا ایک دوسرے کے کسی نہ کسی حد تک حسن سلوک اور محبت کے محتاج ہیں۔ اسی طرح سارے بندگان خدا پر کسی نہ کسی حد تک فرائض ہیں اور ان کی ادائیگی کے بغیر وہ اللہ کی بارگاہ میں بری الذمہ قرار نہیں دیے جا سکتے۔ حقوق العباد کے تلف کرنے یا حقوق انسانی کی پامالی پر جس سنگین صورت حال سے ایک شخص کو سابقہ پڑے گا اس کی تصویر کشی سرور کونین ﷺ کے ان الفاظ سے ہوتی ہے:

قَال أتَدْرُوْنَ مَا الْمُفْلِسُ قَالُوا المُفْلِسُ فِيْنَا مَنْ لاَ دِرْهَمَ لَهُ وَلاَمَتَاعَ فَقَالَ انّ الْمُفْلِسَ مِنْ امّتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِصَلوٰةٍ وَصِيَامٍ وزَكوٰةٍ وَيَاتِي قَدْ شَتَمَ هذَا وَقَذَفَ هذا وَأَكَلَ مَالَ هذَا وَسَفَكَ دَم هذَا وَضَرَبَ هذَا فَيُعْطِيْ هذَا مِنْ حَسَنَاتِهِ وَهذَا مِنْ حَسَنَاتِه فَاِن فَنِيَتْ حَسَنَاتُه قَبْلَ اَن يُّقْضٰى مَاعَلَيهِ اُخِذَ مِنْ خَطَايَاهمْ فَطُرِحَتْ عَلَيه ثُمَّ طُرِحَ فِي النَّار۔(۲۰)

[رسول اکرم ﷺ نے دریافت کیا کہ لوگو! جانتے ہو مفلس کون ہے؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ ہمارے درمیان مفلس وہ ہے جس کے پاس مال و درہم نہیں ہے، اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کا مفلس دراصل وہ ہے جو روز قیامت نماز، روزہ اور زکوٰۃ کے ساتھ اس حال میں آیا ہو کہ اس نے کسی کو گالی دی ہو، کسی پر بہتان لگایا ہو، کسی کا مال اور کسی کا خون بہایا ہو اور کسی کو مارا ہو، پس جن جن پر ظلم ہوا ہوگا ان کے پلڑے میں اس ظالم (جو نمازی، روزہ دار اور صاحب زکوٰۃ تھا) کی نیکیاں ڈال دی جائیں گی۔ اگر مظلومین کے حساب چکائے جانے سے قبل ظالم کی نیکیاں ختم ہو جائیں تو اب مظلوموں کی خطائیں (ظلم کے بقدر) اس ظالم کے پلڑے میں ڈال دی جائیں گی، یہاں تک کہ اسے جہنم میں جھونک دیا جائے گا]

آج پوری دنیا میں انسانی حقوق کی بحالی کی جو بھی تحریکیں چل رہی ہیں یا اس سے متعلق جو مساعی انجام دی جارہی ہیں، بلاشک وتردد لائق ستائش اور قابل مبارک باد ہیں۔ لیکن ہر چہار جانب حقوق انسانی کے تحفظ کی گونج کی وجہ صرف یہ ہے کہ انسان اپنے حقوق کے تئیں تو بہت چاق و چوبند ہے اور اس کی یافت میں سرگرمیٔ عمل کا خوب سے خوب تر مظاہرہ کرتا ہے لیکن اپنے فرائض وواجبات کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے اور دوسروں کے حقوق ادا کرنے سے متعلق یکسر غافل وکوتاہ رہتا ہے۔

اس کائنات کا شاہکار (Masterpiece) انسان ہے اور کائنات کے مالک حقیقی کا دیا گیا محفوظ ومامون اور آفاقی ضابطۂ زندگی (Universal Code of Life) قرآن مجید کا موضوع بھی انسان ہے۔ قرآن مجید کی ساری تعلیمات انسانوں کو حقوق وفرائض کا علمبردار و پاسباں بنا کر اس سعادت وکامرانی کی ضمانت دیتی ہیں جو دنیا کی فانی وتغیر پذیر لذتوں اور آسائشوں اور موت کے بعد کی زندگی کی ابدی اور لازوال راحتوں اور مسرتوں کو محیط ہے۔ خاتم الانبیاء رسول عربی ﷺ چونکہ رہتی دنیا تک کے لیے آفاقی اور عالمگیر کتاب کے حامل وترجمان ہیں (۲۱) بلکہ قرآن مجید کی عملی تفسیر ہیں، آپ ﷺ کی ذات گرامی موجودات عالم کے لیے رحمت ہے، (۲۲) آپ کی بعثت مبارکہ ملک ووطن اور قوم ونسل سے پرے قیامت تک کی انسانی برادری کے لیے ہے، اس لیے آپ ﷺ کی تعلیمات بھی آفاقی ہیں اور بلاشک وتردد جغرافیائی حدود وقیود سے بالا اور رنگ ونسل کے امتیاز سے مافوق انسانی برادری کا ہر شخص وگروہ ان تعلیمات نبوی کا مخاطب ہے۔ یوں بھی اس کی تعبیر کی جاسکتی ہے کہ تعلیمات نبوی کا فیض انسانی

برادری کے ہر طبقہ، ہر گروہ اور ہر مسلک کے لیے ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی ذات کی عظمت کا راز اسی میں مضمر ہے کہ آپ ﷺ کی سیرت طیبہ صرف مسلمانوں کے لیے نہیں ہے اور نہ ہی آپ ﷺ کی ذات سے عقیدت کا حق صرف کلمۂ طیبہ کے بول بول کر حلقۂ اسلام میں شامل ہونے والوں کو ہے۔ اللہ رب العزت کی محبت کا دعویٰ اس صداقت سے آشکار ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول سے محبت ہو۔ (۲۳) اور یہ بھی سچ ہے کہ رسول ﷺ سے جس کو محبت ہوگی، آپ ﷺ کے گفتار و کردار اور آپ ﷺ کے طریقہ سے بھی لازماً محبت ہوگی، جبھی حقیقی معنوں میں محبوبیت الٰہی کی سند سے سرفرازی حاصل ہو سکے گی۔

یوں تو سرورِ کونین اور خاتم الانبیا ﷺ کی تریسٹھ سالہ حیات مبارکہ کا ایک ایک روزنامچہ اتنا صاف وشفاف اور روشن وتاباں ہے کہ اس پر دوست اور دشمن دونوں طرف سے انگشت نمائی بعید از قیاس ہے۔ اگر کوئی فرد یا معاشرہ صحیح معنوں میں ان روزناموں کے مشتملات کو اپنی زندگی کا لائحۂ عمل بنالے تو وہ صبر وقناعت، امن وعافیت اور انسانیت نوازی وبشر دوستی کی نعمتوں سے مالا مال ہو کر اس فانی اور زوال پذیر زندگی کو بھی خوشگوار بنالے اور آخرت کی سرمدی کامیابی کی کلید بھی اس کے ہاتھ آجائے۔

دس ہجری کا حج رسالت مآب ﷺ کا پہلا اور آخری حج تھا جو حجۃ الوداع سے موسوم ہے۔ عرفات کے میدان میں فدایانِ اسلام اور آپ کے معزز رفقاء کی تعداد کم وبیش سوا لاکھ تھی۔ اس موقع پر آپؐ نے جو خطبہ دیا تھا اس کے مباحث ومشتملات تاریخی، ہمہ گیر اور آفاقی ہیں اور جو حجۃ الوداع کے نام سے معروف ہے، جس میں عدل وانصاف کا ہر پیامی، اخوت ومساوات کا ہر علمبردار، انسانی عظمت ورفعت کا ہر نقیب اور حقوقِ انسانی کا ہر مداح وپاسباں، معاشرہ انسانی کو امن وعافیت کا گہوارہ بنانے کے لیے وافر مواد پاتا ہے، بشرطیکہ وہ مفروضات وتحفظات (Suppositions and Reservations) سے قطع نظر اور تعصب وجانب داری کی عینک اتار پھینک کر حقائق ومعارف سے آگہی حاصل کرنے کا متمنی اور خاتم الانبیاء محمد عربی ﷺ کے دیے گئے نقوش راہ کے مطابق سعی وعمل کا خواہاں وخوگر بن جائے۔

آج معاشرۂ انسانی جن مختلف برائیوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے، ان میں نقض عہد اور خباثت عام ہے۔ معاشرہ چاہے ایمان سے شرف یاب ہونے والوں کا ہو یا ایمان وایقان کی نعمت سے محروم افراد اور طبقہ انسانی کا، انفرادی طور پر ہو یا اجتماعی طور پر، ہر زاویے سے کم وبیش ہر فرد وجماعت اس مرض کے چنگل میں ہے۔ اس برائی کا مرتکب یا اس مرض کا گرفتار شخص صرف اپنی ذات پر ہی اثر نہیں چھوڑتا بلکہ اعزہ واقرباء اور اغیار واجانب بھی اس سے متأثر ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے قربت ومحبت کے

بجائے بغض ونفرت میں اضافہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی امانتوں کی عدم ادائیگی اوراس قسم کے طرزِ عمل پر اصرار کرنے کے نتیجے میں آپسی تعلقات مجروح ہوتے ہیں اور مخالفت ومخاصمت سے بڑھ کر ایک دوسرے کی ہلاکت وبربادی کے کریہہ اور دلدوز واقعات بھی مشاہدے میں آتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر امانتوں کی حفاظت کی جائے اور امانت صاحب امانت تک پہنچ جائے تو ایک دوسرے کی چیزوں کی حفاظت بھی ہوتی ہے، تعلقات میں بھی خوشگواری پیدا ہوتی ہے، ایک دوسرے پر اعتماد بڑھتا ہے اور ماحول ومعاشرہ خوشگوار حالات سے ہمکنار ہوتا ہے۔ کتاب الٰہی میں امانتوں کی ادائیگی سے متعلق یہ فرمان واضح ہے:

اِن اللّٰہَ یَامُرُکُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوۡ الۡاَمٰنٰتِ اِلٰیٓ اَھۡلِھَا۔ (۲۴)

[یقیناً اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو۔]

دینداری دو قسم کے حقوق کی ادائیگی سے عبارت ہے، ایک کو حقوق اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور دوسرے کو حقوق العباد سے۔ دوسرے قسم کے حقوق کو عصر حاضر میں حقوق انسانی (Human Rights) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اللہ پر ایمان خالص، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے علاوہ تلاوت کلام پاک، اوراد ووظائف کا اہتمام وغیرہ حقوق اللہ میں ہیں۔ کتاب اللہ کی تعلیمات اس سلسلے میں بہت واضح ہیں کہ اللہ رب العزت مستغنی وبے نیاز ہے اور ساری دنیا اس کی نیازمند ہے اور دنیا کے تمام شاہ وگدا اسی ذات واحد کے محتاج اور بھکاری ہیں۔ چنانچہ ذات باری تعالیٰ سے متعلق حقوق کی ادائیگی میں اگر تقصیر ہوگئی ہے تو اس کی صفت استغناء اور شان رحمانیت سے امید کی جاتی ہے کہ اس قسم کی کوتاہیوں پر وہ خط عفو پھیر دے گا۔ اس کے برعکس اللہ کے بندوں کے حقوق سے غفلت وبے اعتنائی اور کمی وکوتاہی بہت ہی سنگین بن جاتی ہے۔ اللہ کے بندے خواہ والدین کی شکل میں ہوں یا بھائی بہن اور اعزہ واقارب کی شکل میں، احباب ورفقاء ہوں یا اغیار واجانب، ایمان وایقان کی نعمت غیر مترقبہ سے بہرہ ور حضرات ہوں یا کفر وشرک کی آلائشوں میں ملوث افراد، طبقۂ انسانی کے یہ تمام افراد ایک دوسرے کے تئیں حقوق وفرائض رکھتے ہیں۔ ان کے حقوق کے تئیں فرائض وواجبات کی ادائیگی میں اگر کوتاہی ہوئی اور اسی دنیا میں اگر تلافیٔ مافات نہیں ہوئی تو قرآن وسنت کی تعلیمات اس سلسلے میں بہت واضح ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے متعلق سارے حقوق کی ادائیگی کے باوجود یوم الجزاء (The Day of Judgment) میں اس کی خستہ حالی اور دیوالیہ پن قابل دید ہوگی۔

خاتم الانبیاء ﷺ وحی الٰہی کے ترجمان ہیں۔ آپ ﷺ کے فرمودات اللہ رب العزت کی رضا

وخوشودی کی سند ہیں، اس لیے کہ آپ ہوائے نفس سے تکلم نہیں فرماتے (۲۵) اور آپ کی اتباع میں خالق دو جہاں اور رب العالمین کی خوشنودی کا راز مضمر ہے۔ حیات طیبہ کی تئیس سالہ مدت میں عرب وعجم میں دین اسلام کے غلبہ وتمکنت کا جو پرچم آپ نے لہرایا تھا اور تاحین حیات بنی نوع انساں کی رشد وہدایت اور ان کی کامیابی وکامرانی کے تئیں جس فکر واضمحلال اور اضطراب و بے چینی کا سراپا مجسم بنے ہوئے تھے، آپ کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ الوداعی حج کے موقع پر آپ انسانیت کو اپنے فرمودات کی شکل میں الٰہی ضابطہ حیات کی تفسیر وتذکیر نہ فرماتے:

آپ ﷺ نے **امانتوں کی ادائیگی** سے متعلق فرمان باری تعالیٰ کی تذکیر کرائی اور 'رحمۃ للعالمین' کی حیثیت سے ساری دنیا کے اس نمائندہ اجتماع اسلامی کو جو پیغام دیا تھا اس میں ایک بہت جامع تعلیم یہ تھی:

فَمَنْ كَانَتْ عِنْدَهُ أَمَانَةٌ فَلْيُؤَدِّهَا إِلَى مَنِ ائْتَمَنَه عَلَيْهَا۔ (۲۶)

[پس جس کے پاس کوئی امانت ہو، اسے چاہیے کہ صاحب امانت تک اسے پہنچا دے۔]

امانت سے مراد ایک تو وہ امانت ہے جو مال واسباب اور زر وزمین کی شکل میں ایک دوسرے کے حوالے کی جاتی ہے۔ اس شکل میں امانت کی حفاظت سے مراد یہ ہوگی کہ اس کی تاحد امکان حفاظت کی جائے، اس میں قطع وبرید اور حذف واضافہ روا نہ رکھا جائے، اپنی جان ومال کی طرح اس کی حفاظت کی جائے اور اس کی وقت پر ادائیگی میں لیت ولعل اور قیل وقال سے کام نہ لیا جائے اور نہ ہی کوئی عذر لنگ (Lame Excuse) پیش کیا جائے۔

امانت کے اس جامع لفظ میں یہ **مفہوم شامل** ہے کہ انسان کا مال، جان، وقت اور ساری نعمتیں اللہ کی دی ہوئی ہیں، انسان ان کا مالک نہیں ہے۔ یہ بیش بہا نعمتیں جس منعم حقیقی نے عنایت کی ہیں اسے اس سے متعلق پوچھنے کا بلا شک وریب حق حاصل ہے۔ اسی لیے تو فرمایا:

ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ۔ (۲۷)

[پھر تم سے اس دن نعمتوں کے بارے میں ضرور پوچھا جائے گا۔]

انہی نعمتوں کی بابت رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس آخری خطبہ سے پہلے بھی ارشاد فرمایا تھا کہ زندگی کو موت سے پہلے، جوانی کو بڑھاپے سے پہلے، صحت کو مرض سے پہلے، فرصت کو مشغولیت سے پہلے اور غنا کو فقر سے پہلے غنیمت جانو۔ (۲۸) اسی طرح ایک موقع پر آپ کا ارشاد تھا کہ ہر بندے سے پوری

زندگی، جوانی، دولت کمانے، دولت خرچ کرنے اور علم کے مطابق عمل کرنے کے بارے میں یقینی طور پر پرسش ہوگی۔(۲۹) گویا اس پہلو سے امانت کی ادائیگی کا مفہوم یہ ہوگا کہ ان امانتوں کا استعمال اللہ کی مرضی کے مطابق ہوا یا نہیں، کیونکہ یہ بات معروف ہے کہ امین مالک نہیں ہوتا بلکہ مالک کی مرضی کے تابع ہوتا ہے۔

تیسرا اور مہتم بالشان مفہوم یہ ہے کہ جان، مال، وقت، جوانی اور فرصت وغیرہ یہ سب مادی اور زوال پذیر نعمتیں ہیں۔ سب سے بڑی نعمت تو وہ نعمت ہے جو آدمی کو انسان بنادے یا دوسرے الفاظ میں اس نعمت کی تعبیر یوں کی جاسکتی ہے کہ جو انسان کو انسانیت کی معراج تک پہنچادے۔ اللہ رب العزت کی عطا کردہ نعمتوں میں دین و مذہب سب سے اعلیٰ و افضل اور مستحکم و پائیدار نعمت ہے۔ مذہب اسلام کو اللہ کی بارگاہ میں قبولیت کا شرف حاصل ہے۔ اس کے علاوہ جتنے ادیان و مذاہب ہیں وہ یا تو انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں یا پوری انسانی برادری کے لیے منتخب کیے گئے مذہب میں حذف و اضافہ اور تغیر و تبدل کا شکار ہیں۔ دنیا میں بشمول دیگر کتب الٰہیہ اور صحف سماویہ کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس کے خالق و مالک نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہو۔ واحد قرآن مجید وہ کتاب الٰہی ہے جس کی حفاظت کا ذمہ اللہ رب العزت نے لیا(۳۰) اور ساڑھے چودہ سو سالہ اس چیلنج کو ایک حرف اور ایک نقطے کی بھی تبدیلی سے پامال نہیں کیا جاسکا۔ اسی کتاب میں دین اسلام کے مکمل اور خالق کائنات کا پسندیدہ ہونے کا اعلان ہوتا ہے۔(۳۱) اسی کتاب الٰہی اور عالمگیر ضابطۂ زندگی میں یہ اعلان بھی ہے کہ یہی دین و طریقۂ زندگی حضرت آدمؑ کا بھی تھا، حضرت نوحؑ کا بھی تھا اور یہی طریقۂ حیات حضرت موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو بھی دیا گیا تھا اور سب کو اسی کے عام کرنے بلکہ قائم کرنے کی وصیت کی گئی تھی۔

اس سیاق و سباق میں امانتوں کو صاحب امانت تک پہنچانے کے اس پیغام نبوی ﷺ کی حقیقت یوں آشکار ہوتی ہے کہ **اسلام اہل اسلام کے لیے** اللہ رب العزت کی طرف سے **امانت عظمیٰ** ہے اور یہ کہ مسلمان اس دین و مذہب کے وارث اور مالک نہیں ہیں۔ یہ اسلام پوری دنیا کے لیے ہے جس کی جا بجا وضاحت اس کے مستند ترین منشور قرآن مجید سے ہوتی ہے۔ چنانچہ کلمۂ طیبہ کے انقلابی بولوں کے ذریعہ حلقۂ اسلام میں شامل ہونے والے افراد اور جماعتوں کی حیثیت اللہ رب العزت کے اس دین حنیف کے امینوں کی ہے، اور یہ امانت ان بندگان خدا تک پہنچائی جائے گی جو اس کی دانستہ یا نادانستہ ناقدری کررہے ہیں یا جو کسی وجہ سے بھی اللہ کے دین کی قبولیت اور اس کی عظیم ترین روحانی نعمت سے محروم

ہیں۔امین ہونے کی حیثیت سے یہ ذمہ داری امت مسلمہ کے ہر ہر فرد پر ہے، اس لیے کہ اس دین حنیف سے جڑنے اور اس عظیم ترین نعمت سے شرف یاب ہونے کے بعد حیثیت واستعداد کے مطابق ہر فرد امت کو پوری انسانی برادری کی نفع رسانی کے لیے فکر مند بنایا جاتا ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی شکل میں اس فرض منصبی سے عہدہ برآ ہونے کی تلقین کی جاتی ہے۔(۳۲)

انسانوں کے مال، جان اور عزت کا احترام دنیا کے اہم ترین مسائل میں ہے۔آج انسانی جان کی حرمت ختم ہوچکی ہے، اس کی عزت سے کھلواڑ کیا جا رہا ہے، اس کی دولت پر غاصبانہ حملے ہو رہے ہیں، دہشت گردی کے انسداد کے پرچم تلے بڑے پیمانے پر دہشت گردی کی جارہی ہے، جمہوریت کی بحالی کے سبز باغ دکھا کر لاکھوں انسانوں کی جانیں لی جارہی ہیں، انسانوں کی عزتوں کا سودا کیا جا رہا ہے اور ان کے مالوں کو ہڑپ کیا جا رہا ہے۔ایسے حالات میں پوری دنیا کو بالعموم اور مخالفین اسلام کو بالخصوص مذہب اسلام کی اس درخشاں اور انسانیت نواز تعلیم پر دعوت فکر وعمل دی جاتی ہے کہ ایک انسان کا خون ناحق ساری انسانیت کے قتل کے برابر ہے۔اسی طرح ایک انسان کو بچالینا یا اس کی زندگی کا سبب بننا ساری انسانیت کو زندگی دینے کے مترادف ہے(۳۳)۔اسی طرح عزتوں کی پامالی کی بات ہو یا مال وجائیداد پر ناحق قبضہ کا معاملہ، اس سلسلے میں اسلام کی روشن تعلیم قابل ملاحظہ ہے کہ اسلام کسی قسم کے ظلم کو برداشت نہیں کرتا اور ظالم کے ظلم کو شہ نہیں دیتا۔عزت وعفت کی پامالی اور مال وجان کی بے حرمتی کے اس تناظر میں آخری حج کے موقع پر رسالت مآب ﷺ کا یہ فرمان انسانی حقوق کی ایک اہم دفعہ کے طور پر احادیث کے مجموعوں اور تاریخ وسیر کے صفحات کی زینت ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

> اِنَّ اَموَالَکُم وَدِمَاءَکُم واَعرَاضَکُم عَلَیکُم حَرامٌ کَحُرمَةِ یَومِکُم هذَا فِی بِلَدِکُمُ هَذا فِی شَهرِکُم هذا۔(۳۴)
>
> [پس یقیناً تمہارے مال، تمہارے خون اور تمہاری عزتیں تم میں سے ایک دوسرے کے لیے اسی طرح محترم ہیں، جیسے تمہارے اس دن کی حرمت تمہارے اس شہر میں اور تمہارے اس مہینے میں ہے]

اگر موت کے بعد کی زندگی کے سلسلے میں استحضار ہو اور اپنے خالق حقیقی کے سامنے اپنے اعمال وافعال کی جوابدہی کا یقین ہو تو بلاشبہ انسان اس دنیا میں ذمہ دار اور جوابدہ کی حیثیت سے اپنی زندگی گزارے گا۔جس طرح امتحان ہال میں ایک ایک منٹ کا حساب ایک لائق اور ذمہ دار طالب علم رکھتا

ہے اسی طرح اگر دنیا کے اس امتحان ہال میں اسی کیفیت کے ساتھ انسان زندگی گزارے تو تقصیرات اور خطائیں تو ہوسکتی ہیں لیکن ان پر جرأت وڈھٹائی کا مظاہرہ نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی ایک انسان دوسرے انسان کے تئیں درپۂ آزار ہوسکتا ہے۔ اس لیے کہ موت کے بعد کی زندگی میں ایک طرف خالق ومالک کے سامنے اسے جوابدہ ہونے کا احساس وشعور مہمیز کرتا ہے اور دوسری طرف وہ اس دارالعمل یا دارالامتحان سے گزر کر اصل فوز وفلاح کی منزل سے ہمکنار ہونا چاہتا ہے۔ حقوق انسانی کے اسی پہلو پر آپ ﷺ کے اس تاریخی خطبہ کی یہ عبارتیں شاہد عدل ہیں:

اَلَا لَاتَرجِعُوا بَعدِی ضَلَالاً یَضرِبُ بَعضُکُم رِقَابَ بَعضٍ وسَتَلقَونَ رَبَّکُم فَیَسئَلُکُم عَن اعمَالِکُم۔ (۳۵)

[سنو! میرے بعد گمراہ نہ ہوجانا کہ خود ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو، تم کو خدا کے سامنے حاضر ہونا پڑے گا، پھر وہ تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس کرے گا۔]

آج کا انسان رنگ ونسل، علاقہ وبرادری اور مسلک ومکتبۂ فکر کے حصار میں اس طرح مقید ہے کہ قابلیت واستعداد اور سیرت وکردار کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے۔ اور انسان جو مذہب اسلام کے مستند ترین ضابطۂ زندگی قرآن مجید کے مطابق عالمگیر برادری کے رشتے سے منسلک تھا، وہ جغرافیائی حدود وقیود اور رنگ ونسل کے فروق وامتیازات کا اسیر بن گیا ہے، چنانچہ وہ اسی نہج سے اپنے معاملات ومسائل کی عقدہ کشائی کے لیے متحرک اور سرگرم عمل رہتا ہے۔ بلاشبہ علم وسائنس کی دنیا میں تو آج کا انسان حذق ومہارت اور صلاحیت واستعداد کا علم بردار بن رہا ہے، لیکن اس ظاہری اور مادی زاویۂ نگاہ کی بنا پر وہ اپنے آپ کو اپنے خالق کا محبوب نہیں بنا سکتا اور سچ تو یہ ہے کہ ان تباہ کن امتیازات کو مٹایا نہیں جاسکتا جو پوری دنیا کو ایک توانا عفریت کی شکل میں اپنے خونخوار چنگل میں لیے ہوئے ہیں۔ آج کی جدید جاہلیت میں انہی جغرافیائی حدبندیوں، خطہ اور علاقہ کی بندشوں اور برادری ومسلک کے بے جا حصار نے نفرت وعداوت، بغض وحسد اور کینہ وکدروت کے مسموم جذبات واحساسات کو شہہ دی ہے جن کے تلخ نتائج ضلعی، صوبائی، ملکی اور بین الاقوامی طور پر تصادم وآویزش کی شکل میں دعوت ملاحظہ دیتے ہیں۔ نزاکت حالات اور سنگینئ وقت کا تقاضا ہے کہ بھائی چارگی کے اس آفاقی رشتے کو مضبوط ومستحکم کیا جائے جو پوری دنیا کے تمام انسانوں کو ایک ہی ماں باپ کی اولاد قرار دیتا ہے اور ان کے ساتھ اسی حسن سلوک کی تلقین کرتا ہے جو مادی اور خونی رشتے کے بھائی بہنوں میں مطلوب ومقصود ہے۔ انتشار وتشتت، نفرت

وعداوت، بغض وحسد اور تمام قسم کے اخلاقی رذائل میں ملوث انسانی برادری کے لیے رسول اکرم ﷺ کے الوداعی خطبہ کے یہ الفاظ مژدۂ جانفزا ہیں:

اَيُّهَا النَّاسُ اَلَا اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَاِنَّ اَبَاكُمْ وَاحِدٌ اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لأَحْمَرَ عَلٰى أَسْوَدَ وَلَا لأَسْوَدَ عَلٰى أَحْمَرَ إلا بِالتَّقْوٰى۔(۳۶)

[اے لوگو! سنو، تم لوگوں کا رب ایک ہے اور تم لوگوں کا باپ ایک ہے۔ سنو، کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے اور کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، مگر (یہ فضیلت) تقویٰ کی بنیاد پر ہوگی۔]

جدید دور میں ہر جگہ **وصف و استعداد** اور **لیاقت و صلاحیت** کے راگ الاپے جا رہے ہیں اور اس کو معیار مطلوب بنا کر کسی شعبہ، ادارہ، تحریک اور ملک کو ترقی کے گام پر لانے کی سعی مسلسل کی جا رہی ہے، چاہے عملی طور پر اس مطلوب و مقصود ثانہ سے انحراف کی بنا پر نتیجہ خیز اور خاطر خواہ فائدہ حاصل نہ ہو رہا ہو۔ اگر انسانوں کو ایک ماں باپ کی اولاد سمجھتے ہوئے رشتۂ اخوت کو مضبوط و مستحکم کرلیا جائے اور جغرافیائی، نسلی اور گروہی امتیازات کو کالعدم قرار دیتے ہوئے **خشیت الٰہی** یا **خوف خدا** کو اصل معیارِ زندگی قرار دے کر (۳۷) انسانوں کے درمیان خط امتیاز قائم کیا جائے اور خوف خدا کے اس خدائی قانون کی پاسداری کو تعصّبات اور مفروضات سے پرے ہو کر لائحۂ عمل قرار دے لیا جائے تو بعید نہیں کہ صوبوں، قوموں اور ملکوں کے درمیان نفرت وعداوت کی سلگتی ہوئی بھٹیاں سرد پڑ جائیں، انسان اپنے آپ کو ایک ماں باپ کی اولاد سمجھتے ہوئے شیر و شکر ہو کر ملک و قوم کی ترقی کا خواہاں و خوگر ہو جائے اور پوری دنیا میں امن و عافیت اور سلامتی و محبت کا نقیب و علمبردار بن کر اس دنیا کو جنت نشاں بنا دے۔

تقویٰ اور خوف خدا سے متعلق قرآنی آیات اور احادیث شریفہ بالخصوص حجۃ الوداع کے موقع پر بطور وصیت زبان مبارک سے نکلے ہوئے یہ الفاظ پوری دنیا کے انسانوں کو مخاطب بناتے ہیں، اور سچ تو یہ ہے کہ اگر انسان کا دل اپنے حقیقی خالق کی خشیت یا خوف خدا کا نشیمن بن جائے تو خواہ شب تاریک کی تنہائی ہو یا روشن دن کی ہماہمی اور اژدحام عام، بند کمرہ یا کوٹھری ہو یا کھلا میدان اور وسیع و عریض شاہراہ، دن کی روشنی ہو یا رات کی تاریکی، آبادی ہو یا ویرانہ، ہر جگہ ایسا فرد اپنے خالق و مالک کی مرضی کا تابع ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے حکومت کا کوئی قانون، پولیس کا کوئی ڈنڈا، معاشرے کی کوئی روایت، احباب

ورفقاء کی رو رعایت اور اغیار واجانب کا خوف وخطر، یہ ساری چیزیں انسان کو محدود وقت میں مخصوص مقامات پر تو برائیوں سے روک سکتی ہیں لیکن ہمہ وقت برائیوں سے نبرد آزما ہونے اوران کے خلاف محاذ آرائی کرنے کا سلیقہ خوف خدا کی شکل میں خدا کا قانون ہی سکھاتا ہے (۳۸) اس لیے کہ یہ قانون جسم پر حکمرانی نہیں کرتا بلکہ مزاج، طبیعت اور دل پر حکمرانی کرتا ہے۔ اسی لیے انسان کو یہ اندر سے بدل دیتا ہے اور حقیقی معنوں میں برائیوں سے گریزاں ومجتنب اور اچھائیوں کا داعی وشیدائی بنادیتا ہے۔

انسانوں کے مابین فضیلت وبرتری اسی قانون کی پاسداری کی بنا پر ہے۔ انسانوں کے مابین مساوات اور فضیلت کے باب میں قرآن وسنت کا موقف بہت واضح ہے۔ اقتصادیات یا دیگر معاملات زندگی کے مثبت یا منفی، اچھے یا برے اور خوب یا خوب تر نتائج اپنے اعمال وافعال کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ یہ معقول، صحت منداور فرد وجماعت کے لیے امید افزا بلکہ حیات آفریں اصول ہے جس کی جگہ جگہ قرآن وسنت میں وضاحت کی گئی ہے۔ (۳۹) کمیونزم یا اشتراکیت کا یہ نظریہ کہ روٹی، کپڑا اور مکان سب کو برابر ملنا چاہیے، غیر عقلی، غیر فطری اور غیر صحت مند نظریہ ہے جو فرد اور جماعت کو کام چور، کسی ادارہ یا شعبہ کو جامد ومعطل اور کسی بھی ملک کی ترقی وخوشحالی کو مشکوک ومشتبہ بلکہ غیر یقینی بنادیتا ہے۔ اسلام اس بات کا قائل ہے کہ اس عالم اسباب میں اسباب سبھی کو اختیار کرنا ہے اور جو جتنا اسباب ووسائل اختیار کرے اسی کے لحاظ سے اسے نتیجہ یا ثمر ملے گا، یہ فطری اور عقلی بات ہے۔ ہاں اگر کوئی مفلس، مجبور اور فاقہ کش ہے تو اس کی مجبوری کو ختم کیا جائے گا اور اس کے لیے یکساں اسباب اور مواقع فراہم کیے جائیں گے۔ لیکن سب کے نتائج یکساں برآمد ہوں، اس نظریہ کو اسلام غیر عقلی، غیر فطری بلکہ کسی بھی گھر، شعبہ، ادارہ یا ملک کی ترقی کے مخالف اور مزاحم قرار دیتا ہے۔ (۴۰) جس طرح جسم کے نظام کو فعالیت کا مظاہرہ کرنے کے لیے خود انسانی جسم کے اعضا وجوارح بڑے چھوٹے ہوتے ہیں نیز ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں بڑی چھوٹی ہوتی ہیں۔ اسی طرح کسی شعبہ یا تعلیم گاہ کا نظام قائم رکھنے کے لیے بڑے چھوٹے ملازمین ہوتے ہیں اور کسی ملک کے معیاری ہونے کے لیے اور ملک کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن رکھنے کے لیے چھوٹے بڑے اور عوام وخواص سبھی کی موجودگی ضروری ہوتی ہے اور سبھی کا اپنے اپنے میدان میں منفرد رول ہوتا ہے۔ اسی طرح انسانی برادری میں اگر کوئی نتیجہ عمل کے لحاظ سے چھوٹا ہے اور کوئی بڑا، کوئی کامیاب ہے تو کوئی ناکام، کوئی خوشحال ہے تو کوئی بدحال، کسی کے رزق میں کشادگی ہے تو کسی کے رزق میں تنگی، اسی متنوع اور متضاد شکلوں میں ہی کائنات کا نظام چل سکتا تھا ورنہ زمین فساد سے بھر جاتی (۴۱) اور ہر چہار

جانب الامان والحفیظ کی صدائیں گونج رہی ہوتیں۔

انتہا پسندی یا افراط وتفریط کسی مخصوص مسلک و مذہب اور فکر و نظر سے قطع نظر، عقل عام اور ادنیٰ شعور رکھنے والے افراد واشخاص کے نزدیک بھی معیوب و مذموم طریقہ عمل ہے۔ایک طالب علم کا سال بھر اوباشوں کی سی زندگی گزارنا اور امتحان کے زمانے میں انہماک وتوجہ کا اس طرح مجسم بن جانا کہ کھانا پینا، حوائج وضروریات اور آرام وراحت کو بالائے طاق رکھ دے، طالب علم کے لیے محنت ومشقت کا مطلوب طریقہ عمل نہیں ہے۔ایک کاشتکار جتائی، بوائی اور نرائی کے زمانے میں خواب خرگوش کے مزے لے رہا ہو اور عین فصل کی تیاری کے وقت بایں طور متحرک وفعال رہتا ہو کہ وہ کھانے پینے اور دیگر ضروری کام کرنے سے بھی گریزاں ومجتنب ہو، یہ روش بہرحال قابل ستائش نہیں ہے۔اسی طرح ایک تاجر وکاروباری ہفتوں اور مہینوں اپنی پونجی تک سے غافل رہتا ہو اور کساد بازاری کے زمانے میں انتہائی سعی وکاوش کا نذرانہ پیش کرتا ہو، یہ طرز ادا ایک کامیاب و بامراد تاجر کے شایان شان نہیں ہوسکتی۔اسی طرح دین ومذہب کے معاملات میں افراط وتفریط درست نہیں ہے۔مذہب کے کسی حکم کو بالکل نظرانداز کردینا اور کسی کو مطلوب ومقصود حد سے بڑھا کر بیان کرنا اور عملی لحاظ سے اس کو وہ اہمیت دینا جس کا وہ مستحق نہیں ہے، یہ دین کے معاملہ میں غلو ہے۔اہل کتاب کا غلو یہ تھا کہ ایک طرف وہ اللہ کے نبی کو نبی ماننے سے گریز کررہے تھے اور اس کی شان میں نازیبا کلمات کہنے اور انسانیت سوز حرکتیں کرنے سے بھی متذبذب اور پشیماں نہ ہوتے تھے اور دوسری طرف وقت کے مصلح اعظم اور نبی کو خدا کا بیٹا کہنے میں بھی باک محسوس نہیں کرتے تھے۔

بنی اسرائیل قرآن مجید میں دونوں پہلوؤں سے اقوام عالم کے مقابلے میں نمونۂ عبرت ہے۔ایک پہلو تو بڑا قابل رشک یہ ہے کہ ایک زمانہ تھا کہ یہ قوم جب اللہ کی ہوکر رہی اور اللہ کے رسولوں کی تعلیمات پر عمل پیرا رہی تو نوازشوں کی بارش ہوئی، من وسلویٰ نازل ہوا، بادلوں کا سایہ کردیا گیا اور ایک پتھر سے بارہ بارہ چشمے جاری کردیے گئے، گویا کہ پوری دنیا کے لوگوں کے مقابلے میں فضیلت وبرتری کا تاج ان کے سروں پر رکھا گیا۔اور ایک زمانہ وہ تھا جب اللہ کے احکام کی پامالی کو اس قوم نے اپنی فطرت ثانیہ بنالیا اور انبیاء ورسل کے خلاف گھناؤنے کاموں کو شیوۂ حیات بنالیا تو ان کے ضال ومغضوب ہونے کا اعلان کردیا گیا۔(۴۲) دین میں افراوتفریط اور حداعتدال سے گزرنے کا انجام اللہ کے غیض وغضب کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ماضی کی تباہ شدہ قوموں کی تباہی وبربادی کے اسباب میں ایک بڑا

سبب یہ تھا کہ وہ اس گھناؤنے جرم میں ملوث تھیں۔قرآن مجید میں اہل کتاب کے واسطے سے امت مسلمہ کواس مہلک مرض سے نجات پانے کی تلقین کی گئی ہے۔ایک جگہ فرمایا گیا:

قُلْ یَا أَھْلَ الْکِتَابِ لاَ تَغْلُواْ فِیْ دِیْنِکُمْ غَیْرَ الْحَقِّ وَلاَ تَتَّبِعُواْ أَھْوَاء قَوْمٍ قَدْ ضَلُّواْ مِن قَبْلُ وَأَضَلُّواْ کَثِیْراً وَّضَلُّواْ عَن سَوَاء السَّبِیْلِ۔(۴۳)

[کہہ دیجیے اے نبی! اے اہل کتاب، اپنے دین کے معاملے میں ناحق غلو نہ کرو اور نہ ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی کرو جو تم سے پہلے خود گمراہ ہوئے اور انھوں نے بہتوں کو گمراہ کیا اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔]

امت مسلمہ کو اہل کتاب کی روشِ بد سے اجتناب کی تلقین ایک جگہ یوں کی جاتی ہے:

یَاأَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّہَ ... وَلَا تَکُونُوا کَالَّذِیْنَ نَسُوا اللَّہَ فَأَنسَاھُمْ أَنفُسَھُمْ أُوْلَئِکَ ھُمُ الْفَاسِقُونَ(۴۴)

[اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور تم لوگ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے خود ان کو وجود سے بھلوا دیا۔ وہ لوگ فاسق تھے۔]

الوداعی حج کے موقع پر فرزندان اسلام کو آپ وصیت فرما رہے تھے تو قوموں کے عروج و اقبال اور غلبہ واقتدار کے رموز اور ان کے زوال واد بار اور تنزلی وانحطاط کے اسباب کو کیونکر فراموش کرتے۔ یہاں فرزندان توحید براہ راست مخاطب تھے، لیکن یہ بات صرف فرزندان توحید کے لیے نہیں تھی بلکہ اقوام وملل کے لیے عام تھی۔ چونکہ آپ ﷺ رحمۃ للعالمین تھے اور آپ ﷺ کے بعد کوئی نیا نبی اور نئی شریعت نہیں آنے والی تھی، اس لیے زندگی کے اس اہم ترین موقع پر آپؐ نے جو جامع تعلیم دی، اس کے مقدس بول یہ تھے:

اِیّاکُمْ وَالْغُلُوَّ فِی الدِّیْنِ فَاِنَّمَا اَھْلَکَ قَبْلَکُمُ الغُلُوّفی الدِّیْن۔(۴۵)

[خبردار! دین میں تم لوگ غلو سے بچنا، اس لیے کہ تم سے پہلے کے لوگوں کو اسی غلو فی الدین نے ہلاک وبرباد کیا تھا۔]

اللہ ایک ہے، وہ اپنی ذات میں، اپنی صفات میں اور اپنے اختیارات میں اکیلا ہے، (۴۶) وہی حاضر وناظر (۴۷) اور عالم الغیب ہے، (۴۸) وہی غالب وقاہر اور ہر چیز پر قادر ہے (۴۹) اور نفع ونقصان کا مالک وہی ہے۔ پوری دنیا مل کر اگر کسی کو نفع پہنچانا چاہے اور اللہ کی مرضی نہ ہو تو پوری دنیا مل کر

بھی کسی کو نفع نہیں پہنچا سکتی، اسی طرح اگر پوری دنیا مل کر کسی کو نقصان پہنچانا چاہے اور اللہ رب العزت کی یہ منشا نہ ہو تو پوری دنیا کی طاقت نقصان نہیں پہنچا سکتی۔(۵۰) محمد عربی ﷺ اللہ کے آخری اور محبوب ترین رسول ہیں۔ آپ ﷺ کی اتباع میں ہی اللہ کی رضا و خوشنودی کا راز مضمر ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت گویا اللہ کی اطاعت ہے۔ اس لیے اللہ کا رسول ﷺ اپنی خواہشات سے نطق و گویائی نہیں کرتا۔

ان قرآنی حقائق کے باوجود آج قرآن و سنت کی علمبردار امت **خیموں میں بٹی نظر آتی** ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ دین کے معاملے میں **غلو** نے امت مسلمہ کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ امت جو امت مسلمہ تھی اور دین و عقیدہ کے لحاظ سے امت واحدۃ کے لبادے میں ملبوس تھی، آج مختلف مسالک اور مکاتب فکر میں منقسم ہے۔ ایک دوسرے کے کیمپ میں اتنی شدت اور انتہا پسندی ہے کہ ایک دوسرے کا وجود نا قابل برداشت ہو رہا ہے۔ کہیں اس بنیاد پر اختلاف ہے کہ **امت کا ایک گروہ** عظمت رسول ﷺ کے عقیدہ میں اس قدر آگے بڑھ گیا ہے کہ اس نے خالق و مخلوق کی صفات کو بالائے طاق رکھ دیا اور دونوں کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کیا۔ یقیناً عظمت رسول ﷺ کا اگر کوئی منکر ہے تو وہ مسلمان نہیں ہے اور اللہ پر ایمان کا دعویٰ باطل ہے، لیکن اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے مقام و مرتبہ کو یکساں قرار دینا، گویا عابد و معبود اور خالق و مخلوق کے فرق و امتیاز کو ختم کر دینا ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیتوں کی روشنی میں(۵۱) یہ عقیدہ صحت و اعتدال کی میزان پر کھرا نہیں اترتا۔ اس عقیدے کے علمبردار ایک صف میں نظر آتے ہیں تو دوسری صف میں **وہ حضرات** ہیں جو اللہ کی رضا کے حصول کا ذریعہ اتباع رسول کو قرار دیتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک خوشنودیٔ رب کا پروانہ حاصل ہی نہیں ہو سکتا جب تک رسول اللہ کی اطاعت اور ان کے طریقۂ زندگی کی اتباع نہ ہو۔ اس مکتبۂ فکر میں رسول اللہ ﷺ جسمانی ساخت اور حوائج و ضروریات کے اعتبار سے ہمارے ہی جیسے عام انسانوں کی طرح تھے، ہاں آپ ﷺ اللہ رب العزت کی وحی سے شرف یاب تھے(۵۲) نیز آپ سردار انبیاء اور خاتم النبیین تھے۔(۵۳) اہل ایمان کا یہ گروہ ان حقائق کا قائل و مداح ہے کہ آپ ﷺ اخلاق فاضلہ کی انتہائی بلندیوں پر تھے،(۵۴) محبت الٰہی کی سند آپ کے طریقہ پر چل کر ہی مل سکتی ہے۔(۵۵) آپ ﷺ کے مقام و مرتبہ پر اللہ رب العزت بھی جگہ جگہ اپنی کتاب عزیز میں نعت گو ہے اور اس کے کارخانۂ قدرت کا انتظام و انصرام کرنے والے فرشتے درود بھیجتے رہتے ہیں اور اس عمل مبارک کی تلقین ایمان لانے والوں سے بھی کی جاتی ہے۔(۵۶) ہر اس شخص کے لیے جو اللہ رب العزت سے ملنے کا امیدوار اور یوم آخرت کا متمنی ہو، آپ

ﷺ کی حیات مبارکہ اسوۂ عمل اور نمونۂ زندگی ہے،(۵۷) یہ سارے حقائق ومعارف قرآن مجید سے ہی مترشح ہوتے ہیں اور صداقت تو اس امر میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی عظمت وشان ان الٰہی حقائق کے اعتراف میں مضمر ہے۔ اگرچہ یہ صحت منداور قرآن وسنت کے شایان شان عقیدہ ہے، تاہم رسول اکرم ﷺ سے متعلق ایمان وعقیدہ کی اس ڈگر پر چلنے والا گروہ اول الذکر گروہ امت سے منفرد سمجھا جاتا ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جو حدیث اور سنت کا منکر ہوتے ہوئے قرآن مجید سے ہی اپنے تعلق خاطر کا دعویدار ہے اور اہل قرآن سے اپنے آپ کو موسوم کرتا ہے تو ایک دوسرا گروہ بھی ہے جو احادیث نبویہ کو ہی قولاً اور عملاً مستندترین ماخذ سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو اہل حدیث سے ملقب کرتا ہے، یہ طبقہ بہت حد تک قرآنی تعلیمات سے استشہاد سے بے نیازی برتتا ہے۔

اسلامیان عالم کے درمیان افراط وتفریط اور حد سے انحراف وتجاوز کی شکلیں یقینی طور پر دین اسلام کے حقیقی چہرے پر بدنما داغ اور ملت اسلامیہ کے لیے چیلنج ہیں، جس کی بنا پر اسلام کی شبیہ ملکی اور عالمی سطح پر خراب ہوتی ہے اور یہ عملی طور پر بندگان خدا کو دین حنیف سے برگشتہ کرنے کی سعئ نامشکور بن جاتی ہے۔ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں غلو اور انتہا پسندی کا بھی مہلک اور خطرناک مرض ہے۔ آج پورا عالم انتہا پسندی، شدت اور حد اعتدال سے تجاوز کو مذموم سمجھتا ہے اور صحیح معنوں میں اس مرض کے ساتھ دینی اور دنیوی دونوں پہلوؤں سے زندگی پر آشوب اور پُرخطر بن جاتی ہے۔ ایسے حالات میں اللہ رب العزت کی سب سے بڑی امانت اسلام کے علمبرداروں کے لیے بالخصوص اور تمام دنیائے انسانیت کے لیے بالعموم دین ومذہب میں غلو وانتہا پسندی سے اجتناب کی وصیت معنی خیز اور مثبت وخوشگوار اثرات ونتائج پیدا کرنے کی ضامن ہے۔

آج **حقوق نسواں** کی بات بڑے زور وشور سے کی جارہی ہے۔ پوری دنیا میں اس کی حریت وآزادی کو مسئلہ بنا کر منظّم انداز میں بڑے پیمانے پر پیش کیا جارہا ہے۔ اسلام کے مطابق عورت اور مرد دونوں کا مقام مسلم ہے، ان میں سے کوئی کسی سے فروتر نہیں ہے اور دونوں کو دنیوی اور اخروی سعادت وکامرانی کے حصول کا حق حاصل ہے۔ ہاں دونوں کے دائرہ کار الگ الگ ہیں اور ذمہ داریاں مختلف ہیں۔ عورت اگر گھر کی ملکہ، اپنے بچوں کی کل وقتی مربیہ (Fulltime Patron) اور گھر کے اس کارخانہ کی اصل ذمہ دار ہے تو مرد باہر کی دنیا کا سفیر، اقتصادی امور کا ذمہ دار اور تمام خارجی معاملات کا نگراں ہے۔ اپنی فطرت اور اپنی صلاحیت کے مطابق یہ دونوں شریک یا ساجھی اگر ذمہ داریاں انجام دیں تو مثبت اور

مؤثر نتائج سامنے آئیں گے، بصورتِ دیگر فطرت سے انحراف اور اپنی صلاحیتوں کے بے جا استعمال سے دونوں کی شخصیت مجروح ہوگی اور خوش آئند ثمرات ونتائج کی توقع بے معنی اور بے سود ہوگی۔

اسلام عورت کی **عزت وعصمت کا محافظ** ہے۔ چنانچہ یہ اس کا اصل میدان کار گھر کو قرار دیتا ہے۔ بچوں کی تعلیم وتربیت اور گھر کے حسنِ انتظام کی شکل میں اس کی صلاحیتوں کے جوہر گھر میں ہی آشکار ہوتے ہیں۔ عورت کو گھر سے باہر نکالنے کی آواز بلند کرنا، بے پردہ ہوکر ہوس پرستوں کے بیچ لے آنا، ہوائی جہازوں میں ایئر ہوسٹس اور دفتروں کی زینت بنانا، بہر حال عورت کی عزت وعصمت کے خلاف عالمی طور پر منظّم اور گھناؤنی سازش ہے اور عورت کے حقوق کی پامالی و بے حرمتی ہے۔ ماں کی حیثیت سے، شریک حیات کی حیثیت سے، بہن کی حیثیت سے اور بہو و بیٹی کی حیثیت سے عورت کی عظمت کو جگہ جگہ قرآن وسنت میں واضح کیا گیا ہے اور اس کے حقوق کی صراحت کی گئی ہے۔ آج اکیسویں صدی میں عورت کی مظلومیت کی داستان سنائی جارہی ہے اور سطحی اور مذموم مقاصد کے تحت عورت کے حقوق کی بات کی جارہی ہے۔ حقوق نسواں کے نمائندوں اور آزادئ نسواں کے علمبرداروں کو دعوت فکر ونظر دی جاتی ہے کہ قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے اور اس کے آخری رسول محمد عربی ﷺ نے اُس وقت حقوق نسواں کی تحریک برپا کی تھی جبکہ یورپ تاریکیوں میں گم تھا اور عورت محض تفریح طبع کا سامان اور بچہ پیدا کرنے کی مشین سمجھی جاتی تھی۔ خطبہ حجۃ الوداع کی ایک اہم دفعہ یہ تھی:

اِنَّ لَکُمْ مِن نِسَاءِ کُمْ حَقًّا وَلِنِساءِ کُم عَلَیْکُمْ حَقًّا۔ (۵۸)

[بلاشبہ تمہارا تمہاری عورتوں پر حق ہے اور تمہاری عورتوں کا تم پر حق ہے۔]

آج کی دنیا میں فرائض وواجبات سے کنارہ کشی اختیار کی جاتی ہے اور حقوق ومراعات کی بازیابی کے راگ الاپے جاتے ہیں، نعرے بازی ہوتی ہے، جلوس نکالے جاتے ہیں، اجتماعی کارروائیاں کی جاتی ہیں، سمینار اور سمپوزیم منعقد کیے جاتے ہیں۔ اگر آج کے دور میں مرد خلوص اور ایمانداری کے ساتھ اپنے فرائض سے سبک دوش ہوں اور عورتیں اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہوں تو حقوق کی بازیابی کے لیے جلسوں کا انعقاد اور سمینار وسمپوزیم کا وجود بے معنی ہوجاتا ہے۔ مرد اور عورت کے حقوق وفرائض سے متعلق یہ تعلیم صرف فرزندانِ توحید کے لیے ہی نفع بخش نہیں ہے، بلکہ تمام مذاہب کے پیروؤں کے لیے یکساں مفید اور دوررس اثرات کی حامل ہے۔ اس تعلیم پر عمل پیرا ہونے کے نتیجے میں ایک طرف مرد کا وقار اور اس کی قوامیت باقی رہتی ہے تو دوسری طرف عورت کی عزت وعصمت محفوظ ومامون رہتی ہے اور

پھر وہ اپنے مخصوص دائرے میں رہتے ہوئے تربیت اولاد اور گھر کے حسن انصرام کی شکل میں اپنی مخصوص صلاحیتوں کے نذرانے پیش کرتی ہے۔

آج بالخصوص امت مسلمہ میں **قومی اور بین الاقوامی سطح پر قیادت سے محرومی** ہے۔حقیقت تو یہ ہے کہ صوبائی، ملکی اور بین الاقوامی سطح پر قیادت کا فقدان نہیں ہے۔خلوص وللّٰہیت ،فکر وتدبر، انتظام وانصرام اور جرأت وبے باکی کے اوصاف کے لحاظ سے کسی زمانے میں بھی امت مسلمہ میں قحط الرجال نہیں رہا ہے اور آج کی اس اکیسویں صدی میں بھی اخلاص وللّٰہیت کے وصف سے آراستہ،علم وآگہی سے مزین اور فہم وتدبر اور قیادت ورہنمائی کے جوہر سے مرصع ، بلند قامت شخصیات کی کمی نہیں ہے۔المیہ یہ ہے کہ امت کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ کسی قائد کو برداشت کرے۔جھوٹی شہرت کا حصول، اپنی اَنا کی تسکین کا جذبہ، شخصی اور گروہی مفادات کے تحفظ کا خیال اور مسلک ومکتبۂ فکر کا حصار ،امت کو اتحاد واتفاق کی لڑی میں پرونے نہیں دیتا اور قائد کے بارے میں یہ مفروضہ قائم کیا جاتا ہے کہ وہ ایسا آئیڈیل ہو کہ تقصیرات وکوتاہیاں اس کے قریب نہ پھٹکیں۔انسانوں کے لیے کوئی آئیڈیل قائد انسان ہوگا اور انسان سے غلطیاں بھی ہوں گی، اس کے بعض اقدامات اور فیصلے بعض لوگوں کے لیے یا بعض طبقات کے لیے قابل اعتراض بھی ہوں گے۔امت اگر ایسا قائد چاہتی ہے کہ اس سے کوئی خطا نہ ہو اور وہ ہر ایک کو خوش رکھے تو بہرحال یہ انسانی قیادت سے فروتر اور امر مستحیل ہے۔ایک قائد سب کو خوش نہیں رکھ سکتا، ہاں قابل توجہ یہ ہے کہ اس کے اقدامات کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے انحراف پر مبنی نہ ہوں۔ آپ ﷺ جب الوداعی خطبہ فرمارہے تھے تو انتشارِامت کو ختم کرنے کے لیے اور اتحاد واتفاق کا شیرازہ برقرار رکھنے کے لیے ناگزیر تھا کہ آپ آخری ہدایت نامہ میں اس عقدہ کو حل فرماتے۔آپ ﷺ نے اس سلسلے میں جو امت کو قیمتی سبق دیا وہ کتب احادیث وسیر کے اوراق کی زینت ہے اور قیامت تک یہ زندہ قوموں کے لیے روح افزا پیغام ہے:

يَـاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَاِنْ أُمِرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبشِيٌّ مُجدِعٌ مَا اَقَامَ فِيكُمْ كِتَابَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ۔ (۵۹)

[اے لوگو! اللہ سے ڈرو، سنو اور اطاعت کرو، اگر حبشی بریدہ غلام بھی تمہارا امیر ہو، جب تک وہ تم کو اللہ عزوجل کی کتاب کے مطابق لے چلے۔]

باپ کے جرم میں بیٹا، بیٹے کے جرم میں باپ، بھائی کے جرم میں بھائی چچا کے جرم میں بھتیجا اور

بھتیجے کے جرم میں چچا مجرم نہیں ہوسکتا۔ ممکن ہے کاغذی طور پر بعض ملکی اور بین الاقوامی ضوابط ودفعات میں یہ اصول موجود ہو۔ لیکن صداقت یوں نظر آتی ہے کہ پوری دنیا میں یہ کریہہ اور انسانیت سوز منظر سامنے آتا ہے کہ اکثر وبیشتر ایک شخص کی غلطی کا خمیازہ پورے خاندان والوں کو بھگتنا پڑتا ہے اور بسا اوقات خاندان کے خاندان تباہ وبرباد کردیے جاتے ہیں۔ اسلام غلطی کا ارتکاب کرنے والے کا ہی مواخذہ کرتا ہے۔ مجرم وہ ہے جو جرم کرتا ہے اور سزا مجرم کو ہی ملنی چاہیے۔ قرآن وسنت کی تعلیمات اعزہ واقربا اور احباب ورفقاء کو مجرم نہیں قرار دیتیں الا یہ کہ کسی نہ کسی حد تک ان کے ملوث ہونے کا ثبوت فراہم ہوجائے۔ قرآن مجید کی بے شمار تعلیمات اس موقف پر دالّ ہیں کہ جو عمل خیر کرے گا اس کے نتیجۂ خیر سے وہ خود مستفیض وشرف یاب ہوگا۔ اور جو عمل بداختیار کرے گا اس کا وبال خود اسی پر ہوگا۔ (۲۰) اسلام کا یہ درخشاں اصول دنیا اور آخرت دونوں جگہوں کے مقدمات کے سلسلے میں ہے۔ آخری حج کے موقع پر ترجمان وحی الٰہی رسالت مآب ﷺ نے اس سلسلے میں قرآن مجید کی درخشاں تعلیمات کا ماحصل ان الفاظ میں پیش کیا تھا اور امت مسلمہ کے نمائندہ اجتماع کے واسطے سے پوری انسانی برادری کو یہ واضح لائحۂ عمل دیا تھا:

اَلَاَلایَجْنی جَانٍ اِلَّا عَلٰی نَفْسِہ اَلَا لَا یَجْنِی جَانٍ عَلٰی وَلدِہِ وَلامَوْلُوْدٌ عَلَی وَالِدِہ۔ (۲۱)

[ہاں سنو! مجرم اپنے جرم کا آپ ذمہ دار ہے، ہاں باپ کے جرم کا ذمہ دار بیٹا نہیں ہے اور بیٹے کے جرم کا جوابدہ باپ نہیں ہے۔]

رسول اکرم ﷺ کی اس زریں تعلیم کو اگر آج معاشرہ انسانی اپنا وطیرۂ زندگی بنالے اور حقوق انسانی کے علمبردار ان مقدس الفاظ کو اپنے قانون وضابطہ کی زینت بنالیں تو بعید نہیں کہ بہت حد تک ظلم وبربریت اور وحشت ودرندگی کا قلع قمع ہوجائے گا اور انسانی عظمت وتقدس کی بہت حد تک حفاظت ہوسکے گی۔ یہ تعلیم غیر اسلامی حکومت کی رعایا کے لیے بھی اتنی ہی اہم ہے۔ ملک کا دستور وضابطہ کسی ملک کی عظمت کا ترجمان ہوتا ہے۔ تعلیم نبوی کا انطباق یوں ہوتا ہے کہ اگر ایک حکمراں جمہوریت کی روح برقرار رکھتے ہوئے تمام طبقات (خواہ اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں) کا خیال کرتے ہوئے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ملک کے دستور کا تقدس برقرار رکھتے ہوئے اگر وہ حکمرانی وقیادت کررہا ہے تو خواہ مخواہ اس کے اصولوں کے نفاذ میں سد راہ نہیں بننا چاہیے، مخالفتوں اور مخاصمتوں کا طوفان نہیں کھڑا کرنا

چاہیے، احتجاجات اور بغاوتوں کو شہہ نہیں ملنا چاہیے۔ چاہے وہ حکمراں اونچی ذات کا ہو یا نیچی ذات کا، اس کا احترام لازم ہے۔ ملک کے قانون کا احترام واجب ہے، اور صحیح معنوں میں ملک وقوم کی صلح وآشتی اور فلاح و بہبود کے لیے اس کے اقدامات سراہے جانے کے لائق ہیں۔

کتاب اللہ اور **سنت رسول اللہ** ﷺ شریعت مطہرہ کے دو **مستند ترین ماٰخذ** ہیں۔ کتاب اللہ سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی عظمت کے ظاہری پہلو کو بھی مستحضر رکھا جائے اور اس کی عظمت کے باطنی پہلو کو بھی۔ بلکہ اس ضابطۂ زندگی کا اصل احترام یہ ہے کہ اس کی تعلیمات سے اپنی زندگیوں کو روشن کیا جائے اور اس کے احکام کو معاشرے میں نافذ کیا جائے۔ اسی طرح سنت رسول اللہ سے محبت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کی ذات مبارکہ پر مقالے لکھے جائیں، کتب ورسائل تحریر کیے جائیں، تقاریر ومواعظ سے عوام وخواص کو مستفیض کیا جائے، تقریبات سیرت نبوی کا اہتمام کیا جائے، لیکن آپ ﷺ سے محبت کا اصل تقاضا یہ ہے کہ آپ ﷺ کی زندگی کو اسوۂ عمل بنایا جائے اور آپ کی تعلیمات کو انسانیت کے لیے نجات دہندہ کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ خاتم الانبیا ﷺ نے عرفات کے میدان میں انسانیت کو جو جامع دستور حیات دیا تھا، اس کی ایک اہم دفعہ یہ تھی:

> تَرَکْتُ فِیْکُمْ امْرَیْنِ لَنْ تَضِلُّوا مَا تَمَسَّکْتُمْ بِھَما کِتُابَ اللّٰہ و سُنَّتِی۔ (۶۲)
>
> [میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ تم لوگ ہرگز گمراہ نہیں ہو سکتے جب تک کہ تم لوگ ان کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے اور وہ دو چیزیں ہیں کتاب اللہ اور میری سنت۔]

رسول اللہ ﷺ کی وصیت کے مقدس الفاظ کے آئینے میں آج امت اپنی تصویر دیکھے کہ کیا وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا حق ادا کر رہی ہے۔ قرآن مجید میں ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں سے اللہ رب العزت کا یہ وعدہ بہ تکرار موجود ہے کہ وہ زمین میں خلافت ارضی کا پروانہ سونپے گا اور عزت وسرخروئی ان کا مقدر ہوگی جو ایمان سے شرف یاب ہو جائیں اور عمل صالح کو اپنا زیور حیات بنالیں۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ آج امت مسلمہ پوری دنیا میں ذلت وخواری اور محرومیت ومظلومیت کے دور سے گزر رہی ہے اور طرح طرح کے نامساعد حالات سے اس کو سابقہ پڑ رہا ہے۔ تشویشناک حد تک ان کو مشکوک ومشتبہ قرار دیا جا رہا ہے اور اس بنیاد پر ان کی جان، مال اور عزت سے بھی کھلواڑ کیا جا رہا ہے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ حالانکہ مسلمانوں سے تو اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ

سرخرو اور فائز المرام ہوں گے۔ امت کی ہمہ جہت پستی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ آج مسلمانوں کا واسطہ قرآن مجید سے رسمی سا رہ گیا ہے۔ وہ کتاب جس نے بھیڑ بکری چرانے والی قوم کی زندگیوں کو بدل دیا تھا، وہ ساری دنیا کے انسانوں کے رہبر ہو گئے تھے اور اسی کتاب کی بدولت انھوں نے اغیار و اجانب کے کیمپ میں لرزہ طاری کر دیا تھا۔ آج بھی وہ کتاب محفوظ و مامون شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اس کتاب سے ہمارا تعلق مضبوط و مستحکم ہو جائے اور ہم ذلیل و خوار رہیں۔ اسی طرح سنت رسول اللہ سے ہماری وابستگی سطحی ہے۔ سرورِ عالم ﷺ پر محض درود و سلام پڑھ لینا، نام آتے ہی عقیدت سے چوم لینا، میلاد کی محفلوں کو قمقموں سے مزین کر دینا اور اس سلسلے میں ہفتہ و عشرہ تقریبات کا انعقاد کر لینا، یقیناً یہ محبت رسول ﷺ کے مظاہر ہیں لیکن محبت کا اصل تقاضا یہ ہے کہ آپ ﷺ کے طریقۂ زندگی سے محبت ہو جائے، شب و روز کے چوبیس گھنٹوں، نشست و برخاست، تکلم و گویائی، اکل و شرب، سلوک و برتاؤ اور دیگر تمام مصروفیات میں سنت رسول اللہ جلوہ گر ہو جائے۔

قرآن مجید چونکہ اللہ رب العزت کی عطا فرمودہ نعمت عظمیٰ ہے جو ساری انسانیت کے لیے ہے اور رسول اکرم ﷺ قیامت تک کے سارے انسانوں کے لیے رسول ہیں۔ آپ ﷺ کا طریقۂ زندگی قرآن مجید کی عملی تفسیر ہے۔ آج اگر دنیائے انسانیت پستی و انحطاط اور زوال و ادبار کا حل تلاش کرنے میں سرگرداں ہے تو تجربے کی میز پر اس کتاب اللہ کو رکھے جو بلا شبہ تمام انسانوں کو راہ نجات دکھاتی ہے۔ اور بلا شبہ اس راہ نجات کے اسرار و رموز سرورِ کونین ﷺ کی زندگی میں ملتے ہیں۔

اللہ رب العزت نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے خدمت گار کے طور پر کائنات کی پوری بزم سجا دی۔ انسان خدا کی زمین پر رہتا ہے، اس کا دیا ہوا کھاتا ہے، اس کی ہواؤں میں سانس لیتا ہے، اعضاء جسمانی کی شکل میں اس کی بے مثل نعمتوں سے مالا مال ہے، ماں باپ جیسے شفقت و محبت کے پیکر سے وہ بہرہ ور ہے، اعزہ و اقربا اور احباب و رفقاء کی عنایت و توجہ اور الفت و محبت کا سرمایہ اس کی زندگی کو خوشگوار بناتا ہے۔ ان ساری نعمتوں سے متمتع ہونے کے باوجود اگر وہ اپنا سر کسی اور آستانے پر جھکاتا ہے اور اپنی عملی زندگی کے فیصلہ کن مراحل میں دوسری ہستیوں کو شریک و سہیم سمجھتا ہے تو اس سے بڑی بے حیائی اور اس سے بڑی ناشکری نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ عقیدے کے اس فساد کے ساتھ کوئی عمل اللہ کی بارگاہ میں باوزن نہیں ہوتا (۶۳) اور اس کی حیثیت صحرا کے سراب کی طرح ہوتی ہے۔ (۶۴) اللہ کی ذات کا انکار یا اللہ کی ذات میں اس کی صفات میں یا اس کے اختیارات میں کسی کو ساجھی قرار دینا،

دونوں ہی انتہائی شنیع جرم ہیں، اور دونوں کا انجام جہنم ہے (۶۵)۔ اللہ رب العزت کے یہاں اگر کوئی معافی نہیں ہے تو کفر وشرک کی معافی نہیں ہے۔ شرک کو اللہ رب العزت کھلے الفاظ میں جرم عظیم اور ظلم عظیم قرار دیتا ہے (۶۶)۔ اسی لیے اس کے نزدیک یہ جرم نا قابل معافی ہے۔

عبادت صرف اور صرف اللہ کی ہونی چاہیے، یہی تعلیم تمام پیغمبران خدا نے دی اور اسی کی تعلیم سرورکونین ﷺ نے فرمائی، اس لیے کہ اس کی پیدائش کا مقصد ہی عبادت ہے (۶۷)۔ گویا ایک لمحہ کے لیے بھی اس مبارک عمل سے انحراف اللہ سے انحراف ہے، چنانچہ ایک شخص سے تمام شعبہ ہائے زندگی میں اللہ کا ہی عبد ہو کر رہنے کا مطالبہ ہوتا ہے۔ اور یہی وہ شایانِ انسانیت عمل ہے جو انسان کو تمام معبودان باطل کے طوق سلاسل سے خلاصی کا سبب بنتا ہے۔ اگرچہ رسول اکرم ﷺ نے سوا لاکھ نمائندگان اسلام کی موجودگی میں وہ تاریخی خطبہ دیا تھا، لیکن اس نمائندہ اجتماع کے توسط سے آپ پوری انسانی برادری کو یہ پیغام دے رہے تھے۔ اس لیے کہ آپ کی بعثت مبارکہ صرف مسلمانوں کے لیے نہیں ہوئی تھی بلکہ انسانیت کے لیے ہوئی تھی اور آپ رحمۃ للعالمین کے مقام پر فائز تھے۔ ہاں ایمان کی نعمت سے شرف یاب ہونے والے ہی اس امانت کو دنیائے انسانیت تک پہنچا سکتے تھے، اس لیے آپ ﷺ نے اس خطبہ میں وہ عظیم الشان دفعہ بھی شامل کی جس پر عمل پیرا ہونے کے بعد معبودان باطل کا قلادہ اپنی گردنوں سے اتار پھینک کر انسانیت کی معراج حاصل کی جاسکتی تھی اور ابدی اور لازوال کامیابی کی شکل میں جنت کا حصول ممکن ہو سکتا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

> اعبُدُوا ربّکُم فَصَلُّوا خَمسَکُمُ وَصَومُوا شَهرکم وَاَطِيعُوا اذا آمرُکُمَ تَدخُلُوا جنّةَ ربّکم۔ (۶۸)
>
> [تم لوگ اپنے رب کی عبادت کرو، اپنی پانچوں وقت کی نمازیں پڑھو، اپنے روزے رکھو اور جب میں تم کو حکم کروں تو اطاعت کرو، تاکہ تم اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ۔]

فرزندان اسلام کے لیے یہ وصیت جس قدر معنی خیز تھی بعینہ دوسرے بندگان خدا کے لیے اہم اور قابل قدر تھی۔ ایک خدا کی بندگی آسان بھی ہے اور انسان کے شایان شان بھی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ خداؤں کے جھرمٹ میں رہنے والے بندۂ خدا کو نہ تو فکر و خیال کے لحاظ سے امن وآشتی نصیب ہوتی ہے اور نہ ہی حقیقی خالق سے صرف نظر کر کے اس کی زندگی پُر کیف و پُر بہار ہوتی ہے۔ اس لیے کہ ایک خدا کی عبادت کا علم اٹھا کر گویا وہ اس کی صفت عدل کا بھی قائل ہوتا ہے اور اس بات پر اسے یقین ہوتا ہے کہ

اس امتحان گاہ کے بعد ایک نتیجہ گاہ بھی وقوع پذیر ہوگی جہاں اپنے کیے ہوئے اعمال کا بدلہ ملے گا۔ گویا خدا کی وحدت کے قائل اور آخرت پر یقین کامل رکھنے والے شخص کی زندگی ایک ذمہ دار اور جوابدہ کی زندگی ہوجاتی ہے۔اس طرح فکر وعقیدہ کے لحاظ سے بھی اس کا دل ودماغ بہت سے خداؤں کی آماجگاہ نہیں بنتا اور نہ ہی وہ یہاں بے لگام زندگی گزارتے ہوئے ظلم وبربریت کا مظاہرہ کرتا ہے۔

انسانوں کی ہدایت ورہنمائی کے لیے کم وبیش سوا لاکھ انبیاء کرام مبعوث ہوئے۔ بعثت مبارکہ کے اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی جناب احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ چونکہ اسلام اللہ رب العزت کی بیش بہا روحانی نعمت ہے جو حضرت آدمؑ سے لے کر تمام پیغمبرانؑ خدا کو انسانوں کے رشد وہدایت کے لیے دیا گیا۔ محمد عربی ﷺ پر اس نعمت عظمیٰ کی تکمیل ہوئی۔ قرآن مجید اسلام کا مستند ترین منشور اور پوری انسانی برادری کے لیے جامع طریقۂ زندگی ہے جو محمد عربی ﷺ پر نازل ہوا۔ اسلام جب عالمگیر ہے تو اس کا منشور بھی عالم گیر ہوگا اور اس منشور کی تفسیر وبیان کو بھی آفاقیت کا درجہ حاصل ہوگا۔ متعدد قرآنی آیات رسول عربی ﷺ کی عظمت ورفعت پر ناطق ہیں۔ کہیں آپ کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت قرار دیا جاتا ہے، کہیں آپ کی اتباع کو اللہ کی محبوبیت کی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، کہیں آپ کو اخلاق فاضلہ کی انتہائی بلندیوں پر متمکن ہونے کا اعزاز بخشا جاتا ہے، کہیں آپ کے نطق وگویائی کو اللہ کی وحی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور کہیں آپ پر اللہ کی خاص نظر عنایت کا تذکرہ ہے، کہیں بانگ دہل یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ آپ رحمۃٌ لِلّعَالمین ہیں اور آپ کا اسوۂ زندگی ان تمام انسانوں کے لیے نمونۂ عمل ہے جو اللہ سے ملاقات کے خواہاں اور آخرت کی لازوال مسرتوں کے حصول کے امیدوار ہیں۔

ایام حج کے دوران عرفات کے میدان میں خاتم الانبیا ﷺ کا خطبہ وہ آخری خطبہ ہے جو خطبہ حجۃ الوداع سے موسوم ہے۔ اگرچہ یہ عظیم الشان مجمع دنیا بھر کے ایمان کے شیدائیوں اور آپ ﷺ کے جاں فروشوں کا تھا، تاہم ان کے توسط سے اس وصیت اور الوداعی پیغام کے مخاطب وہ لوگ بھی تھے جو کسی وجہ سے ایمان سے شرف یاب ہونے کے باوجود شرکت سے محروم تھے اور وہ لوگ بھی اس پیغام کے مخاطب تھے جو حلقہ بگوش اسلام نہیں ہوئے تھے لیکن اسلام کی اس نعمت غیر مترقبہ سے ان کو محروم نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ علاقائی سطح پر، ضلعی سطح پر، صوبائی سطح پر، ملکی سطح پر اور بین الاقوامی سطح پر حقوق ومراعات کی بازیافت کی باتیں گونج رہی ہیں، مضامین ومقالات اور کتب ورسائل منظر عام پر آرہے ہیں، ہفتہ وعشرہ تقریبات منائی جارہی ہیں، ملاحظات ومباحثات ہورہے ہیں اور سیمینار وسمپوزیم منعقد ہورہے ہیں،

لیکن سچ تو یہ ہے کہ مرض سنگین سے سنگین تر ہوتا جارہا ہے اور انسان کی عظمت مجروح ہوتی جارہی ہے۔ آج جمہوریت اور شورائیت کے قیام کی بالادستی کے نام پر عدل وانصاف کا خون کیا جارہا ہے، حقوق پامال کیے جارہے ہیں، عزتوں سے کھلواڑ کیا جارہا ہے، انسانی خون کی ہولی کھیلی جارہی ہے، رنگ ونسل اور خطہ وعلاقہ کی بنیاد پر معاملات طے ہورہے ہیں، عورتوں کے حقوق کی پامالی ہورہی ہے اور آزادئ نسواں کی آڑ میں عورتوں کی عزت وعصمت کا سودا کیا جارہا ہے، مجرم کے بجائے مجرمین کے متعلقین واحباب حراست میں لیے جاتے ہیں اور انھیں ناکردہ گناہوں کی سزا جھیلنی پڑتی ہے۔ قیادت کے نام پر امت میں بحران ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ باوصف اور لائق وفائق افراد ملت کا فقدان ہے، لیکن تشویشناک بات یہ ہے کہ جھوٹی شہرت، بےجا حمیت، تعصب، برادری، ذاتی، خاندانی اور گروہی مفادات کے حصار نے امت کے قوت بازو کو شل کردیا ہے اور ان کے احساس زیاں کو نابود کردیا ہے، اس لیے کسی بھی قائد کو برداشت کرنے کی صلاحیت اس کے اندر نہیں رہ گئی ہے۔ اسی طرح کسی بھی ملک کے عوام کے اندر تحمل وبردباری کا وہ وصف معدوم ہوتا جارہا ہے جس کی بنا پر اس کے اندر سے اہون البلیتین (Lesser Evil) کو برداشت کرنے کی قوت ناپید ہوچکی ہے اور حکمراں جماعت کے لیے عوام اور حکمراں مخالف جماعتوں کی طرف سے بسا اوقات مخالفتوں اور مخاصمتوں کا طوفان برپا کیا جاتا ہے۔

عصر حاضر کے ان ناخوشگوار ونامساعد حالات میں خطبۂ حجۃ الوداع بجا طور پر حقوق انسانی کا جامع اور عالمگیر منشور ثابت ہوتا ہے۔ **امانتوں کی ادائیگی** کا حکم بالخصوص اسلام جیسی متاع عزیز کو ان بندگان خدا تک پہنچانے کی تعلیم جو اللہ رب العزت کی اس نعمت بیش بہا سے محروم ہیں، دنیائے انسانیت کے لیے متاع گراں مایہ سے کم نہیں ہے۔ جان، مال، عزت اور آبرو کی حفاظت کی تعلیم عقل عام سے مزین اور غیرت وحمیت سے پُر ہر شخص کے لیے اس عارضی دنیا میں مژدۂ جانفزا اور روح پرور پیغام ہے۔ **تقویٰ** در اصل وہ ضابطِ وحکمراں ہے جو شب تاریک میں بھی اور دن کی روشنی میں بھی، بند کمرے اور کوٹھری میں بھی، چوراہوں اور شاہراہوں پر بھی، آبادی میں بھی اور ویرانے میں بھی، میدان بزم میں بھی اور میدان رزم میں بھی، فواحش ومنکرات کا باغی اور خیرات وحسنات کا پیامی بنادیتا ہے۔ **رنگ ونسل اور فرقہ وبرادری** کے تمام فروق امتیازات کو پیروں تلے دبا کر امت مسلمہ کے نمائندہ اجتماع کے توسط سے دنیائے انسانیت کو نبی عربی ﷺ نے یہ قیمتی درس دیا ہے کہ بڑائی کا کوئی معیار اگر ہے تو وہ صرف تقویٰ ہے۔ اسی طرح **آخرت کا عقیدہ** آدمی کو، ذمہ دار وجوابدہ بناتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے الوداعیہ خطبہ کے یہ

مقدس الفاظ 'سَتُلقَونَ رَبَّکُم فَیَسألُکُم عَنْ اَعمَالِکُم' حقوق وفرائض کی ادائیگی کے لیے پوری انسانی برادری کے لیے مہمیز کا کام کرتے ہیں۔ افراط وتفریط اور غلو وانتہا پسندی سے اجتناب کی تلقین جس طرح دین و مذہب کے لحاظ سے سرمایۂ سیم ورز ہے اسی طرح دنیوی مشاغل ومعاملات میں رحمت ورأفت کا مقام ہے جسے لاکھوں فرزندان توحید کے سامنے آپ نے بطور وصیت حوالۂ ناظرین کیا تھا۔

مجرم وہی ہے جو جرم کا ارتکاب کرے، یہ نہیں ہوگا کہ اس کا باپ بیٹا یا کوئی اور عزیز اس جرم کی پاداش میں اذیتیں جھیلے۔ یہ ایک صائب فکر اور راست طریقہ ہے جو آج کی دنیا میں اگر جامۂ عمل پہن لے تو ایک مجرم کے بدلے میں خاندان کے خاندان کی تباہی کا المناک اور روح فرسا منظر نگاہوں کے سامنے نہ آئے۔ اس زریں اصول کو بھی آپ ﷺ نے اپنے آخری خطبہ کی اہم دفعہ میں شامل کیا اور لوگوں کو تنبیہ کی کہ **ظالم** اور **مجرم** ہی کیفر کردار تک پہنچایا جائے نہ کہ اس کے اعزہ واقربا اور دیگر احباب ومتعلقین۔ **حقوق نسواں** کی بحالی اور **آزادئ نسواں** کا نعرہ اگرچہ جاذب نظر ہے، تاہم جدید دور میں یہ آوازیں عورت کی خیرخواہی کے بجائے اس سے نفرت وعداوت اور اس کی آبروریزی پر ناطق ہیں۔ عورت اپنی فطرت اور مخصوص صلاحیت کی بنا پر گھر کی ملکہ ہے اور اس اہم ترین تربیت گاہ کی کل وقتی معلّمہ اور مربیہ ہے۔ اسی طرح مرد باہر کی دنیا کا سفیر، اقتصادی امور کا ذمہ دار اور گھر کے احوال وکوائف کا نگراں ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے شریک سفر اور گاڑی کے دو پہیے کے مثل ہیں۔ یہ دونوں اسی وقت کام کر سکتے ہیں جب دونوں ہی درست ہوں۔ مرد اور عورت کی درستگی اور اپنے اپنے میدان میں حسن کارکردگی کا راز اس میں مضمر ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں اور دونوں ہی اپنے فرائض کے تئیں بیدار مغزی کا ثبوت دیں۔ انسان کی انسانیت کا راز بلکہ یوں کہا جائے کہ انسانیت کی معراج کا راز اس میں مضمر ہے کہ تمام باطل خداؤں کا قلادہ اتار پھینک کر **خدائے واحد کی عبودیت** کا تاج اپنے سر پر رکھ لے، جبھی وہ اس دنیا میں اشرف المخلوقات کی حیثیت سے زندگی گزار سکتا ہے اور فرائض وواجبات کی بحسن وخوبی ادائیگی کے ذریعہ لازوال مسرتوں کی کلید حاصل کر سکتا ہے۔ **قرآن مجید** اور **سنت رسول** ﷺ دونوں جہاں کی سعادتوں اور کامرانیوں کے لیے قیمتی مخزن اور مستند ترین مصادر ہدایت ہیں جن کی تعلیمات کو عملی زندگی میں برت کر دونوں جہاں کی سرخروئی کا مقام حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اگر حجۃ الوداع کی ان تاریخ ساز، فکر انگیز اور بے نظیر تعلیمات وتنبیہات کو معاشرہ انسانی نقوش راہ بنالے تو صحیح معنوں میں عدل وانصاف کا قیام، حقوق ومراعات کی حفاظت اور انسانیت نوازی وبشر دوستی کا چلن

معاشرہ انسانی میں عام ہوسکتا ہے اور حقوق انسانی سے متعلق ہمارے مقالات وملاحظات، مناقشات ومباحثات اور قومی اور بین الاقوامی سیمینار وسمپوزیم محمود ومبارک اور سعی مشکور ثابت ہوسکتے ہیں۔

حوالے وحواشی:

۱ الشوریٰ:۱۳
۲ المائدہ:۳
۳ المائدہ:۳
۴ البقرہ:۲، ۹۷،۱۸۵، آل عمران: ۱۳۸، الانعام: ۱۵۷، الاعراف: ۲۰۳، النحل: ۶۴، ۸۹،۱۰۲، النمل:۲، لقمان:۳، فصلت:۴۴
۵ الانعام: ۱۵۷، الاعراف: ۲۰۳، یونس: ۵۷، یوسف: ۱۱۱، النحل: ۸۹، الاسراء: ۸۲، القصص:۴۳
۶ یونس: ۵۷، الاسراء:۸۲، فصلت:۴۴
۷ ابراہیم:۱
۸ الاسراء:۹
۹ ابراہیم:۵۲
۱۰ آل عمران: ۳۲،۱۳۲، النساء: ۵۹، المائدہ:۹۲، الانفال:۱،۲۰، النور:۵۴، محمد:۳۳، المجادلہ:۱۳، التغابن:۱۲
۱۱ آل عمران:۳۱
۱۲ النجم:۳
۱۳ القلم:۴
۱۴ الاحزاب:۵۶
۱۵ الاعراف:۱۵۷
۱۶ الانبیاء:۱۰۷
۱۷ النحل:۴۴،۶۴
۱۸ الاحزاب:۲۱

۱۹ مسلم بن حجاج القشیری: الجامع الصحیح، ج:۱، کتاب العتق، ص: ۴۹۵، مطبع اصح المطابع، دہلی

۲۰ مسلم بن حجاج القشیری: الجامع الصحیح، ج:۱، کتاب البر، ص: ۱۲۵۔۱۲۶

۲۱ چونکہ قرآن مجید اسلام کا عالمگیر اور آفاقی منشور ہے جو قیامت تک کے لیے ہے اور نبی کریم ﷺ اس کتاب عزیز کے حامل ہیں۔ آپ کے بعد نہ ہی کوئی نبی آئے گا اور نہ ہی کوئی کتاب، اس لیے آپ ﷺ کی عظمت کا راز بھی اس اعتراف ویقین میں مضمر ہے کہ آپ کو تمام دنیا کے انسانوں کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا اور بطور سرچشمہ ہدایت آپ ﷺ کو یہ کتاب دی گئی۔ اس لیے آپ کی نبوت بھی عالمگیر اور آفاقی ہے۔

۲۲ الانبیاء: ۱۰۷، سبا: ۲۸

۲۳ آل عمران: ۳۱

۲۴ النساء: ۵۸

۲۵ الاعراف: ۱۰۵

۲۶ عبدالملک بن ہشام: سیرۃ النبی، الجزء الرابع، ص: ۲۷۵، دار الفکر

۲۷ التکاثر: ۸

۲۸ الحاکم النیسابوری: المستدرک، کتاب الرقاق، ج:۴، ص: ۳۰۶، ۱۳۴۲ھ، دائر المعارف، حیدرآباد،

۲۹ محمد بن عیسیٰ الترمذی: سنن الترمذی، ج:۲، باب فی القیامۃ، ص: ۵۴۵، حدیث نمبر ۲۴۱۷، الطبعۃ الاولیٰ مکتبۃ المعارف، ریاض

۳۰ الحجر: ۹

۳۱ آل عمران: ۸۵، النساء: ۱۲۵، المائدہ: ۳

۳۲ آل عمران: ۱۱۰

۳۳ المائدۃ: ۳۲

۳۴ احمد بن حنبل: المسند، ج:۱، ص: ۲۳۰

۳۵ شبلی نعمانی: سیرۃ النبی، ج:۲، ص: ۹۹، ۱۴۰۸ھ، لاہور

۳۶؎ احمد بن حنبل: المسند، ج:۵،ص:۴۱۱

۳۷؎ الحجرات:۱۳

۳۸؎ تقویٰ در اصل خوف خدا یا خشیت الٰہی سے عبارت ہے۔ دنیا کا کوئی قانون، معاشرے کی کوئی تعلیم یا روایت مخصوص اوقات میں اور وقتی طور پر کارگر اور مؤثر ہوسکتی ہے، لیکن خدا کا خوف یا تقویٰ ہر جگہ آدمی کو اچھائیوں کا علمبردار اور برائیوں سے بیزار بنا دیتا ہے۔ اور یہ قانون انسان کو اندر سے بدل دیتا ہے۔

۳۹؎ البقرہ:۱۳۴، ۱۴۱، ۲۸۶، النحل:۱۷، الانبیاء:۹۴، بنی اسرائیل:۲۱، الزلزال:۷-۸

۴۰؎ اسلام نتائج عمل میں برابری کا قائل نہیں ہے۔ ہاں اسباب و وسائل سب کے لیے فراہم ہونے چاہئیں، اسلام اس بات کی وکالت کرتا ہے۔ اگر ایک مفلس اور غریب ہے جو اپنی معاشی خستہ حالی کی بنا پر اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام نہیں کر سکتا، اس کے لیے اسلامی حکومت ذمہ دار اور مکلّف ہے کہ دوسرے بچوں کی طرح سہولیات اسے بھی دستیاب ہوں اور یکساں مواقع فراہم کیے جائیں۔ نتیجہ عمل میں برابری بہرحال غیر فطری اور غیر عقلی ہے اس لیے کہ جب اس بات کا یقین ہو کہ کام کیا جائے یا نہ کیا جائے محنت و کاوش کی جائے یا غفلت اور کام چوری کا طریقہ اختیار کیا جائے، نتیجہ یکساں ہوگا، تو پھر کوئی تنظیم، کوئی شعبہ یا کوئی ریاست کیونکر ترقی کے گام پر چل سکتی ہے، اس لیے کہ کام چوری، سستی، اور غفلت و بے توجہی، عام لوگوں کا شیوہ و شعار بن جاتا ہے۔ انسانوں میں مقام و مرتبہ اور نتیجہ و انجام کے لحاظ سے تفاوت دراصل کائنات کا نظام قائم رکھنے کے لیے ایک بڑی حکمت عملی ہے۔ اس کے برعکس اگر نتائج میں سب برابر ہو جائیں تو کائنات فساد کا شکار ہو جائے۔

۴۱؎ الشوریٰ:۲۷

۴۲؎ البقرہ:۶۱

۴۳؎ المائدہ:۷۷

۴۴؎ الحشر:۱۸-۱۹

۴۵؎ محمد بن یزید ابن ماجہ القزوینی: سنن ابن ماجہ، ابواب المناسک ومتعلقاتہا، ص:۲۲۴، مطبع کلکتہ

۴۶؎ ملاحظہ فرمائیں، الاخلاص، ۱-۴، الاعراف:۵۴

۴۷۔ البقرہ:۲۵۵،آل عمران:۲،الشوریٰ:۱۱،الدخان،۶،قٓ:۱۶

۴۸۔ البقرہ:۳۳،الانعام:۵۹،ہود:۳۱،۱۲۳،الاسراء:۲۵،الکہف:۲۶،العنکبوت،۱۰،
المؤمنون:۲۲،السجدۃ:۶

۴۹۔ الانعام:۱۸،۶۱،یوسف:۲۱

۵۰۔ الانعام:۱۷

۵۱۔ الانعام:۱۰۲،الرعد:۱۶،الکہف:۱۱۰،الزمر:۶۲،الشوریٰ:۱۱،الحشر:۲۴

۵۲۔ آل عمران:۴۴،الانعام:۱۹،یوسف:۱۰۲،ہود:۴۹

۵۳۔ الاحزاب:۴۰

۵۴۔ القلم:۴

۵۵۔ آل عمران:۳۱

۵۶۔ الاحزاب:۵۶

۵۷۔ الاحزاب:۲۱،الممتحنۃ:۶

۵۸۔ محمد بن یزید ابن ماجہ القزوینی:سنن ابن ماجہ:ابواب النکاح ص:۱۳۴،مطبع کلکتہ

۵۹۔ احمد بن حنبل:المسند،ج:۴،ص:۷۰

۶۰۔ البقرہ:۲۸۶،النساء:۳۲،القصص:۸۴،الروم:۴۴،الطّور:۲۱،القارعۃ:۶۔۹

۶۱۔ محمد بن یزید القزوینی:سنن ابن ماجہ،ابواب المناسک ومتعلقاتہا،ص:۲۲۵،مطبع کلکتہ

۶۲۔ احمد بن حنبل:المسند،ج:۳،ص:۵۹

۶۳۔ الکہف:۱۰۵،الحج:۳۱

۶۴۔ النور:۳۹،۴۰

۶۵۔ المائدہ:۲۷،البیّنۃ:۶

۶۶۔ النساء:۴۸،۱۱۶،لقمان:۱۳

۶۷۔ الذاریات:۵۶

۶۸۔ احمد بن حنبل:المسند،ج:۵،ص:۲۵۱،مستدرک حاکم،ج:۱،ص:۲۹۸

قیادت: سیرت رسولؐ کے آئینے میں

غلام رسول فلاحی، نیپال

قیادت نام ہے انسانی اجتماعیت کو ایک متعین رخ کی طرف منصوبہ بند طریقے سے اس طور پر حرکت میں لانے کا کہ لوگ قائد کی تحریک وتحریض پر ہر کام کو اپنا ذاتی کام سمجھ کر کرنے لگیں۔

قیادت ایک ایسی خوبی ہے جس کا ہدف دوسروں کو متاثر کرنا ہوتا ہے۔

قیادت وہ فن ہے جس میں انسانی فطرت سے تعامل ہوتا ہے اور جس کے ذریعہ انسانی رویوں اور سلوک پر اس طرح سے اثر انداز ہوا جاتا ہے کہ ان کے ذریعہ ایک متعین اور مخصوص ہدف کو کامیابی کے ساتھ حاصل کیا جا سکے۔

قیادت اس قوت کا نام ہے جو قائدین کے اندر خاموش انداز میں جوش مارتی رہتی ہے اور جیسے ہی انہیں مناسب افراد اور مناسب مواقع وحالات میسر آتے ہیں وہ پوری قوت کے ساتھ ظہور میں آتی ہے اور افرادِ جماعت کو متعین رخ پر چلانا شروع کر دیتی ہے۔

قیادت کا مطمح نظر یہ ہوتا ہے کہ تمام موجود وسائل وذرائع کو اور تمام اہداف کو انسانوں کی عظیم، دیرپا اور دوررس اثرات کی حامل کامیابی کے حصول کی راہ میں لگا دے۔

کامیاب قائد وہ ہے جو لوگوں کو اس سمت پر حرکت میں لائے جو ان کے طویل المیعاد منصوبہ کو کامیابی سے ہم کنار کر دے۔

قائد وہ ہے جو اپنی قائدانہ صلاحیتوں کے ذریعہ عام لوگوں میں اپنا ایک منفرد مقام بنالے، جو اپنے اعمال وافعال کو ایسے اسلوب سے انجام دے جو اس کے مقام ومرتبہ کے لائق ہو۔ قائد سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اجتماعیت کے اہداف اور اس کے مقاصد کی تعیین نیز نصب العین کے حصول میں اپنا سرگرم اور مؤثر رول ادا کرے گا۔

امانت دار قائد وہ ہے جو عملاً قیادت کا فریضہ انجام دے نہ کہ اس شخص کی طرح ہو جائے جو صرف لمبی گفتگوؤں اور لایعنی سرگرمیوں کے ذریعہ اپنی قیادت منوانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور جب آزمائش کی

گھڑی آجاتی ہے اور کلیجوں کو دہلا دینے والے اور آنکھوں کو پتھرا دینے والے حالات پیدا ہوتے ہیں تو اللہ تعالی کی یہ عظیم خوشخبری "إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْراً" کی پرواہ کیے بغیر دم دبا کر کسی گوشۂ عافیت میں چلا جاتا ہے اور اپنی عاجزی و بے بسی کا اظہار کرنے لگتا ہے۔

قائد کا کام یہ بھی ہے کہ زمینی حقائق اور احوال وظروف کے مطابق سرگرمیاں طے کرے، بلا سوچے سمجھے خلاؤں میں اپنی قوت کو ضائع نہ کرے۔

قائد کا کام یہ بھی ہے کہ اجتماعیت کا نظریہ (Vision) جو نہایت ہی دقیق سوچ کے بعد دریافت کیا گیا ہو اسے طے کرے اور اس کے لیے قصیر المیعاد، وسط المیعاد اور طویل المیعاد اسٹریٹجک پلاننگ کرے۔

قیادت ایک ایسی قوت کا نام ہے جو ہمیشہ زندہ اور متحرک رہتی ہے، اگرچہ حالات کے پیش نظر رفتار کبھی سست اور کبھی تیز اور کبھی اوسط درجے کی ہوتی ہے، مگر ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ وہ بالکلیہ خاموش ہو جائے، وہ جیل کی کوٹھریوں میں بھی اپنی فکر، اپنی سوچ، اپنی قوت ارادی اور اپنے ارشادات و توجیہات کی شکل میں متحرک اور فعال رہتی ہے جس طرح دل زندہ ہر آن دھڑکتا رہتا ہے اس طرح زندہ قیادت ہر آن متحرک رہتی ہے۔

ایک اسلامی قائد کا فہم صرف مخصوص اجتماعیت کے مفاد تک محدود نہیں رہتا بلکہ اسلام کے عظیم ترین مفادات اس کے پیش نظر ہوتے ہیں۔

ایک بیدار مغز قائد اپنے ماحول سے بہت کچھ سیکھتا رہتا ہے اور بہت کچھ ماحول کو سکھاتا رہتا ہے، اخذ وعطا کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، ماحولی طاقت، تعاون باہمی اور صلاحیتوں کے استعمال کے طریقے دریافت کرتا رہتا ہے۔

خصوصیات:

پاکیزہ نفس: قائد کا نفس ہر قسم کی غلاظت اور آلائش سے پاک ہو، حرص وہوا کا بندہ نہ ہو، جاہ ومنصب کا طالب نہ ہو، مثبت سوچ کا حامل ہو، شکوہ شکایت سے کوسوں دور ہو، اپنے ماتحت افراد کی طرف سے آنے والے اعتراضات اور تنقیدوں کو خوش دلی سے قبول کرے، اپنی بڑائی کا سودا سر سے ہٹا دے، سختی کے ساتھ اپنا محاسبہ کرتا رہے، اپنی اندرونی کمزوریوں پر کڑی نظر رکھے اور طاقت وقوت کا بھی صحیح شعور رکھے تا کہ اس میں اضافہ کے لیے ہمیشہ کوشاں ہو۔

قوم کا خادم: فرمان رسالت ہے: '' سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُھُمْ ''۔ قائد اپنی جماعت کی خدمت کا فریضہ انجام دے اور افراد جماعت کو آگے بڑھائے اور نصب العین کے حصول میں ان کی طاقتوں اور قوتوں اور صلاحیتوں کا بہترین استعمال کرے، دوسروں سے اپنی خدمت لینے کے بجائے عام انسانوں کی خدمت بجالانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرے۔ قائد کو چاہیے کہ جماعت کے وسیع تر مفاد کی خاطر اپنے ماتحت کارکنان سے مضبوط تعلق رکھے جو اہداف جماعت کے حصول میں ممد و معاون ثابت ہوں، افراد جماعت کی نگرانی قائد کا ایک بنیادی وظیفہ ہے کیونکہ وہ ان کا ولی اور سرپرست ہوتا ہے۔

عظیم کردار کا مالک: قائد تحریک کا کردار عظیم الشان ہوتا ہے، وہ دوسروں کے لیے بہترین نمونہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے ذاتی مفاد پر دیگر افراد جماعت کے مفادات کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ محدود مصلحت سے صرف نظر کر کے اسلام کی وسیع تر مصلحت کے حصول میں لگا رہتا ہے۔ وہ اپنی بہترین پہچان رکھتا ہے ۔مخالفین اور معارضین بھی اس کے اخلاق و کردار اور صداقت کے معترف ہوتے ہیں۔ وہ احکام شریعت کا پابند ہوتا ہے اور نواہی سے مجتنب رہتا ہے۔ اس کے سلوک میں، اس کے تعامل میں اور اس کے عام رویوں میں اسلامی تعلیمات کا رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ وہ اپنے سخت سے سخت مخالف کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے بھی حدود شریعت کو پار نہیں کرتا کیونکہ اس کے دل میں خوف خدا ہمہ وقت موجزن رہتا ہے۔

قائد تحریک مضبوط اعصاب کا مالک ہوتا ہے، شجاعت و مردانگی اس کے رویوں سے مترشح ہوتی رہتی ہے۔ بزدلی، عاجزی اور درماندگی سے کوسوں دور ہوتا ہے، باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی صلاحیت اس کے اندر ہوتی ہے۔ وہ پرعزم ہوتا ہے، مایوسی اور ناامیدی کا شکار نہیں ہوتا۔ اپنے ساتھیوں کے لیے شفیق اور مہربان ہوتا ہے، سخت دل نہیں ہوتا، سختی کی جگہ سختی اور نرمی کی جگہ نرمی اختیار کرتا ہے۔ قائد انتظامی امور کا ماہر ہوتا ہے۔ وہ صلاحیتوں کی پہچان رکھتا ہے۔ کاموں کی نوعیت کے لحاظ سے مختلف صلاحیتوں کے افراد میں سے مناسب افراد کا انتخاب کرتا ہے۔ اسے اپنے محدود وسائل کو اور محدود انسانی صلاحیتوں کو نصب العین کے حصول کے لیے بہترین طرز پر استعمال کرنا بھی بخوبی آتا ہے۔

نگاہ دوررس: قائد تحریک، ذکاوت اور تیز نگاہی، معاملہ فہمی، حالات کا ادراک، ہواؤں کے رخ کی پہچان، آئندہ کے متوقع حالات کا صحیح اندازہ جیسے معاملات میں مہارت رکھتا ہے۔ وہ بروقت صحیح فیصلہ کرنے اور اسے نافذ کرنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ وہ مختلف حالات میں مناسب فیصلے کر کے

جماعت کو متوقع نقصان سے بچانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ مضبوط قوت ارادی کا مالک ہوتا ہے۔ مشتبہ اور گڈ مڈ حالات میں تردد، تذبذب، حیرت اور درماندگی سے محفوظ ہوتا ہے اور اپنی نگاہ دور رس سے حقیقت نفس الامری کو پالیتا ہے۔ وہ اپنے اوپر شہوات نفس کو غلبہ پانے نہیں دیتا۔ نبی ﷺ کا ایک قول مبارک ہے ''اللہ تعالیٰ شبہات کے نزول کے وقت تیز نگاہی کو اور شہوات کے ہجوم میں عقل کامل کو محبوب رکھتا ہے۔''

امانت عظمیٰ کا احساس: قائد تحریک اسلامی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ قیادت کی ذمہ داری کو اپنا ذاتی، شخصی، موروثی اور خاندانی استحقاق نہیں سمجھتا بلکہ اسے اللہ کی عظیم امانت سمجھتا ہے، چنانچہ وہ جملہ ذمہ داریوں کو اللہ کی امانت سمجھ کر ادا کرتا ہے اور اپنے ماتحت افراد کے ساتھ رحمت، شفقت، اور محبت و مودت کا رویہ اختیار کرتا ہے، وہ نہ اس بات پر پھولتا ہے کہ دوسروں کے مقابلے میں اسے ترجیح دی گئی ہے اور نہ اس بات پر دل گرفتہ ہوتا ہے کہ اس کے مقابلے میں دوسروں کو ترجیح دی گئی۔ اپنے کارناموں کی تشہیر اور دوسروں کی کمزوریوں کو طشت از بام کرنا پسند نہیں کرتا، اس سے جو بھی خیر کا صدور ہوتا ہے اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔

اسلامی قیادت کے تین بنیادی ستون

ا۔ شوریٰ: اہل علم و معرفت اور ارباب حل وعقد سے اہم امور میں مشورہ لینا قیادت کا ایک اہم ستون ہے قرآن مجید نے بھی اس کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک کو اپنے اصحاب سے اہم امور میں مشورہ لینے کا حکم دیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ۔ (شوریٰ:۳۸)

''جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں، ہم نے جو کچھ بھی رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظّاً غَلِيظَ الْقَلْبِ لاَنفَضُّواْ مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّهِ إِنَّ اللّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ۔ (آل عمران:۱۵۹)

''(اے پیغمبر!) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم اِن لوگوں کے لیے نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ

اگر کہیں تم تند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گردو پیش سے چھٹ جاتے۔ان کے قصور معاف کر دو، ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو، اور دین کے کام میں ان کو شریک مشورہ رکھو، پھر تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو، اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسہ پر کام کرتے ہیں۔''

۲۔عدل: قائد کو چاہئے کہ دوسروں کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ کرے، جنسیت وقومیت وعلاقائیت، رنگ وروپ اور مذہب ومسلک اس راہ میں حائل نہ ہونے پائے۔عدل وانصاف کا قیام ہی اسلام کا بنیادی ستون ہے، چنانچہ اس معاملہ میں قائد سمیت پوری جماعت کو چوکنا رہنا چاہیے، قرآن مجید کا ارشاد ہے:

إِنَّ اللّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤدُّواْ الأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُواْ بِالْعَدْلِ۔(النساء:۸۵)

''مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔''

ارشاد باری ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ كُونُواْ قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاء لِلّهِ وَلَوْ عَلَى أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالأَقْرَبِينَ إِن يَكُنْ غَنِيّاً أَوْ فَقَيراً فَاللّهُ أَوْلَى بِهِمَا۔(النساء:۱۳۵)

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علم بردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو، اگر چہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو، فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے۔

۳۔حریت فکر کا تحفظ: فکری آزادی ہی انسان کی اصل معراج ہے اور یہی ترقی کے دروازوں کو کھولتی ہے چنانچہ ایک حساس قائد اس آزادی کا سختی سے تحفظ کرتا ہے، وہ لوگوں کو تعمیری تنقید کے مواقع اور ماحول فراہم کرتا ہے۔ ہر کارکن کو شخصی طور پر اپنی آزاد رائے ظاہر کرنے، اپنے اعتراضات کو سامنے لانے اور اپنے سوالات کے جوابات پانے کا حق حاصل ہے۔ خلفاء راشدین نے حریت فکر کو اپنی سیاست کا اصل الاصول قرار دیا تھا۔ چنانچہ وہ مشہور واقعہ ہم سب کو معلوم ہے جس میں ایک عورت نے حضرت عمرؓ کو مہر کی مقدار طے کر دینے پر ٹوکا تھا اور جس پر حضرت عمرؓ نے اپنی رائے واپس لے لی تھی اور

اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ معاشرہ میں ایسے لوگ موجود ہیں جو حکمراں کی غلطی پر انہیں برملا ٹوک سکتے ہیں۔ حضرت عمرؓ ہی کا واقعہ ہے کہ آپ نے لوگوں سے سوال کیا کہ اگر میں اسلام کے بنیادی احکام میں سے کسی حکم کی مخالفت کروں تو کیا کرو گے؟ تو سامعین میں سے کسی نے جواب دیا کہ ہم آپ کو اپنی تلوار سے سیدھا کر دیں گے، اس پر امیر المومنین نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ امت میں ایسے لوگ موجود ہیں جو عمر کو اپنی تلوار سے سیدھا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اگر عمر راہ راست سے منحرف ہو جائے۔

قائد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسا ماحول پیدا کرے جس میں لوگ آزاد ہو کر غور وفکر کر سکیں، تبادلۂ خیالات کر سکیں اور تعمیری تنقید کر سکیں۔ عام مسلمانوں کو بھی حکم دیا گیا ہے کہ بوقت ضرورت اپنی آراء اور نصیحت قائد کے سامنے پیش کریں۔ حضرت تمیم داریؓ کی وہ مشہور حدیث ہم سب کو معلوم ہے جس میں نبی ﷺ کا ارشاد ہے: دین مکمل نصح وخیر خواہی کا نام ہے۔ ہم صحابہؓ نے پوچھا اے اللہ کے رسول ﷺ کس کے لیے خیر خواہی تو آپ ﷺ نے بتلایا کہ دین خیر خواہی کا نام ہے اللہ کے لیے، اس کے رسول کے لیے، اس کی کتاب کے لیے، قائدین کے لیے اور جملہ مسلمانوں کے لیے۔ مختصراً یہ کہ قائد ڈکٹیٹر شپ کو اختیار نہیں کرتا، نہ بے نظمی اور لاقانونیت کو پسند کرتا ہے کیونکہ سب سے اہم بات جو قائد تحریک کے سامنے ہوتی ہے وہ یہ کہ اپنے آپ کو اللہ کے سامنے جواب دہ سمجھتا ہے اور یہی صفت اسے عام دنیاوی قائدین سے ممتاز کرتی ہے۔

قیادت کے پانچ بنیادی عناصر:

۱۔ وقت کی رفتار پر کنٹرول، وقت کی لگام اپنے ہاتھ میں رکھی جائے، نہ کہ وقت کو اس بات کی اجازت دی جائے کہ وہ ہم پر اپنا کنٹرول کرلے۔ وقت کے ہر ثانیہ اور ہر لمحہ کو اپنے متعین ہدف اور نصب العین کے حصول میں لگا دینا ہی وقت پر کنٹرول حاصل کرنا ہے چنانچہ ایک دانش مند قائد اپنے اور ساتھیوں کے اوقات کا نظام اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ ہر لمحہ حصول مقصد کی راہ میں صرف ہوتا ہے۔

۲۔ قائد کی نظر حقیقی نتائج پر ہو جنہیں محسوس کیا جا سکتا ہو، صرف کام پر توجہ دینا اور نتائج کیا برآمد ہو رہے ہیں اس سے صرف نظر کر لینا ایک حقیقی قائد کا کام نہیں ہے۔

۳۔ اپنے اندر پوشیدہ قوتوں اور صلاحیتوں کو نشو ونما دینا، انہیں ترقی دینا اور بڑھانا اور مقامات ضعف کو کم سے کم کرنا ہم سب کی ذمہ داری ہے، جس سے قائد بھی الگ نہیں ہے۔ دوسروں کے پاس اگر کوئی مفید چیز ہو جو ہمارے مقصد کے حصول میں معاون ہو تو ہمیں اسے اخذ کرنے میں عار محسوس نہیں

کرنا چاہیے۔

۴۔ قائد اپنی سرگرمیوں کو اپنے بنیادی اہداف کے اردگرد ہی مرتکز کرے، ہر چمکدار چیز کی طرف دوڑنا ایک ذی ہوش قائد کی شان کے خلاف ہے۔

۵۔ قائد تحریک کو اپنی ساری صلاحیتوں اور محنتوں کو لگانے کے باوجود صرف اللہ پر بھروسہ ہونا چاہیے کیونکہ اللہ کی ذات ہی اصل مرکز اور محور ہے چنانچہ ہم اسی پر کامل بھروسہ کر کے اپنے کام انجام دیں۔

تحریک اسلامی اور قیادت سازی کے اصول ووسائل:

تحریک اسلامی صرف رضائے الٰہی کے حصول کے لیے کام کرتی ہے اور اس سے وابستہ حضرات اپنے ذاتی اور شخصی اغراض سے کوسوں دور رہتے ہیں اور قائد تحریک قیادت کو ایک عظیم امانت سمجھتا ہے، اس لیے وہ نہایت ہی اخلاص کے ساتھ اس بات کی کوشش کرتا رہتا ہے کہ تحریک میں قیادت کا بحران یا خلا پیدا نہ ہو سکے۔ اس لیے اس کی کوشش ہوتی ہے کہ ایسے افراد بکثرت تیار کیے جائیں جو تحریک کی قیادت کر سکیں اور تحریک میں کبھی بھی قیادت کا بحران پیدا نہ ہو پائے۔ دنیوی تحریکات کا قائد جب تک جان میں جان ہے ہمیشہ قیادت سے چمٹا رہنا چاہتا ہے اور بطیّب خاطر کبھی بھی دوسروں کے لیے جگہ خالی کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس تحریکات اسلامی میں تمام قائدین کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ میں اس آزمائش میں نہ ڈالا جاؤں تو میرے لیے بہتر ہو اور میرے علاوہ کوئی دوسرا اس بارگراں کو اٹھائے تو میرے حق میں اچھا ہو۔ ان کے سامنے نبی ﷺ کی یہ بات پیش نظر ہوتی ہے کہ ''جو شخص اس آزمائش میں ڈالا گیا گویا وہ چھری کے بغیر ذبح کر دیا گیا اور یہ کہ جس شخص پر لوگوں نے قیادت کی ذمہ داری ڈالی ہو اور پھر اس نے اس کے سلسلہ میں ایسی کوشش نہ کی جیسی کوشش وہ اپنے ذاتی کام میں کرتا ہے تو اسے چاہیے کہ جنت کی تمنا نہ کرے''۔ چنانچہ تحریک روز اول سے ہی قائدین کی تیاری کا کام شروع کر دیتی ہے۔

قیادت سازی کے اصول :

(۱) قیادت سازی کا بنیادی اصول یہ ہے کہ وہ ہر طرح کی منفی سوچ، مثلاً علاقائیت، لسانیت اور ذات پات سے بالکل علیحدہ ہوتی ہے، یہاں تقوی، علم دین، فہم وشعور اور جرأت وشجاعت ہی قابل لحاظ امور ہیں، یہاں ذاتی پسند یا ناپسند کا معاملہ نہیں ہوتا، زید بن حارثہؓ اور اسامہ بن زیدؓ کو اس لشکر کی قیادت دینا جس میں اکابر صحابہ بھی موجود تھے اس بات کی واضح دلیل ہے۔

(۲) اس کا دوسرا اصول یہ ہے کہ اسلام میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اسی امیر کی اطاعت واجب ہوگی

جوعلم وفضل میں یکتا ہواور لازماً دیگر افراد جماعت کے مقابلہ میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہو یا یہ کہ وہ جاہ ومنصب میں وسیع الاثر ہو اور زبردست شخصیت کا مالک ہو بلکہ اسلام کا تصور اس کے برعکس ہے، وہ اطاعت وانقیاد کو واجب قرار دیتا ہے، چاہے کوئی بھی امیر ہو، جسے لوگوں نے پسند کیا ہو یا ان کی اکثریت نے اسے اپنا قائد اور امیر منتخب کیا ہو۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے: ''سنو اور اطاعت کرو، چاہے تمہارا امیر کوئی ایسا حبشی غلام ہو جس کا سر منقی کی طرح ہو'' (بخاری) دوسری حدیث ہے ''مسلمانوں کا خون برابر ہے اور ان میں کا ایک کمتر شخص بھی امان دینے کی جدوجہد کر سکتا ہے اور یہ سب دوسروں کے لیے سہارا ہیں''۔

(۳) تیسرا اصول یہ ہے کہ قائد کے اندر تنظیمی صلاحیت کا پیدا ہونا یا پیدا کرنا ایک لازمی امر سمجھا جاتا ہے، علمی مہارت، دعوتی صلاحیت اور زور خطابت ہی کو کافی نہیں سمجھا جاتا کہ جس قائد کے اندر تنظیمی صلاحیت نہیں ہوگی وہ صحیح قیادت نہیں کر سکتا۔

(۴) چوتھا اصول یہ ہے کہ قیادت سازی میں علمی وفکری تربیت ہی پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ عملی تجربات کی بھٹی سے گزارا جاتا ہے، زبانی جمع خرچ کرنے والا عملی میدان کا شہسوار نہیں بن سکتا۔ قائد کی انفرادی واجتماعی زندگی اور عائلی ومعاشرتی زندگی شفاف آئینہ کی طرح ہوتی ہے جو عام لوگوں کے لیے ایک بہترین نمونہ ہوتی ہے۔

قیادت سازی کے وسائل:

علمی وفکری غذا

قائدین کی علمی وفکری تربیت کے ضمن میں اسلام سب سے پہلے اس کے حس، شعور اور فکر وتصور کو اپیل کرتا ہے تاکہ انہیں معاملات کی حقیقت اور اشیاء کے جوہر کا بخوبی علم ہو سکے، اسے اپنی اور کائنات کی حقیقت کا ادراک ہو سکے۔ اس کے لیے اسلام نے اس کے سامنے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی بے ثباتی کی وضاحت کی ہے اور اللہ کے نزدیک اس کی بے وقعتی ظاہر کی ہے تاکہ اس کی گمراہیوں اور فتنوں سے محفوظ رہا جائے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَالآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۔ (النساء:۷۷)

''ان سے کہو، دنیا کا سرمایۂ زندگی تھوڑا ہے اور آخرت ایک خداترس انسان کے لیے زیادہ بہتر ہے''۔

حدیث پاک ہے: ''یہ بکری جتنی اپنے مالک کے نزدیک بے وقعت ہے اس سے کہیں زیادہ بے وقعت اللہ کے نزدیک یہ دنیا ہے''۔

اسلام نے اس سے خبردار کیا ہے کہ دنیا مقابلہ آرائی اور تنافس کی آماجگاہ اور مرکز بن جائے۔ حدیث میں ہے: ''جو شخص دنیا کو محبوب بنالے اور اسی میں مگن رہے اس کے دل سے آخرت کا خوف نکل جاتا ہے''۔ آیت قرآنی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ (التوبہ:۱۱۱)

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں''۔

اسی طرح اسلام نے علمی وفکری تربیت کرکے لوگوں کو دنیا کی محبت سے نکالا اور آخرت کے لیے کام کرنے پر آمادہ کیا۔

عملی وتجرباتی بھٹی

مکی دور میں دار ارقم میں عملی تربیت۔

عوام کے افکار ونظریات پر پے در پے حملے، اس پر جاہلیت کا چراغ پا ہوکر مسلمانوں کے لیے آزمائش کی بھٹی تیار کرنا۔

نمونے سیرت رسول ﷺ سے :

نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ''کوئی کسی کی شکایت مجھ سے نہ کرے، میں چاہتا ہوں کہ میرے دل میں کسی کے خلاف کوئی کدورت نہ ہو''۔

حضرت علیؓ کہتے ہیں: ''آپ ﷺ ہمیشہ خندہ پیشانی اور حسن خلقی سے متصف رہتے اور آپ ﷺ نرم مزاج تھے۔ نہ آپ ﷺ سخت گو تھے نہ سخت دل۔ نہ آپ ﷺ چلا کر بولتے نہ فحش گوئی اور بدکلامی کرتے۔ نہ عیب گیر تھے کہ دوسروں کے عیب پکڑیں نہ زیادہ مبالغہ سے تعریف کرنے والے۔ نہ زیادہ مذاق کرنے والے اور نہ بخیل۔ آپ ﷺ ناپسندیدہ باتوں سے اعراض کرتے۔ آپ ﷺ نے جھگڑے، تکبر اور فضول گوئی سے اپنے کو علیحدہ کر رکھا تھا۔ نہ کسی کی مذمت فرماتے نہ کسی کو عیب لگاتے۔ اپنی ذات کے لیے آپ ﷺ نے زندگی بھر کسی سے بدلہ لیا اور نہ کسی خادم کو ڈانٹا۔

تمام لوگوں کی خدمت کے لیے ہمہ وقت مستعد رہتے، حاجت مندوں کی حاجت پوری کرتے، کوئی بھی مرد یا عورت کسی بھی وقت آپ ﷺ سے اپنی ضروریات کی تکمیل کرالیتا، گھر میں جھاڑو لگاتے، آٹا گوندھ لیتے، جوتے ٹانک لیتے، سفر میں اجتماعی خدمت میں برابر کے شریک ہوتے، ایک سفر میں کھانا بنانے کے لیے لکڑی لانے کی ذمہ داری لی تھی، نبوت سے قبل والی زندگی میں بھی بقول حضرت

خدیجہؓ آپ ﷺ غریب پرور، مہمان نواز، دوسروں کا بوجھ اٹھانے والے اور غلاموں کے مولیٰ اور یتیموں کے والی تھے۔ آپ ﷺ کافر کی بھی ضیافت فرماتے، خود اپنے ہاتھ سے خدمت کرتے اور کھانا کھلاتے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا سکہ سب پر جما ہوا تھا، دوست اور دشمن سب ہی آپ ﷺ کو امین اور صادق کے لقب سے پکارتے، کفار باوجود دشمنی کے اپنی امانتیں آپ ﷺ کے پاس رکھتے تھے۔

آپ ﷺ کے کردار کی عظمت ہی تھی جس سے متأثر ہو کر ابوجہل جیسے کٹر دشمن نے آپ ﷺ کے کہنے پر قبیلۂ آراش کے ایک شخص کے اونٹوں کی قیمت بلا چوں و چرا دے دی تھی، جبکہ تمام سرداران قریش کو ہمت نہ ہوئی کہ ابوجہل سے کچھ کہہ پاتے۔

آپ ﷺ کے کردار کی عظمت ہی تھی جس سے متأثر ہو کر زید بن حارثہؓ نے آزادی پر غلامی کو ترجیح دی تھی۔ آپ ﷺ جب مجلس میں بیٹھتے تو سب کے برابر بیٹھتے کوئی نیا شخص آتا تو اس کو پوچھنا پڑتا کہ محمد ﷺ کون ہیں؟ ایک مرتبہ نبی ﷺ ایک کنویں پر نہا رہے تھے، ایک صحابی جب تک آپ نہاتے رہے ایک کپڑے سے پردہ کیے کھڑے رہے، جب آپ فارغ ہوئے تو صحابی نے نہانا شروع کیا اور حضور ﷺ باوجود صحابی کے منع کرنے کے ان کی اوٹ کر کے کھڑے رہے۔

طائف کا واقعہ کردار نبوی کی زندہ تصویر ہے جبکہ آپ ﷺ نے حضرت زیدؓ کی بددعا کی درخواست پر یہ دعا کی تھی: ''اے اللہ! اہل طائف کو ہدایت دے اور ان کو اسلام کے آستانے پر جھکا دے''۔ اور پہاڑ کے فرشتے کو جواب دیا.....ان کی نسل اللہ پر ایمان لائے گی۔ (ان شاء اللہ)

آپ ﷺ بہترین منتظم تھے، ہجرت کے بعد مدینہ کی چھوٹی سی بستی میں جب آبادی اور وسائل کا توازن بگڑنے لگا اور وسائل کی قلت ہونے لگی تو آپ ﷺ نے مواخات کے ذریعہ بہترین انتظام فرمایا۔ غزوات و سرایا کا انتظام ایسے طریقوں پر کیا جن سے مفید نتائج برآمد ہوئے، تعلیمی و تبلیغی وفود کی ترسیل، فوجوں کی تشکیل، جنگ کے وقت مدینہ کی حفاظت جیسے امور کو آپ ﷺ نے بہتر انداز میں فرمایا۔

قریش کے ایک معزز خاندان کی ایک عورت نے چوری کی اور اس جرم میں ماخوذ ہو گئی، جس سے قریش میں کھلبلی مچ گئی، وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ سزا سے بچ جائے لیکن لوگ مزاج شناش تھے، عرض کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ بمشکل لوگوں نے اسامہ بن زیدؓ سے جو نبی ﷺ کو بہت پیارے تھے سفارش کرائی۔ سنتے ہی چہرۂ انور سرخ ہو گیا، فرمایا: ''پہلی قومیں اسی وجہ سے تباہ ہو گئیں کہ وہ معززین کو چھوڑ دیتی تھیں اور غریبوں پر حد نافذ کرتی تھیں۔ خدا کی قسم! اگر میری بیٹی فاطمہؓ چوری کرتی تو میں اس کا

ہاتھ بھی کاٹ دیتا''۔آپ ﷺ نے کبھی اپنے نفس کے لیے کوئی انتقام نہیں لیا۔

قریش نے عتبہ کے ذریعہ عرب کی سرداری، بیش از بیش دولت، عرب کی سب سے حسین لڑکی اور پورے عرب کی بادشاہی کا لالچ دیا، مگر اس کے جواب میں سورہ حم السجدۃ کی ابتدائی آیات پڑھ کر آپ ﷺ نے سنائیں۔

ابوطالب سے سرداران مکہ نے شکایت کی تو اس پر ابوطالب نے عرض کیا:''پیارے بیٹے مجھ پر اتنا بار نہ ڈال جسے میں برداشت نہ کرسکوں''۔آپ ﷺ کا جواب تھا:''چچا جان! اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند بھی لاکر رکھ دیں، تب بھی خدا کی قسم میں اس کام کو نہ چھوڑوں گا، یہاں تک کہ خدا غلبہ بخش دے یا میں خود اس راہ میں قربان ہو جاؤں''۔

☆ واقعہ افک کے موقع سے نبی ﷺ کا صبر وضبط۔

☆ فتح مکہ کے بعد اپنے اوپر ظلم کرنے والوں کے ساتھ معاملہ۔

☆ صلح حدیبیہ میں آپ ﷺ کی سیاسی بصیرت۔

☆ طائف کے واقعہ میں امت پر آپ کی رحمدلی۔

امانت عظمیٰ کا احساس :

اپنے منصب کی سنگینی کے احساس نے آپ ﷺ کو ہمہ تن دعوت بنادیا تھا، اٹھتے بیٹھتے، آتے جاتے آپ ﷺ بنی نوع انسانی کی ہدایت کی فکر اپنے اوپر سوار رکھتے۔اسی فکر میں آپ ﷺ کی راتوں کی نیند اڑ گئی تھی، آپ ﷺ کا سکون ختم ہو گیا تھا، آپ ﷺ کو ہر وقت یہ سوچ تڑپائے رکھتی تھی کہ اللہ کو بھولی ہوئی دنیا کو کس طرح اللہ کی یاد دلائیں، جو لوگ سچائی کی راہ سے بھٹک گئے ہیں انہیں کس طرح حق کی راہ دکھائیں، آدم کی اولاد اپنے انجام سے بے خبر ہے اسے کس طریقہ سے اس کے انجام سے خبردار کریں اور انسان جو ہلاکت کی طرف بڑھ رہا ہے کس تدبیر سے اس کو ہلاکت سے بچائیں، اسی لیے آپ ﷺ نے دعوت حق کے کام کو تمام کاموں پر مقدم رکھا اور اسی مقصد کی راہ میں اپنی ساری قوت صرف کر دی۔

غزوہ بدر کے موقع پر سواریاں کم تھیں، تین تین آدمیوں کے حصہ میں ایک ایک اونٹ آیا، نبی ﷺ نے بھی اپنے ساتھ دو آدمی شامل کر لیے، ان دونوں نے عرض کیا: ہم پیدل چلیں گے آپ ﷺ سوار رہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: نہ تم مجھ سے زیادہ پیدل چل سکتے ہو اور نہ میں تم سے کم ثواب کا مستحق ہوں۔

نبی اکرم ﷺ کی کشادہ دلی

نسیبہ سبحانی، نئی دہلی

محسن انسانیت حضرت محمدؐ کا یہ کیسا بے مثال کارنامہ ہے کہ آپؐ نے ۲۳/سال کی مختصر سی مدت میں کسی ایک آدمی کی نہیں بلکہ پورے جزیرۂ عرب کی کایا پلٹ دی، بے شمار زندگیوں میں زبردست انقلاب برپا کردیا! اتنی مختصر سی مدت میں اتنے وسیع پیمانے پر یہ عظیم انقلاب کیسے آ گیا؟ ذہن وضمیر اور اخلاق وکردار کی دنیا میں یہ زبردست ہلچل کیسے مچ گئی؟ یہ ایک فطری سوال ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آپؐ کی کشادہ دلی، عالی ظرفی، نیک نفسی اور خوش اخلاقی ہی تھی جس نے عرب کی کایا پلٹ دی۔ نبیؐ کے پیار ومحبت اور آپؐ کی بے پناہ رحمت وشفقت کے حسین جلوے ہی تھے جس نے بے شمار زندگیوں میں انقلاب برپا کردیا۔ لوگ آپؐ کو گالیاں دیتے، آپؐ پر پتھراؤ کرتے تو آپؐ ان کو دعا دیتے، ان کی بدنصیبی پر دردوکرب کے آنسو بہاتے۔

آپ ﷺ کی اسی عالی ظرفی وکشادہ دلی کی ایک جھلک ہم یہاں دیکھیں گے۔ مکے سے ایک سو میل کے فاصلہ پر ایک بستی ہے جس کا نام طائف ہے۔ آپؐ وہاں کے لوگوں کی محبت اور خیر خواہی میں وہاں کے لیے روانہ ہوئے تاکہ انہیں الٰہ واحد کا پیغام سنائیں اور اس کی بندگی کی دعوت دیں۔

مگر ان بدبختوں نے محبت کا جواب نفرت سے دیا بھلائی کا جواب برائی سے دیا، انہوں نے ظلم و بربریت کی انتہا کردی اور آپؐ پر اس طرح پتھراؤ کیا کہ آپؐ سر سے پاؤں تک لہولہان ہوگئے۔

مگر اللہ اللہ! اہل طائف کی ان وحشیانہ حرکتوں کے باوجود آپؐ مہر ومحبت کا پیکر بنے رہے۔ آپؐ کی زبان مبارک پر کوئی ایک بددعا یا فریاد نہیں آئی۔

بس ایک تڑپ تھی کیسی تڑپ انسان ہدایت پا جائے

آپؐ اس ظلم و بربریت کے ماحول میں دس دن تک ٹھہرے رہے، وہاں جو بھی سمجھ دار اور بااثر لوگ تھے آپؐ ان کے دروازوں پر جاتے رہے، ان کو اسلام کی دعوت دیتے، اور گالیاں سنتے رہے۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ طائف کا قصہ بیان کرتے ہوئے فرماتی ہیں، میں نے رحمت

عالمؐ سے ایک روز دریافت کیا: کیا احد کے دن سے بھی زیادہ سخت دن کبھی آپ پر گزرا ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا: تمہاری قوم کے ہاتھوں مجھ پر بہت سے ایسے دن گزرے ہیں، ان میں سب سے زیادہ کٹھن دن طائف کا دن تھا۔ میں نے اس دن ابن عبد یالیل بن عبدکلال کی حمایت وحفاظت حاصل کرنی چاہی مگر اس نے صاف انکار کردیا۔

میں حزن وغم میں ڈوبا ہوا آگے بڑھتا رہا، مسلسل آگے بڑھتا رہا، قرن الثعالب پہنچ کر کچھ طبیعت بحال ہوئی، میں نے سر اوپر اٹھایا تو دیکھا، مجھ پر بادل کا ایک ٹکڑا سایہ فگن ہے اور اس کے ساتھ حضرت جبرئیل ہیں۔ حضرت جبرئیلؑ نے مجھے آواز دی!

آپ کی قوم نے آپ کے ساتھ جو بدسلوکی کی ہے اور آپ کی جیسی دل آزاری کی ہے اللہ تعالیٰ نے سب کچھ سن لیا، اور سب کچھ دیکھ لیا ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کے پاس اس فرشتہ کو بھیجا ہے جو پہاڑوں کا ناظم ہے، ان لوگوں کو جو بھی سزا دلانا چاہیں، اس کے ذریعہ دلا سکتے ہیں! اتنے میں اس فرشتے نے مجھے آواز دی، اس نے مجھے سلام کیا اور کہا! آپ کی قوم نے آپؐ کو جو جواب دیا ہے، اللہ تعالیٰ نے وہ سب کچھ سن لیا ہے، میں پہاڑوں کا ناظم ہوں اللہ نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے، ان لوگوں کو جو بھی سزا آپ دینا چاہیں، بے تکلف مجھ سے کہہ سکتے ہیں، اگر آپؐ کہیں تو ان دونوں پہاڑوں کو جس کے درمیان یہ آباد ہیں آپس میں ملا دوں، یہ سب بالکل پس کر رہ جائیں گے۔

آپؐ نے فرمایا نہیں، انہیں نیست و نابود نہیں کرنا ہے! مجھے امید ہے اللہ ان سے ایسی نسلیں پیدا کرے گا جو خالص اللہ کی عبادت کریں گی، کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہرائیں گی۔

بل أرجو أن يخرج الله من أصلابهم من يعبد الله وحده لا يشرك به شيئا۔

آپؐ کی یہی عالی ظرفی اور کشادہ دلی اس وقت بھی نظر آتی ہے جب ۶ ہجری میں عمرے کی غرض سے مکہ کی جانب روانہ ہوئے۔ ساتھ میں چودہ سو جاں نثاروں کا قافلہ تھا۔

مکہ میں قریش کو جب آپ کی آمد کی اطلاع ملی تو انہوں نے آپس میں قسمیں کھائیں کہ محمدؐ یا ان کے کسی ساتھی کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے اور انہوں نے مکہ کے قریب ہی مدینہ کے راستہ میں ایک مقام پر خالد بن ولید کو جو اس وقت ایمان نہیں لائے تھے ایک چھاپہ مار دستہ کے ساتھ بھیج دیا تاکہ وہ مسلمانوں کی گھات میں بیٹھ جائیں اور رات میں ان پر شب خون مار دیں۔

آپؐ کے جاں نثاروں نے ان میں سے کچھ کو پکڑ لیا اور ان کو رسول اقدسؐ کی خدمت میں لے کر

حاضر ہوئے۔ رحمت عالم ﷺ اگر چاہتے تو ان کی بوٹیاں کروا دیتے اور کوئی انہیں آپؐ کے غضب سے بچا نہیں سکتا تھا۔ مگر آپؐ ان جانی دشمنوں کے ساتھ الفت ومحبت سے پیش آئے اور ان کے ساتھ فراخ دلی اور عالی ظرفی کا برتاؤ کیا۔

رحمت عالم ﷺ نے کفار ومشرکین کی کتنی گالیاں سنیں، ان کے ہاتھوں کتنی اذیتیں سہیں، کتنی تکلیفیں جھیلیں، ایک دو سال نہیں برسہا برس جھیلیں۔ پھر ایک وقت تو ایسا آیا کہ قریش آپؐ کو قتل کر دینے کی سازش کرنے لگے۔ قریش نے آپؐ اور آپ کے جاں نثاروں کا سوشل بائیکاٹ کر دیا، مسلمانوں سے لین دین اور خرید وفروخت کرنے پر پابندی لگا دی، اس وقت آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں نے جو فاقے کیے ہوں گے اس کے تصور سے ہی دل کانپ اٹھتا ہے، اس وقت ان پر وہ دن بھی آیا جب انہوں نے درخت کی پتیوں پر گزارا کیا۔ ہجرت کا آٹھواں سال تھا آب وہوا کا رخ بدل چکا تھا، اسلام پوری طرح غالب آ چکا تھا، نبیؐ اپنے دس ہزار جانبازوں پر مشتمل فوج ظفر موج کے ساتھ مکہ میں داخل ہوئے۔

آیئے دیکھیں، اب آپؐ نے ان کفار ومشرکین کے ساتھ کیا سلوک کیا، جنہوں نے آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں پر ظلم کے پہاڑ توڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ آپؐ مکہ میں داخل ہوتے ہیں تو سب سے پہلے کعبہ میں براجمان بتوں کو توڑتے اور تصویروں کو صاف کرتے ہیں، اس کی دھلائی کر کے اس میں دوگانہ شکرانہ ادا کرتے ہیں اور اس میں خوب خوب اپنے رب کی حمد وتسبیح اور تہلیل وتکبیر کرتے ہیں۔ کعبہ کے باہر قریش کا مجمع تھا یہ لوگ پریشان اور بیتاب تھے کہ ان کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جاتا ہے؟ انہیں خوب اچھی طرح معلوم تھا کہ جو مظالم انہوں نے آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں پر ڈھائے ہیں اس کے بعد کسی بخشش کی گنجائش نہیں۔ آپؐ کعبہ کی دہلیز پر کھڑے ہوئے، آج ان کی آواز میں جلال تھا۔ آپؐ نے فرمایا: تمہارا کیا خیال ہے، بتاؤ آج میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟ سب ایک ساتھ پکار اٹھے: اچھا سلوک، اچھا سلوک! آپ اچھے بھائی ہیں، اچھے بھائی کے بیٹے ہیں۔ فرمایا جاؤ تم سب آزاد ہو، آج تم پر کوئی گرفت نہیں۔

ابوسفیان بن حارث آپؐ کا کٹر دشمن تھا، آپؐ سے دشمنی میں ہمیشہ پیش پیش رہا، اس نے آپ پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ لیکن آپؐ نے اس موقع پر نہ صرف اس کا اسلام قبول کیا بلکہ اس کو فخر کا نشان بھی مرحمت فرمایا: آپؐ نے فرمایا: ابوسفیان اپنی قوم میں جاؤ اور کہو محمدؐ مکے میں ایک اچھے بھائی کی طرح داخل ہوں گے۔ آج کوئی غالب ہے نہ کوئی مغلوب، کوئی فاتح ہے نہ

مفتوح، آج تو محبت اور رحمت کا دن ہے۔ آج تو امن وامان اور اطمینان کا دن ہے، جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوجائے اسے بھی امان ہے، جو اپنے گھر کے دروازے بند کرلے اسے بھی امان ہے، جو مسجد حرام میں داخل ہوجائے اسے بھی امان ہے۔

اللہ اللہ! اس قدر پیاری اور محبت بھری باتیں، وہ بھی کن لوگوں سے، یہ وہی قریش تو ہیں جن کے مظالم سے تنگ آ کر آپؐ نے رات کے وقت یہاں سے ہجرت کی تھی، یہ وہی قریش تو ہیں جو آپؐ کے خون کے پیاسے تھے، یہ وہی قریش تو ہیں جو محسن انسانیت کے باغی اور پیکر رحمت کے دشمن تھے، ان میں وہ لوگ بھی تھے جو اسلام کو مٹانے کے لیے جان کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ اور ان میں وہ لوگ بھی تھے جو اسلام کے خلاف زہر اگلنے کے لیے خود کو وقف کر چکے تھے، اور ان میں وہ لوگ بھی تھے جنھوں نے آپؐ کی راہ میں کانٹے بچھائے تھے اور ان میں وہ لوگ بھی تھے جنھوں نے آپؐ کو قتل کرنے کی ناپاک سازش کی تھی۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جنھوں نے آپؐ پر پتھر برسائے تھے اور آپؐ کی ایڑیوں کو لہولہان کر دیا تھا، اور ان میں وہ لوگ بھی تھے جو آپؐ کے جاں نثاروں کو تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر چٹانوں سے دبا دیتے تھے اور ان کے نحیف وکمزور جسم کو گرم سلاخوں سے داغتے تھے۔

اس وقت جبکہ آپ دس ہزار جانباز سپاہیوں کے ساتھ مکہ میں داخل ہو رہے تھے، آپ ایک مضبوط طاقت تھے، اگر آپ چاہتے تو مکہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے لیکن یہاں تو ماجرا ہی کچھ اور تھا، آپؐ نے فرمایا جاؤ تم سب آزاد ہو، آج تم پر کوئی گرفت نہیں۔

آپؐ کی یہ شان کریمی، آپؐ کی رحمت ورأفت، عفو درگزر، فراخ دلی، عالی ظرفی، نیک نفسی اور خوش اخلاقی ہی تھی جس نے اہل مکہ کو مسحور کر دیا، ان کی آنکھوں سے پردہ ہٹا دیا۔ پھر کیا تھا وہ خود ہی اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوگئے اور سارے بتوں کو توڑ ڈالا، پھر رسول اقدسؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ ان اسلام لانے والوں میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، بہت سے سرکش مشرکین نے بھی اس موقع پر اسلام قبول کیا، جن میں عکرمہ بھی تھے، یہ ابوجہل کے بیٹے تھے۔ ہندہ ابوسفیان بن حرب کی بیوی تھی، باپ کا نام عتبہ تھا، جنگ احد میں آپؐ کے پیارے چچا حضرت حمزہؓ شہید ہوئے تو یہ ان کا کلیجہ چبا گئی۔۔ لیکن نبیؐ کی فراخ دلی اور کشادہ دلی تو دیکھئے آپؐ نے اس کا بھی اسلام قبول کیا، تاریخ میں کہیں بھی اس فراخ دلی کی مثال نہیں مل سکتی، یقیناً آپؐ محبت ورأفت میں اپنی مثال آپ تھے۔

بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جن کے بارے میں آپؐ بہت سخت تھے، ان کے بارے میں تو آپؐ

نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ان کو جہاں دیکھو قتل کردو، چاہے وہ خانہ کعبہ کے غلاف سے ہی کیوں نہ لپٹے ہوئے ہوں، لیکن ان کے بارے میں آپؐ سے امان کی درخواست کی گئی تو آپؐ نے اس کو قبول بھی کرلیا۔

ان ہی میں عبداللہ بن ابی سرح بھی تھے۔ یہ مدینہ میں کاتبین وحی میں سے تھے۔ پھر مرتد ہوکر مکہ چلے گئے اور یہ پروپیگنڈہ کیا کہ محمدؐ کہتے ہیں کہ ان کے پاس وحی آتی ہے، وحی کہاں آتی ہے، یہ سب ڈھونگ ہے، یہ تو ان کے کچھ ساتھی ہیں جو انہیں لکھ لکھ کر دیتے ہیں، ان ہی لوگوں میں سے میں بھی تھا، کتنی بار میں نے ان کو لکھ لکھ کر دیا۔ کتنا سنگین تھا یہ جرم! لیکن یہ جرم بھی آپؐ نے معاف کردیا۔ اور معاف کیوں نہ کرتے آپؐ تو رحمت و رأفت کا پیکر تھے، عفو و درگزر کے خوگر تھے، آپؐ جانتے ہی نہ تھے کہ کینہ وعداوت کیا شے ہے، دشمنی و نفرت کیا بلا ہے، یقیناً آپؐ انسان تو تھے لیکن انسانی پستیوں سے بہت بلند تھے۔

اب ہم نظر ڈالتے ہیں اسی رحمۃ للعالمین کی امت پر تو ہماری حالت یہ ہے کہ کوئی کسی کو قبول کرنے یا کسی سے درگزر کرنے کو تیار نہیں ہے۔ یہ اسی تنگ دلی کا نتیجہ ہے کہ امت مختلف فرقوں میں بٹ کر رہ گئی ہے، ہم نے اپنے نبیؐ کے اسوہ کو فراموش کردیا ہے، غیر مسلموں کو اپنے اسلام سے متأثر کرنا تو دور کی بات ہے، مسلمان آپس میں ہی فرقوں میں بٹ کر رہ گئے ہیں، ہر فرقہ دوسرے فرقہ کو غلط ثابت کرنے کے درپے ہے حالانکہ ع حرم پاک بھی قرآن بھی اللہ بھی ایک

اگر ہم قرآن وسنت کو مضبوطی سے تھامے رہیں تو کسی اختلاف کی گنجائش نہیں۔ رحمت عالمؐ کے امتی ہونے کی حیثیت سے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم بھی تمام انسانوں کے لیے الفت ومحبت اور رحمت وشفقت کا پیکر ہوں، ہم بھی رحمت عالمؐ کی طرح مصیبتوں میں ان کے کام آئیں اور دکھ درد میں ان کے ساتھ شریک ہوں۔ ہم اپنے اخلاق، اپنی گفتگوؤں اور اپنے ایثار ومحبت اور اپنی عالی ظرفی اور خوش اخلاقی سے لوگوں کو متأثر کریں جس طرح ہمارے نبی ﷺ کا شیوا رہا ہے۔ نبیؐ نے کبھی کفار سے بھی نفرت نہیں کی بلکہ کفار کے لیے ہمیشہ آپؐ کے ہاں دل سوزی اور ہدایت کی تڑپ دیکھی گئی۔

اگر کوئی ہمارے نبی یا ہمارے دین کو برا بھلا کہتا ہے تو اس پر طوفان کھڑا کرنے کے بجائے ہمارا فرض ہے کہ دل سوزی سے اسے سمجھائیں اور اسے راہ راست پر لانے کی کوشش کریں۔

ہمارے نبیؐ کا ایثار ومحبت اور ان کی دل سوزی ہی تھی جس نے مختصر سی مدت میں پورے عرب کی کایا پلٹ دی، یقیناً اسلام تلوار کے بل پر نہیں پھیل سکتا، اسلام تو امن وسلامتی کا دین ہے اور دنیا کو آج ضرورت ہے اسی امن وسلامتی کی۔

رسول خدا ﷺ کا کفار سے حسن سلوک

محمد انس فلاحی سنبھلی،
اسلامی یونیورسٹی، مدینہ منورہ

رسول اللہ ﷺ کی ذات اور کردار انسانی تاریخ کا وہ حسین ترین باب اور نمونہ ہے، جس کی نظیر رہتی دنیا تک پیش نہیں کی جاسکتی ہے۔ ایک انسان کے دوسرے انسان سے تعلقات کی جتنی نوعیتیں ہوسکتی ہیں، ان میں آپ ؐ کی زندگی کامل نمونہ ہے۔ عائلی، سماجی، معاشی، تجارتی، بین الاقوامی، الغرض دشمن اور دوست سے معاملات اور تعلقات کے سلسلے میں آپ ﷺ کی زندگی کا ہر گوشہ اور ہر پہلو اسوۂ حسنہ کی سچی اور مکمل تصویر ہے۔ انسانی تاریخ اب یہ ریکارڈ کسی دوسرے کے لیے لکھنے سے قاصر رہے گی کہ دوست تو دوست، دشمن بھی جسے صادق وامین کے لقب سے پکاریں، جس سے دشمنی اور نفرت کے باوجود اپنی امانتیں اسی کے پاس رکھنے میں عافیت سمجھیں۔

رسول اللہ ﷺ کو رحمت بنا کر بھیجا گیا تھا، تمام جہانوں کے لیے اور تمام جہان والوں کے لیے، اس سے کوئی محروم رہا اور نہ رہے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''وما أرسلناك الا رحمة للعالمين''۔

''اے نبیؐ، ہم نے تو تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے''۔(۱)

آپ ﷺ کی رحمت وشفقت، اخوت ومحبت صرف مومنین یعنی آپ ﷺ پر ایمان لانے والوں کے لیے ہی نہ تھی، بلکہ آپ ﷺ کی رحمتوں اور شفقتوں سے آپ ﷺ کے ازلی وابدی دشمن بھی محروم نہ رہے۔ بھلا ایسا کیوں نہ ہو؟ جس کی بعثت ہی سارے جہاں کے لیے رحمت ہو۔ حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''أيها النَّاسُ انَّمَا اَنَا رَحمَةٌ مُهدَاۃٌ''۔(۲)

''اے لوگو سنو! میں تو صرف رحمت اور ہدایت کا ذریعہ ہوں''۔

آپ ﷺ کے سراپا رحمت ہونے کا ہی نتیجہ تھا کہ آپ ﷺ راہِ راست سے بھٹکے ہوئے لوگوں کے

لیےاس قدر تڑپتے اور غمزدہ رہتے تھے کہ باری تعالیٰ کو کہنا پڑا:

’’ فلعلك باخع نفسك على آثارهم ان لم يومنوا بهذا الحديث أسفا‘‘۔

’’اچھا، تو اے نبیؐ شاید تم ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھودینے والے ہو اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے‘‘۔(۳)

کتبِ سیرت میں ایسے واقعات بھرے پڑے ہیں جو حضورؐ کے اس دردو غم اور تڑپ کو بیان کرتے ہیں۔

بد دعا نہیں ہمیشہ دعاگو تھے

طائف کا مشہور واقعہ ہے، جب آپ ﷺ وہاں دعوت دینے کے لیے گئے، وہاں کے لوگوں نے دعوت قبول کرنا تو درکنار آپ ﷺ کو وہاں قیام کی بھی اجازت نہ دی، اور مزید ستم یہ کیا کہ آپ ﷺ کے پیچھے شرپسند لڑکے لگا دیے جو آپؐ پر پتھر برسا رہے تھے، یہاں تک کہ آپ لہولہان ہو گئے، ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ ملک الجبال کو بھیجتا ہے، ملک الجبال کہتا ہے:

’’اے محمد! ﷺ اگر تم چاہو تو ان لوگوں کو پہاڑوں کے نیچے کچل دوں؟‘‘

رسول ﷺ نے فرمایا: (نہیں) بلکہ مجھے امید ہے کہ اللہ ان کی نسلوں میں ایسے لوگوں کو پیدا کرے گا، جو اللہ واحد کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے‘‘۔(۴)

مخالفین کی سخت اذیتیں سہنے کے باوجود بھی رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے حرفِ بد دعا بھی نکلا۔ کیا اس سے زیادہ رحمت و شفقت کی کوئی اور بھی مثال پیش کی جاسکتی ہے؟

آپ ﷺ نے ہمیشہ مشرکین کی ہدایت ہی کے لیے دستِ دعا دراز کیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا کہ مشرکین کے لیے بد دعا کیجیے، آپ ﷺ نے فرمایا:

’’اِنِّی لَمْ أُبعَثُ لَعَّانًا، وَاِنَّمَا بُعِثتُ رَحمَةً‘‘۔(۵)

’’میں لعنت بھیجنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا ہوں، بلکہ مجھے تو رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے‘‘۔

غزوہ احد کے دن جب آپ ﷺ کے دندانِ مبارک بھی شہید ہو گئے اور مشرکین آپ ﷺ کی جان کو آ گئے تھے، آپ ﷺ کو قتل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، ایسے موقع پر بھی رسول اللہ ﷺ یہی کہتے ہیں:

اللّٰهُمَّ اغفِرُ لِقَومِی فَاِنَّهُم لَا یَعلَمُونَ‘‘۔(۶)

اے اللہ میری قوم کی مغفرت فرما (ان سے درگزر کا معاملہ کر اور انہیں ہدایت دے دے)، وہ جانتے نہیں ہیں''۔(۷)

عفوودرگزر تھی ان کی شان

صلح حدیبیہ کے دن قریش نے ایک دستہ بھیجا تا کہ وہ مسلمانوں پر حملہ آور ہو،لیکن یہ لوگ گرفتار کر لیے گئے گو کہ یہ سخت شرارت تھی لیکن رحمتِ عالمﷺ کا دامنِ عفو اس سے زیادہ وسیع تھا' آپﷺ نے سب کو چھوڑ دیا اور سب کو معافی دے دی۔(۸)

بنی زریق کے ایک یہودی لبید بن الاصم نے آپﷺ پر جادو کیا، آپﷺ کو معلوم ہوا تو آپﷺ نے اس سے درگزر کا معاملہ کیا۔آپﷺ نے اس اعرابی کو بھی بخش دیا جس نے چپکے سے آپﷺ کی تلوار لے لی تھی اور قتل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا،آپﷺ نیند سے بیدار ہوئے تو اس نے کہا: اب تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟ رسول اللہﷺ کا ''اللہ'' کہنا ہی تھا کہ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور آپﷺ نے تلوار لے لی اور اسے معاف کر دیا۔(۹)

یہ آپﷺ کی رحمت ہی تھی کہ آپﷺ نے منافقین کی حرکتوں،سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے مکمل واقف ہونے کے بعد بھی ان سے کسی طرح کی کوئی باز پرس نہیں کی۔آپﷺ ایک ایک منافق کو جانتے تھے، یہ بھی جانتے تھے کہ منافقین جہنم کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے،اس کے باوجود رسول اللہﷺ نے ہمیشہ ان سے درگزر کا معاملہ کیا۔

فتح مکہ کے دن معافی کا اعلیٰ نمونہ

فتح مکہ کے دن حضورﷺ مکہ میں داخل ہوتے ہیں،اس دن وہ سب لوگ جمع تھے جو آپﷺ کے خون کے پیاسے تھے،جن کی ریشہ دوانیوں اور اذیتوں سے آپﷺ مسلسل دوچار رہے، وہ بھی موجود تھے جو آپ کو گالیاں دیتے تھے، وہ بھی آ گئے تھے جو آپﷺ کو لہولہان کرنے سے بھی باز نہ آئے تھے۔الغرض وہ سب جمع ہو گئے تھے جنھوں نے آپﷺ اور مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا تھا۔ رسول اللہﷺ چاہتے تو ایسے لوگوں کی ایک فہرست تیار کراتے، پھر ایک ایک کی خبر لیتے،ایک ایک سے چن چن کر بدلہ لیتے،لیکن حضورﷺ کو تو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا گیا تھا۔رحمت کا جو تقاضا تھا آپ نے وہی کیا، خطبے کے بعد آپﷺ نے کفارِ مکہ کی طرف دیکھا اور کہا: کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں آج تمہارے ساتھ کیا کرنے والا ہوں؟ کفارِ مکہ بھی آپﷺ کے عفوودرگزر سے واقف تھے، کہنے لگے:

خَیرًا، أَخٌ کَرِیمٌ، وَابنُ أَخٍ کَرِیمٍ۔
’’تو شریف بھائی اور شریف برادرزادہ ہے‘‘ آپ ﷺ نے سراپا رحمت ہونے کا ثبوت دیا اور کہا:
’’ اذهَبُوا فَأَنتُمُ الطُّلَقَاءُ‘‘۔
جاؤتم سب آزاد ہو‘‘۔(۱۰)

فیصلے میں غیر جانبدار رہے

یہ رحمت ہی تھی کہ آپ ﷺ فیصلہ کرتے وقت ہمیشہ عدل کرتے تھے۔ مدینہ منورہ میں یہودی اور منافق کا آپس میں جھگڑا ہوگیا، یہ زمین کی حد بندی کے متعلق ایک مسئلہ تھا۔ دونوں اپنا مقدمہ رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گئے، ایک طرف کلمہ گو تھا جبکہ دوسری طرف یہودی تھا۔ کلمہ گو دراصل ایک منافق تھا اور نبی کریم ﷺ کے پاس اِس ارادے سے گیا تھا کہ آپ ﷺ بہرحال اس معاملے میں ایک مسلمان کا لحاظ کریں گے، یعنی آپ ﷺ اپنی جماعت کے آدمی کا خیال کریں گے۔ لیکن اگر رسول اللہ ﷺ جانبداری کی بنیاد پر ہی فیصلے کرتے تو پھر دنیا میں انصاف کا فیصلہ اور کون کرتا۔ حضور ﷺ نے ایسے ہی ایک دوسرے موقع پر فرمایا تھا: مَنْ یَعدِلُ إِذَا لَمْ أَعدِل (۱۱) کہ اگر میں انصاف نہیں کروں گا تو اور کون انصاف کرے گا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے انصاف کے مطابق یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ حضور ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ انسان فیصلہ کرتے وقت عدل کرے خواہ معاملہ اس کا ذاتی ہو یا کسی دوسرے کا ہو۔

اصولِ جنگ وضع کیے

جنگ وقتال میں ہر فریق اپنے حریف کو پسپاں کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کے لیے وہ ہر حد سے گزرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ انسانی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے، جب دو فریقوں کے درمیان لڑائی ہوئی تو ہر ایک نے دوسرے کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کی خاطر ہر حربہ اور ہر چال استعمال کی۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں جنگ وجدال کے بھی اصول بتائے، اور ان کی پاسداری کی سخت تاکید کی۔ آپ ﷺ نے بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور راہبوں اور جو جنگ سے الگ رہیں ان پر دست درازی سے منع کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ’’وُجِدَتِ امرَأَةٌ مَقتُولَةً فِی بَعضِ مَغَازِی رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ، فَنَهَى رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ عَن قَتلِ النِّسَاءِ وَالصِّبيَان‘‘ ’’ایک غزوہ میں ایک عورت قتل کی ہوئی پائی گئی، تو رسول اللہ ﷺ نے عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا‘‘۔(۱۲)

الغرض کہ آپ ﷺ نے کبھی کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا۔ ظلم سہے، طعنے سنے اور لہولہان ہوئے، لیکن کبھی کسی سے انتقام تو دور بددعا تک نہیں کی۔ یہ آپ ﷺ کے بلند کردار ہی کی دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دشمن اور آپ ﷺ کے سخت ترین مخالف بھی آپ ﷺ کے حسنِ اخلاق کی گواہی دیتے تھے۔ تاریخ اب ایسے کردار کا اپنے صفحات میں رہتی دنیا تک اضافہ نہ کرسکے گی۔

حوالہ جات:

۱۔ سورہ الانبیاء: ۱۰۷

۲۔ شعب الایمان، باب فضل شرف اصلہ وطہارۃ مولدہ صلی اللہ علیہ وسلم ج ۲، ص ۵۲۹

۳۔ سورہ الکھف: ٦

۴۔ صحیح بخاری، باب اذا قال احدکم امین والملائکۃ فی السماء، حدیث رقم: ۳۲۳۱

۵۔ صحیح مسلم، باب النھی عن لعن الدواب وغیرھا، حدیث رقم: ۲۵۹۹

٦۔ صحیح بخاری، باب حدیث الغار، حدیث رقم: ۳۴۷۷

۷۔ رحمۃ النبیؐ بالکفار، مصنف ا۔ د۔ خلیل ابراھیم ملا خاطر العزامی، ص ۵۲، مطبوعہ دار القبلۃ الثقافۃ الاسلامیۃ۔ ۲۰۰۷ء

۸۔ سیرۃ النبی، علامہ شبلی، جلد اول، ص ۲۸۰۔۲۸۱، مطبوعہ ادارہ اسلامیات لاہور ۲۰۰۲ء

۹۔ اللامع الصبیح الجامع الصحیح، مؤلف شمس الدین البرماوی، ج ۱۱، ص ۱۹۳

۱۰۔ سیرۃ النبی، علامہ شبلی جلد اول، ص ۳۱٦، مطبوعہ، ادارہ اسلامیات لاہور ۲۰۰۲ء

۱۱۔ صحیح بخاری، باب ما جاء فی الرجل ویلک، حدیث رقم: ٦۱٦۳

۱۲۔ صحیح بخاری، باب قتل النساء فی الحرب، حدیث رقم: ۳۰۱۵

دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک

عبدالرب کریمی فلاحی،

شعبہ دعوت، مرکز جماعت اسلامی ہند

حضرت محمد ﷺ نے نبوت سے پہلے چالیس سال مکہ والوں کے درمیان گزارے تھے۔ آپ بچپن ہی سے نیک فطرت اور صالح طبیعت کے مالک تھے۔ اپنی نوجوانی کو لہو ولعب کے بجائے سماج میں اچھائیوں کو فروغ دینا، کم زوروں اور مظلوموں کی حمایت کرنا ہی آپ کا مشن تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی وحی کے نزول کے بعد جب غارِ حرا سے خوف زدہ ہو کر گھر پہنچتے ہیں تو ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کو تسلی دیتے ہوئے فرماتی ہیں کہ اللہ آپ کو ضائع نہیں کرے گا۔ کیونکہ آپ بیواؤں اور یتیموں کی خبر گیری کرتے ہیں۔ مہمان نواز ہیں، مصیبت زدہ لوگوں سے ہمدردی رکھتے ہیں۔

مکہ اس وقت نہ صرف بت پرستی کا مرکز تھا بلکہ وہاں ہر طرح کی برائیاں اپنے عروج پر تھیں۔ معمولی معمولی باتوں پر سالوں لڑائیاں ہوتی تھیں اور ان جنگوں پر لوگ فخر بھی کرتے تھے۔ طاقت ور کمزوروں پر ظلم وزیادتی کرتے تھے۔ مسافر سرِ راہ لوٹ لیے جاتے، بدامنی اور شورش اپنے عروج پر تھی۔ ایک بڑی جنگ (جنگ فجار) کے بعد چند باشعور لوگوں نے ایک معاہدہ کیا کہ ہم میں سے ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا، مسافر کی خبر گیری کرے گا اور مکہ میں امن وشانتی کا ماحول پیدا کرے گا۔ تاریخ میں اس معاہدے کو حلف الفضول کا نام دیا گیا۔ حضرت محمد ﷺ اس معاہدے اور اس کے نفاذ میں پیش پیش تھے۔ مورخین لکھتے ہیں کہ اس معاہدے کے بعد مکہ میں امن کا ماحول پیدا ہوا۔ تجارتی قافلے بے خوف آنے جانے لگے۔ آپس میں کوئی جنگ نہیں ہوئی۔

مکہ میں خانہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیم اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہما السلام نے پانچ ہزار سال قبل کی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تجدید بھی ہوتی رہی۔ (۶۰۵ء) چھ سو پانچ عیسوی میں جب حضرت محمد ۳۵ سال کے تھے، زبردست سیلاب کی وجہ سے خانہ کعبہ کی دیواریں پھٹ گئی تھیں۔ حجر اسود جس دیوار میں نصب تھا اس میں بھی دراڑیں آ گئی تھیں۔ تمام قبائل کے سرداروں نے مل کر

دیواروں کی تعمیر کی لیکن جب حجر اسود کو دیوار پر نصب کرنے کا وقت آیا تو یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ اس خدمت کو کون انجام دے گا۔ ہر قبیلے کے سردار کی خواہش تھی کہ یہ مبارک کام اس کے ہاتھوں انجام پائے۔اختلافات اتنے بڑھے کہ آپس میں خوں ریزی کی نوبت آ گئی۔معاملہ کو رفع دفع کرنے کے لیے ایک معمر سردار نے تجویز رکھی کہ کل صبح خانہ کعبہ کے حدود میں جو شخص سب سے پہلے داخل ہو اسے حکم (فیصل) بنالیا جائے۔تمام لوگوں نے اس رائے سے اتفاق کیا۔دوسرے دن صبح سب سے پہلے حدود حرم میں داخل ہونے والے محمدﷺ تھے۔ان پر نگاہ پڑتے ہی لوگ پکارا ٹھے، یہ صادق اور امین ہیں۔اس کام کے لیے مناسب ترین شخص ہیں۔ان کا جو فیصلہ ہوگا ہمیں منظور ہے۔صورت حال سے واقفیت کے بعد آپﷺ نے ایک چادر منگائی، اس پر حجر اسود کو رکھ کر فرمایا کہ تمام قبیلوں کے سردار چادر کے کناروں کو پکڑ کر اوپر اٹھائیں۔سب نے مل کر چادر اوپر اٹھائی، تو آپﷺ نے حجر اسود کو اس کی جگہ نصب کر دیا۔

اپنی حکمت اور دانائی سے آپﷺ نے مکہ والوں کا دل جیت کر خوں ریز تشدد سے بچالیا اور ایک ایسا حل پیش کیا جو سب کے لیے قابل قبول تھا۔اس طرح آپ کے حسن عمل سے ایک مشکل مرحلہ ٹل گیا ورنہ اس بات کا قوی امکان تھا کہ آپس میں خوں ریزی کی نوبت آ جاتی۔اسی طرح کے نیک کاموں کی وجہ سے اہل مکہ آپ کو نام سے نہیں بلکہ صادق (سچا) اور امین (امانت دار) کے لقب سے پکارتے تھے۔

دعوت کی ابتدا اور قریش کی مخالفت

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و کردار کا اس درجہ قائل ہونے کے باوجود جب آپﷺ نے کوہ صفا پر چڑھ کر پہلی عام دعوت دیتے ہوئے لوگوں کو مخاطب فرمایا: اے قریش کے لوگو! اگر میں کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک بڑی فوج تم پر حملہ کرنے آ رہی ہے تو کیا تم یقین کرو گے؟ سب نے یک زبان ہو کر کہا کیوں نہیں! اے محمد آپ تو صادق ہیں ہم نے آج تک آپ کو جھوٹ بولتے ہوئے نہیں سنا ہے۔آپﷺ نے فرمایا تم ایک اللہ پر ایمان لے آؤ، بت پرستی چھوڑ دو۔ ورنہ اللہ تم پر شدید عذاب نازل کرے گا، تو یہ سن کر لوگ واپس چلے گئے، کسی نے آپ کی دعوت قبول نہیں کی۔ یہاں تک کہ آپ کے چچا ابولہب نے کہا کہ تمہارا برا ہو، کیا تم نے ہمیں اسی لیے جمع کیا تھا۔

یہ تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی دعوت عام اور قریش کے لوگوں کا آپ کے ساتھ برتاؤ، جس کی سچائی اور امانت داری ضرب المثل تھی۔ جب اس نے ایک اللہ کی طرف بلایا تو لوگوں نے کیسے منہ پھیر لیا۔اسلام کی روشنی جیسے جیسے پھیل رہی تھی، اس سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ مکہ والے اپنے ہی

صادق اور امین کے مخالف ہور ہے تھے۔قریش کے بڑے بڑے سردار اور قریبی رشتہ دار (ابوجہل اور ابولہب) جان کے دشمن بن رہے تھے۔اذیت اور تعذیب کی کون سی شکل تھی جسے نہ اپنایا گیا ہو۔انسانیت اور قرابت کے سارے رشتے ختم ہو چکے تھے۔ایک دن حرم کے اندر عین حالت نماز میں ابوجہل کے کہنے پر ایک شخص اونٹ کی اوجھ (نجاست) لاکر آپؐ پر ڈال دیتا ہے۔ مکہ کی گلیوں اور راستوں میں کانٹے بچھائے جاتے ہیں۔جولوگ آپ کو صادق اور امین کہتے تھے اب وہی لوگ آپ کو مجنوں اور جادوگر کہہ رہے ہیں۔خود آپؐ کے قبیلے اور خاندان کے لوگ نیز چچا ابوجہل اور ابولہب دشمنی میں سب سے پیش پیش تھے۔

دشمنوں کے لیے دعائیں

ایسے مشکل حالات میں ایک صحابی حضرت خباب بن ارتؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرتے ہیں کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔آپؐ ان مشرکین کے حق میں بددعا کیوں نہیں کرتے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا۔میں دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں ایسے بے شمار واقعات ملتے ہیں،جن میں دشمنوں کی ایذارسانیوں کے جواب میں آپ نے ہمیشہ ان کے حق میں دعا ہی فرمائی۔سیرت النبی کے مؤلف علامہ شبلی نعمانی تحریر فرماتے ہیں:

''دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں کہ نامانوس اور اجنبی صدائیں بہ رغبت سن لی گئی ہوں۔ حضرت نوحؑ کو سینکڑوں برس تک قوم کی نفرت اور دہشت کا سامنا رہا۔یونان دنیا کی شائستگی کا معلم اول ہے تاہم اس کے حکمت کدہ میں سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا۔حضرت عیسیٰؑ کو دار ورسن کا منظر پیش آیا۔اس بنا پر عرب اور قریش نے جو کچھ کیا وہ سلسلہ واقعات کی غیر معمولی کڑی نہ تھی۔لیکن غور طلب یہ ہے کہ اس کے مقابلے میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کیا؟

سقراط زہر کا پیالا پی کر فنا ہو گیا۔حضرت نوحؑ نے مخالفت سے تنگ آ کر ایک قیامت خیز طوفان کی استدعا کی اور دنیا کا ایک بڑا حصہ برباد ہو گیا۔حضرت عیسیٰؑ تیس چالیس شخصوں کی مختصر جماعت پیدا کر کے بہ روایت نصاریٰ سولی پر چڑھ گئے۔لیکن سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض ان سب سے بالا تھا۔خباب بن ارتؓ نے جب قریش کی ایذارسانیوں سے تنگ آ کر،آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ ان کے حق میں بددعا کیوں نہیں فرماتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ سرخ ہو گیا اور فرمایا کہ تم سے پہلے وہ لوگ گزر چکے ہیں جن کے سر پر آرے چلائے جاتے اور چیر ڈالے جاتے تاہم وہ اپنے فرض سے باز نہ آتے۔خدا اس کام کو پورا کرے گا''(سیرت النبی،جلد اول ص:۱۶۲)

هجرت حبشہ اور دشمنوں کی سازش

ظلم وستم کا سلسلہ دراز ہونے لگا تو کچھ صحابہ اور صحابیات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے حبشہ کی طرف ہجرت کر لی۔ وہاں کا عیسائی بادشاہ (نجاشی) عادل اور منصف تھا، لیکن ظالموں نے وہاں بھی سکون سے نہیں رہنے دیا۔ قریش نے قیمتی تحائف دے کر ایک وفد نجاشی کے پاس بھیجا۔ انھوں نے مہاجر صحابہ کے بارے میں بادشاہ سے درخواست کی کہ یہ ہمارے ملک مکہ کے باغی ہیں انھیں ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ بادشاہ نے معاملہ کی تحقیق کرنے کے بعد پناہ گزینوں کو واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ اس طرح وہاں انھیں ذلت اور ناکامی ہی ہاتھ لگی۔

شعب ابی طالب (سماجی بائیکاٹ)

ایک اللہ کی طرف لوگوں کو بلانے کے جرم میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب رسول اللہ ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو ہر طرح ستانے کے بعد ایک گھاٹی (شعب ابی طالب) میں محصور کر کے سماجی بائیکاٹ کر دیا جاتا ہے کہ ان سے کسی طرح کا سماجی ومعاشرتی تعلق نہ رکھا جائے، ان کے ساتھ خرید و فروخت نہ کی جائے، یہاں تک کہ کھانے پینے کی چیزیں بھی ان کے پاس نہ پہنچیں۔ بائیکاٹ کا یہ عرصہ تین سالوں پر محیط تھا۔ علامہ شبلیؒ نعمانی تحریر فرماتے ہیں:

''جب بچے بھوک سے روتے تھے تو باہر آواز آتی تھی۔ قریش سن کر خوش ہوتے تھے۔ لیکن بعض رحم دلوں کو ترس بھی آتا تھا۔ ایک دن حکیم بن حزام نے جو حضرت خدیجہؓ کا بھتیجا تھا، تھوڑے سے گیہوں اپنے غلام کے ہاتھ حضرت خدیجہؓ کے پاس بھیجے۔ راہ میں ابوجہل نے دیکھ لیا اور چھین لینا چاہا۔ اتفاق سے ابوالبختری کہیں سے آ گیا وہ اگرچہ کافر تھا، لیکن اس کو رحم آ گیا اور کہا کہ ایک شخص اپنی پھوپھی کو کچھ کھانے کے لیے بھیجتا ہے تو تو کیوں روکتا ہے۔'' (سیرت النبی، جلد اول، ص: ۱۵۶)

رواداری کا اعلیٰ نمونہ

شعب ابی طالب کی محصوری کے بعد مکہ میں سخت قحط پڑتا ہے۔ لوگ بھوک اور پیاس سے تڑپ اٹھتے ہیں۔ اس وقت مکہ کے سردار اور اسلام کے شدید دشمن ابوسفیان نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مکہ والے بھوک اور پیاس سے ہلاک ہو رہے ہیں۔ آپ اللہ سے دعا کریں کہ یہ قحط ختم ہو جائے۔ آپ ﷺ نے بارش کے لیے دعا فرمائی۔ آپ کی دعا سے اللہ نے قحط کو ختم کر دیا۔ حالانکہ یہ ایسا موقع تھا کہ آپ ﷺ ابوسفیان سے مکہ میں مسلمانوں پر ہو رہے مظالم کے سلسلے

میں کچھ کہتے، لیکن آپ ﷺ نے اس وقت بھی کسی طرح کی سودے بازی نہیں کی بلکہ بلند اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے مکہ میں خوشحالی اور بارش کی دعا فرمائی۔

ہجرت مدینہ کے پانچویں سال کا واقعہ ہے کہ قبیلہ بنوحنیفہ کے سردار ثمامہ بن اثالہ نے قبول اسلام کے بعد احتجاج میں مسلمانوں پر قریش کے ظلم وستم کے خلاف اہل مکہ کا اناج جو یمامہ سے آتا تھا بند کر دیا۔ غلہ کی آمد رک جانے سے مکہ میں فاقہ کی نوبت آ گئی۔ مجبور ہو کر قریش کے سرداروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گزارش کہ آپ مکہ آنے والے غلہ کو جاری کرا دیں۔ آپ ﷺ کے کہنے سے ثمامہ بن اثالہ نے غلہ بدستور جانے دیا۔ جبکہ یہ وہ دور تھا کہ مکہ کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شدید مخالف تھے اور جو مسلمان کسی وجہ سے مدینہ ہجرت نہیں کر سکے تھے انھیں مشق ستم بنایا جا رہا تھا۔

قریش کی بدسلوکیاں

قبیلہ بنو ہاشم کے سردار آپ ﷺ کے چچا ابوطالب تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ابولہب قبیلہ کا سردار بنا۔ اس نے سردار کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تحفظ دینے کا وعدہ کیا، لیکن بہت جلد اس سے پھر گیا اور مخالفت میں پیش پیش رہا۔ اس دور میں جتنی اذیت اور تکلیف آپ ﷺ کو دی گئی اس سے پہلے کبھی نہیں دی گئی تھی۔ ان ہی دنوں کا ایک مشہور واقعہ ہے۔ آپ ﷺ اپنے گھر کے صحن میں نماز پڑھ رہے تھے۔ ایک شخص بھیڑ کی بچہ دانی جو گندگی اور خون سے بھری تھی آپ کے اوپر پھینک دیتا ہے۔ آپ ﷺ نے اسے صاف کیا۔ گھر سے باہر نکل کر لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ اے مناف کے بیٹو! تمہاری طرف سے یہ کیسا تحفظ ہے جو مجھے مل رہا ہے۔ اسی طرح ایک بار جب آپ حرم سے باہر نکلے تو ایک شخص نے مٹی اٹھائی اور آپ کے چہرے اور سر پر پھینک دی۔ مکہ والے اسلام دشمنی میں بے لگام ہو چکے تھے۔ انھیں کسی کا پاس ولحاظ نہیں تھا۔

طائف میں لہولہان

ایسے سخت حالات میں آپ ﷺ اہل مکہ سے مایوس اور بددل ہو کر حضرت زید بن حارثہؓ کے ساتھ طائف کا رخ کرتے ہیں اور وہاں قبیلہ ثقیف کے سرداروں (عبد یالیل، مسعود اور حبیب) کو اسلام کی دعوت پیش کرتے ہیں، جسے سن کر وہ یکسر مسترد کر دیتے ہیں اور مذاق اڑاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ طائف کے اوباش اور آوارہ لڑکوں کو آپ ﷺ کے پیچھے لگا دیتے ہیں۔ پورا طائف آپ کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ پتھروں سے مار مار کر آپ ﷺ کو لہولہان کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ آپ کی جوتیاں خون سے

بھر جاتی ہیں۔اسی بے بسی کے عالم میں آپ ﷺ شہر سے نکل کر ایک باغ میں داخل ہوتے ہیں، زخموں کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ہوش آنے کے بعد بارگاہ ایزدی میں دعا فرماتے ہیں:

''بارالٰہا میں تیرے حضور اپنی بے بسی اور بے چارگی اور لوگوں کی نگاہ میں اپنی بے قدری کا شکوہ کرتا ہوں۔تو سارے کمزوروں کا رب ہے۔تو میرا بھی رب ہے۔تو نے مجھے کس کے حوالے کر دیا ہے۔کیا کسی بے گانے کے جو مجھ سے درشتی کے ساتھ پیش آئے، یا کسی دشمن کے حوالے جس کو تو نے میرے اوپر قابو پانے کا یارا دے دیا ہے۔اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو مجھے کسی مصیبت کی پروا نہیں۔اگر تیری طرف سے مجھے عافیت مل جائے تو میرے لیے زیادہ کشادگی ہے۔مجھے اس سے بچا لے کہ تیرا غضب مجھ پر نازل ہو۔یا تیری ناراضگی میرے حصے میں آئے۔میں تیری مرضی پر راضی ہوں۔یہاں تک کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے۔کوئی قوت اور طاقت تیرے بغیر نہیں ہے۔'' (رحمۃ للعالمین)

طائف میں رسول اللہ کے ساتھ جو نازیبا سلوک ہوا، اسے دیکھ کر آسمان اور زمین بھی لرز جاتے ہیں، حضرت جبرئیلؑ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتے ہیں کہ میرے ساتھ پہاڑوں کا فرشتہ موجود ہے، آپ ﷺ اشارہ کر دیں تو طائف کو دونوں پہاڑوں کے درمیان پیس دیا جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں! یہ ناسمجھ ہیں۔انھیں چھوڑ دو۔یہ نہیں ایمان لاتے ہیں تو ان کے بعد آنے والی ان کی نسلیں ضرور ایمان لائیں گی۔

ہجرت مدینہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جب مشرکین مکہ کی اذیتوں اور مخالفت کا سلسلہ حد سے تجاوز کرنے لگا تو اللہ کے حکم سے آپ ﷺ اپنے رفیق حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ مدینہ ہجرت کر جاتے ہیں۔صحابہ کی ایک بڑی تعداد پہلے ہی ہجرت کر کے مدینہ پہنچ چکی تھی۔مکہ والوں کی نگاہوں میں آپ ﷺ صادق اور امین تھے۔شدید دشمنی کے باوجود آپ ﷺ کی دیانت پر لوگوں کو اس قدر اعتماد تھا کہ اپنی قیمتی امانتیں آپ ﷺ ہی کے پاس رکھتے تھے۔اس موقع پر بھی آپ ﷺ کے پاس لوگوں کی امانتیں محفوظ تھیں۔ہجرت سے ایک دن پہلے وہ امانتیں حضرت علیؓ کو بلا کر ان کے حوالے کرتے ہوئے تاکید فرمائی کہ میرے جانے کے بعد سب کی امانتیں بہ حفاظت ان تک پہنچا دینا۔

مدینہ ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کو امید تھی کہ اب کسی حد تک سکون میسر آئے گا۔آزمائشوں اور اذیتوں کا طویل دور ختم ہوگا۔لیکن ایسا نہیں ہوا۔ہجرت کے کچھ دنوں بعد

ہی، قریش نے مدینہ کے ہونے والے سردار عبداللہ بن ابی کو پیغام بھیجا کہ تم نے مکہ سے گئے ہوئے لوگوں کو اپنے یہاں پناہ دی ہے۔ تم ان سے لڑو یا انھیں مدینہ سے باہر کردو۔ ورنہ ہم مدینہ پر حملہ کر کے تمہارے نوجوانوں کو قتل کردیں گے اور تمہاری عورتوں کو لونڈی بنالیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی خبر ملی تو آپ عبداللہ بن ابی کے پاس تشریف لے گئے اور اسے سمجھایا کہ کیا تم قریش کو خوش کرنے کے لیے اپنے لوگوں (انصار) سے جنگ کروگے۔ اس وقت تک انصار کا ایک بڑا حصہ مشرف بہ اسلام ہو چکا تھا۔ جب قریش کے دھمکی آمیز خط نے عبداللہ بن ابی پر کام نہیں کیا تو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کی تیاری شروع کردی۔ قریش کے ایک سردار کرز بن جابر الفہری نے اچانک حملہ کر کے مدینہ کے قریب کچھ جانوروں کو نقصان پہنچایا، کھجور کے درختوں کو کاٹ دیا اور ایک صحابی کو شہید کر کے فرار ہوگیا۔ مسلمانوں نے اس کا تعاقب کیا لیکن وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس واقعہ کے بعد رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ راتوں کو جاگ کر مدینہ کی حفاظت فرماتے رہے۔

جنگ بدر

جنگی تیاریوں کے ساتھ قریش مکہ سے نکل کر مدینہ سے اسی (۸۰) میل کی دوری پر مقام بدر پہنچے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے جاں نثار صحابہؓ کے ساتھ بدر پہنچ چکے تھے۔ یہیں پر حق و باطل کی پہلی جنگ (بدر) ہوئی۔ تین سو تیرہ (۳۱۳) بے سروسامان اور نہتے مسلمانوں کے سامنے ہر طرح کے سازوسامان اور ہتھیاروں سے مسلح ایک ہزار (۱۰۰۰) قریش تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جنگ کے لیے قطعی تیار نہیں تھے۔ یہ اور اس کے بعد جتنی بھی جنگیں ہوئیں، خالص مدافعانہ تھیں یا ان طاقتوں کے خلاف تھیں جو اسلام اور مسلمانوں کو اس روئے زمین سے نیست و نابود کردینا چاہتے تھے۔ اسی سال اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

وَقَاتِلُوا فِی سَبِیلِ اللّٰہِ الَّذِینَ یُقَاتِلُونَکُمْ (بقرۃ:۱۹۰)

''اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔''

حق و باطل کا معرکہ بظاہر بہت سخت تھا، علامہ شبلی نعمانی تحریر فرماتے ہیں:

''یہ عجیب منظر تھا، اتنی بڑی دنیا میں توحید کی قسمت صرف چند جانوں پر منحصر تھی۔ صحیحین (بخاری و مسلم) میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سخت خضوع کی حالت طاری تھی۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر فرماتے تھے: خدایا تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے آج پورا کر۔ محویت اور بے خودی کے عالم میں چادر

کندھے سے گر پڑتی تھی اور آپ ﷺ کو خبر تک نہ ہوتی تھی۔ کبھی سجدہ میں گرتے تھے اور فرماتے تھے کہ خدایا اگر یہ چند نفوس آج مٹ گئے تو پھر قیامت تک تو نہ پوجا جائے گا۔'' (سیرت النبی، جلد اول:۱۹۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے الفاظ بتارہے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس جنگ کے لیے قطعی تیار نہیں تھے۔ اللہ کی تائید اور نصرت آپ ﷺ کے ساتھ رہی، حالات نے پلٹا کھایا اور لشکر اسلام کو فتح نصیب ہوئی۔

جنگی قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک

جنگ بدر میں قریش کے ستر (۷۰) بڑے سر برآوردہ لوگ میدان جنگ میں مارے گئے اور ستر (۷۰) ہی گرفتار ہوئے۔ جنگی قیدیوں کو مدینہ لاکر مسجد نبوی کے قریب رکھا گیا۔ بعد میں انتظامی سہولت کی خاطر دو دو چار چار قیدی صحابہ کے درمیان تقسیم کردیے گئے۔ ممتاز قیدیوں میں قبیلہ عامر کا سردار سہیل بھی تھا۔ یہ ام المومنین حضرت سودہؓ کا رشتہ دار تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے چچا عباس تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ابوالعاص (حضرت زینبؓ کے شوہر) اور چچیرے بھائی عقیل اور نوفل بھی تھے۔ آپ ﷺ نے تمام قیدیوں کے بارے میں عمومی حکم دیا کہ ان کے ساتھ اچھے سلوک کیے جائیں۔ جہاں تک ممکن ہو ان کے آرام کا خیال رکھا جائے۔ صحابہ کرامؓ نے جن کی مالی حالت اچھی نہیں تھی، ان کے ساتھ اچھے برتاؤ کا مظاہرہ کیا۔ خود نہیں کھاتے تھے، لیکن قیدیوں کو ضرور کھلاتے۔ ان قیدیوں میں حضرت مصعب بن عمیرؓ کے بڑے بھائی ابوعزیز بن عمیر کا کہنا ہے کہ صحابہ جب کھانا لاتے تو روٹی میرے سامنے رکھ دیتے اور خود چند کھجوریں کھا کر کام چلا لیتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان جنگی قیدیوں کے ساتھ جو فیاضانہ سلوک کیا وہ انسانی تاریخ میں ایک روشن مثال ہے۔ حالانکہ یہ قیدی اپنے جرم کے اعتبار سے اس کے مستحق تھے کہ ان کی گردنیں اڑادی جاتیں یا عرب کے دستور کے مطابق انھیں غلام بنالیا جاتا۔ اس وقت جنگی قیدیوں کے ساتھ اسی طرح کا سلوک کیا جاتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ معمولی تاوان لے کر انھیں چھوڑ دیا جائے۔ ان قیدیوں میں مشہور ادیب اور شاعر سہیل بن عمرو بھی تھا جو اپنی فصاحت اور قادرالکلامی میں مشہور تھا اور عوام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا۔

حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا کہ اس کے دو دانت توڑ دیے جائیں تاکہ یہ اچھی طرح تقریر نہ کرسکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے سے منع فرمایا۔ جیسا کہ اوپر آچکا ہے کہ ان قیدیوں میں رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ابوالعاص بھی تھے۔ آپ ﷺ کی بیٹی حضرت زینبؓ اس وقت مکہ میں تھیں ،انھوں نے شوہر کی رہائی کے لیے نقدی کے ساتھ ساتھ اپنے گلے کا قیمتی ہار بھیجا تھا۔ آپ ﷺ نے دیکھا تو آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ صحابہؓ سے فرمایا یہ ہار حضرت خدیجہؓ کی یادگار ہے، جسے انھوں نے بیٹی زینب کی شادی میں بطور تحفہ دیا تھا۔ تم مناسب سمجھو تو ایک بیٹی کو اس کی ماں کا یادگار تحفہ واپس کردو۔ صحابہؓ نے عقیدت واحترام کے ساتھ آپ ﷺ کی رائے کو تسلیم کرتے ہوئے کسی طرح کا تاوان لیے بغیر ابوالعاص کو رہا کر دیا۔ کچھ ایسے قیدی بھی تھے جو اپنی تنگ دستی اور غربت کی وجہ سے کچھ نہیں دے سکتے تھے۔ انھیں بھی رہا کر دیا گیا۔ البتہ تعلیم یافتہ قیدیوں کے بارے میں فیصلہ ہوا کہ وہ کچھ بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دیں تو رہا کر دیے جائیں گے۔

حسنِ سلوک کی ایک اور مثال

مدینہ میں عبداللہ بن ابی بظاہر مسلمان تھا مگر اندرونی طور پر وہ ان لوگوں سے ملا ہوا تھا، جو ہر آن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ اس کی ہر کوشش اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہوتی تھی۔ وہ اسلام کے استیصال کے لیے ہر سازش میں شریک رہا۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ اس کے ساتھ نرمی اور حسن سلوک کا نمونہ پیش کیا۔ یہاں تک کہ اس کی فتنہ انگیزیوں کی وجہ سے کئی بار ایسا ہوا کہ اسے قتل کرنے تک کی نوبت آئی۔ مگر آپ ﷺ نے اس کی ہر خطا کو نظر انداز فرمایا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو اس کے کفن کے لیے آپ ﷺ نے اپنا کرتا دیا اور اس کی نماز جنازہ بھی پڑھائی۔

صلح حدیبیہ فتح مبین

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ﷺ کے اصحابؓ کو مکہ سے ہجرت کیے ہوئے کئی سال گزر گئے تھے۔ نہایت مجبوری اور کسمپرسی کی حالت میں مکہ چھوڑا تھا۔ ہجرت کے وقت آپ ﷺ پیچھے مڑ مڑ کر خانہ کعبہ کو دیکھتے اور یہ کہتے ہوئے جا رہے تھے کہ مجھے دنیا میں تو سب سے زیادہ عزیز ہے۔ لیکن اس شہر کے لوگ نہیں رہنے دے رہے ہیں۔ ذی قعدہ ٦ ہجری میں رسول اللہ ﷺ صحابہ کرامؓ کے ساتھ عمرہ کی نیت سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ مکہ والوں کو کسی طرح کی غلط فہمی نہ ہو اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام باندھا اور اپنے ساتھ قربانی کے ستر اونٹ بھی لیے، صحابہ کو حکم دیا کہ کوئی شخص اپنے ساتھ ہتھیار نہ رکھے۔ صرف ایک تلوار ہو وہ بھی میان کے اندر، واضح رہے کہ تلوار عرب کلچر کا ایک حصہ تھا جو سفر میں ہر شخص کے لیے ضروری خیال کیا جاتا تھا۔

قریش کو مدینہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روانگی کی خبر ملی تو وہ شک میں پڑ گئے۔ حالانکہ یہ حرام مہینہ چل رہا تھا، جس میں کسی طرح کی جنگ نہیں ہوتی تھی۔ ابھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے کچھ فاصلے پر حدیبیہ نامی مقام کے پاس پہنچے ہی تھے کہ معلوم ہوا کہ قریش ایک فوج لے کر آپ کا راستہ روکنے کے لیے مکہ سے نکل چکے ہیں۔ آپ ﷺ نے انھیں پیغام بھیجا کہ ہم عمرہ کی نیت سے مکہ آ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارا کوئی مقصد نہیں ہے۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے قریش سے صلح کی پیش کش بھی کی۔ کئی جنگوں کے بعد جانی اور مالی لحاظ سے وہ کمزور بھی ہو چکے تھے۔ دونوں طرف سے صلح کی بات شروع کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی حضرت خراش بن امیہؓ کو سواری کے لیے اپنا اونٹ دے کر قریش کے پاس بھیجا، انھوں نے حضرت خراشؓ کے اونٹ کو ہلاک کر دیا اور انھیں بھی جان سے مارنے کا منصوبہ بنالیا۔ لیکن کسی طرح وہ اپنی جان بچا کر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ قریش نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آپ ﷺ کے کچھ ساتھیوں پر حملہ بھی کر دیا۔ حملہ اچانک اور شدید تھا۔ صحابہؓ نے اس کا دفاع کیا اور ان کے چھ لوگوں کو گرفتار کر کے آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ ایک خطرناک شرارت اور سازش تھی۔ لیکن آپ کا دامنِ عفو اس سے زیادہ وسیع تھا۔ نہ ان حملہ آوروں کے ہتھیار چھینے گئے نہ انھیں قتل کا حکم دیا گیا بلکہ سب کو چھوڑ دیا گیا۔ اسی موقع پر ایک صحابیؓ کو ایک تیر انداز نے تیر مار کر شہید کر دیا۔ اس وقت بھی بارہ لوگ گرفتار کیے گئے۔ آپ ﷺ نے ان کے ساتھ بھی حسنِ اخلاق کا ثبوت دیتے ہوئے سب کو آزاد کرنے کا حکم جاری کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کرنے کی بابت گفتگو کرنے کے لیے حضرت عثمانؓ کو قریش کے پاس بھیجا۔ انھوں نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ آپ بیت اللہ کا طواف (عمرہ) کر سکتے ہیں، لیکن آپ کے ساتھیوں کو اس شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ حضرت عثمانؓ نے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے بغیر عمرہ کرنے سے منع کر دیا۔ قریش کو اس بات کی امید نہیں تھی کہ حضرت عثمانؓ انھیں اس طرح جواب دیں گے۔ انھوں نے حضرت عثمانؓ کو قید کر لیا۔ ان کے واپس نہ پہنچنے سے یہ خبر پھیل گئی کہ وہ شہید کر دیے گئے۔ فطری طور پر اس خبر سے صحابہ کرامؓ کو بہت صدمہ ہوا۔ آپ ﷺ نے صحابہؓ کو جمع کیا اور ان سے حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے جاں نثاری کا عہد لیا، جسے تاریخ میں بیعت رضوان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ حضرت عثمان کی شہادت سے متعلق جب غلط فہمی دور ہو گئی تو قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سہیل بن عمرو کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ قریش کے نزدیک سہیل بڑا دانش مند، دور

اندیش اور صائب الرائے تھا۔ اس نے کہا کہ صلح صرف اس شرط پر ہوسکتی ہے کہ آپ اور آپ کے ساتھی اس سال عمرہ کیے بغیر مدینہ واپس چلے جائیں۔

سہیل بن عمرو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کافی دیر تک صلح کے نکات پر گفتگو ہوتی رہی۔ جن شرطوں پر اتفاق ہوا، اسے قلم بند کرنے کے لیے آپ نے حضرت علیؓ کو طلب کیا۔ حضرت علیؓ نے معاہدہ کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا، سہیل نے اعتراض کیا کہ میں نہیں جانتا رحمٰن کون ہے۔ اس کی جگہ باسمک اللّٰہم لکھا جائے۔ صحابہ کو اس پر تردد تھا، لیکن آپ نے اس کی بات کو منظور کرلیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے لکھوایا: یہ وہ معاہدہ ہے جسے محمد رسول اللہ اور سہیل بن عمرو کے درمیان تسلیم کیا گیا ہے۔ سہیل نے اس پر بھی احتجاج کیا کہ ہم اگر آپ کو اللہ کا رسول مانتے تو خانہ کعبہ کی زیارت سے کیوں روکتے اور ہمارا کوئی اختلاف بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے اپنے نام کے ساتھ والد کا نام لکھوائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر بھی راضی ہوگئے اور صرف محمد بن عبداللہ لکھوایا۔

معاہدہ کی شرائط اس طرح طے ہوئیں:

۱۔ فریقین اگلے دس سالوں تک جنگ نہیں کریں گے۔

۲۔ محمد اور ان کے اصحاب اس سال واپس چلے جائیں۔

۳۔ اگلے سال عمرہ کے لیے آئیں اور صرف تین دن مکہ میں قیام کریں۔

۴۔ اگلے سال عمرہ کے لیے آنے پر کسی طرح کا ہتھیار لے کر نہ آئیں صرف تلوار ساتھ میں ہو وہ بھی میان کے اندر۔

۵۔ مکہ سے کوئی مسلمان ہجرت کرکے مدینہ نہیں جائے گا۔ البتہ مدینہ سے کوئی مسلمان مکہ واپس آنا چاہے تو اس کی اجازت ہوگی۔

۶۔ عرب قبائل کو اختیار ہوگا کہ وہ جس فریق کے ساتھ چاہیں، معاہدے میں شریک ہوسکتے ہیں۔

صحابہ کرامؓ اس بات سے بہت اداس اور رنجیدہ تھے کہ وہ عمرہ کیے بغیر واپس چلے جائیں۔ معاہدہ کی تمام شرطیں بظاہر ان کے خلاف تھیں۔ ابھی معاہدہ کے نکات پر باتیں ہورہی تھیں، لکھی نہیں گئی تھیں کہ ایک صحابی ابوجندلؓ جو اتفاق سے قریش کے سفیر سہیل بن عمرو کے بیٹے تھے، جنھیں قبول اسلام کے بعد سخت اذیتیں دی گئی تھیں اور انھیں سہیل نے مکہ میں قید کررکھا تھا۔ کسی طرح بیڑیاں توڑ کر وہاں سے نکل کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ابوجندل کو اس قدر مارا گیا تھا کہ ان کے جسم پر زخموں

کے نشان نمایاں تھے۔ان کی یہ حالت دیکھ کر صحابہؓ بے چین ہو گئے۔ان کے بھائی حضرت عبداللہ انھیں خوش آمدید کہنے کے لیے آگے بڑھے لیکن سہیل بن عمرو نے ابوجندل کو اپنی طرف کھینچ لیا وہ انھیں واپس مکہ لے جانے پر مصر تھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجندل کی حالت دیکھ کر فرمایا: سہیل اپنے بیٹے کے حال پر رحم کرو، ابھی معاہدہ پر گفتگو ہو رہی ہے۔تحریر مکمل نہیں ہوئی ہے، نہ ہی فریقین کے دستخط ہوئے ہیں۔اس لیے انھیں مدینہ میں رہنے کا پورا حق ہے۔لیکن سہیل کسی طور پر تیار نہیں ہوا۔بلکہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر اس شرط کو ابھی تسلیم نہیں کیا گیا تو پورا معاہدہ کالعدم سمجھا جائے گا۔صحابہؓ یہ دردناک منظر دیکھ کر تڑپ اٹھے۔ان کی ایمانی غیرت جوش میں آ گئی۔حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہم دین کے معاملے میں ایسی رسوائی کیوں برداشت کریں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔اس کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتا۔حضرت عمرؓ کو رسول اللہ سے اپنی اس سخت کلامی پر زندگی بھر افسوس رہا۔تقریباً پندرہ سو صحابہؓ کی موجودگی میں ابوجندل بیڑیوں میں جکڑے ہوئے مکہ واپس کر دیے گئے۔رخصت ہوتے وقت آپ ﷺ نے فرمایا: ابوجندل صبر کرو، اللہ تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی مدد کرے گا اور مکہ سے نکلنے کی راہ نکالے گا۔قریش کے ساتھ معاہدہ کی شرط پر اتفاق ہو چکا ہے۔ہم بد عہدی نہیں کریں گے۔معاہدہ مکمل ہو جانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے احرام اتارا اپنے ساتھ لائے جانوروں کی قربانیاں پیش کیں اور مدینہ لوٹ گئے۔اس وقت حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ نے اس معاہدہ کو اپنے لیے شکست خیال کیا تھا، لیکن اللہ نے اسے بڑی کامیابی قرار دیا۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحاً مُّبِیْناً۔ (الفتح:۱) ''اے نبی ہم نے تمھیں کھلی فتح عطا کر دی''۔

صلح کی وجہ سے جنگ کے حالات ختم ہو گئے۔عمومی آمدورفت میں اضافہ ہوا۔آپس میں تجارتی و معاشی تعلقات وسیع ہوئے۔مسلمانوں کا اخلاق و کردار غیر مسلم قبائل کے سامنے آیا۔مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس دوران لوگوں کی ایک بڑی اور قابل ذکر تعداد اسلام میں داخل ہوئی۔حضرت عمرو بن عاص اور حضرت خالد بن ولید جیسے قدآور لوگ اسی زمانے میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔

معاہدہ کے تحت جو مسلمان ہجرت نہیں کر سکے تھے۔وہ اب مدینہ نہیں جا سکتے تھے۔قریش نے انھیں علی الاعلان اذیتیں دینا شروع کر دیا۔جب تکالیف ناقابل برداشت ہو گئیں تو چند نوجوان چھپ چھپا کر بھاگ نکلے اور مدینہ آ گئے۔قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک وفد بھیجا کہ معاہدہ کے مطابق انھیں واپس کیا جائے۔آپ ﷺ نے انھیں مکہ لوٹ جانے کی ہدایت کی اور فرمایا کہ

اللہ تم لوگوں کے لیے کوئی بہتر سبیل پیدا کرے گا۔ کچھ مدت کے بعد ایسے تمام ستم رسیدہ لوگوں نے مکہ سے نکل کر سمندر کے کنارے مقام عیص پر عارضی پناہ گاہ بنالی۔ آہستہ آہستہ ان مظلوموں کے پاس اتنی قوت جمع ہوگئی کہ شام (سیریا) کی طرف جانے والے تجارتی قافلوں کو روک لیتے تھے اور ان سے جو کچھ حاصل ہوتا اسی پر ان کا گزر بسر ہوتا۔ بالآخر تنگ آ کر قریش نے معاہدہ کی اس شرط کو ہی ختم کر دیا۔ اب مکہ کے مسلمان آزاد ہوگئے۔ چاہیں تو مکہ میں رہیں یا مدینہ چلے جائیں۔ لہٰذا ابوجندل اور ان کے رفقا مدینہ واپس آ گئے اور اس کی وجہ سے قریش کے تجارتی قافلوں کا راستہ بھی کھل گیا۔

قریش صلح حدیبیہ کی شرطیں ڈیڑھ سال بھی پوری نہ کر سکے۔ حالانکہ معاہدہ کی تمام شرطیں ان کی اپنی تھیں۔ معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ان کے حلیف قبیلہ بنوبکر نے قریش کی شہ پر مسلمانوں کے حلیف قبیلہ بنوخزاعہ پر رات کی تاریکی میں حملہ کر کے ان کے بہت سے لوگوں کو قتل کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس بدعہدی کی خبر ملی تو آپ کو سخت تکلیف پہنچی۔ اس خلاف ورزی پر آپ نے قریش کے پاس ایک قاصد بھیجا لیکن انھیں معاہدہ توڑنے پر کسی طرح کی ندامت نہیں تھی۔

فتح مکہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان ۸ھ میں دس ہزار کی فوج لے کر مکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ مکہ سے ایک منزل کے فاصلے پر مرالظہر ان میں آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ قیام کیا۔ جنگی حکمت عملی کے تحت آپ نے حکم دیا کہ لوگ دور دور پھیل جائیں اور کھانا بنانے کے لیے الگ الگ آگ جلائیں، تاکہ رات کی تاریکی میں دور سے دیکھنے والوں کو فوج کی تعداد زیادہ نظر آئے۔ قریش کو جب اس کی خبر ملی تو انھوں نے اپنے لوگوں کو تحقیق کے لیے بھیجا۔ ان میں ابوسفیان بھی تھے، جنھیں اسلامی فوج کی جاسوسی کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ ماضی میں مسلمانوں کے خلاف ان کی تمام سرگرمیاں لوگوں کی نگاہوں کے سامنے تھیں۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش میں بھی برابر کے شریک رہے تھے۔ ایک ایک عمل ان کے قتل کے لیے کافی تھا۔ اسی وجہ سے حضرت عمر فاروقؓ نے ابوسفیان کے قتل کا مشورہ دیا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ حد درجہ عفو اور رحم دلی کا مظاہرہ کیا اور بغیر کسی سزا کے انھیں آزاد کرتے ہوئے صرف اتنا فرمایا: ''افسوس ابوسفیان! ابھی وقت نہیں آیا، کہ تم اتنی بات سمجھ جاؤ کہ اللہ کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں؟''

رسول اللہ ﷺ کے حسن سلوک سے متأثر ہو کر ابوسفیان اسلام میں داخل ہوگئے۔

بغیر کسی مزاحمت، قتل اور خوں ریزی کے لشکرِ اسلام فاتحانہ انداز میں مکہ میں داخل ہوا۔ یہ وہی شہر ہے جہاں چند سالوں قبل رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا تھا۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے اسلامی لشکر کے سپاہیوں کو حکم دیا کہ کسی کے ساتھ زیادتی نہ کی جائے۔ اگر کوئی ہتھیار ڈال دے، اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے، ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے یا خانہ کعبہ میں داخل ہو جائے تو اس کو پناہ دی جائے اور اس کے ساتھ کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس دن مکہ اور قریش کے وہ اکابر تھے، جنھوں نے اسلام کو جڑ سے ختم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ آج وہ لوگ بھی سامنے تھے، جنہوں نے آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے تھے۔ آج وہی اکابر قریش آپ ﷺ کے سامنے ڈرے سہمے اپنے سروں کو جھکائے کھڑے تھے۔ نامعلوم اندیشے اور خطرات ان کے دلوں میں پیدا ہو رہے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے قریش کے لوگو! جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار اللہ نے ختم کر دیا ہے۔ تمام لوگ آدمؑ کی نسل سے ہیں اور آدمؑ مٹی سے بنے ہیں۔

اس وقت کی منظر کشی کرتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی تحریر فرماتے ہیں:

''آپ ﷺ نے ان کی طرف دیکھا تو جباران قریش سامنے تھے، ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کو مٹانے میں سب سے پیش رو تھے۔ وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں۔ وہ بھی تھے جن کے تیغ و سنانے پیکر قدسی کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں۔ وہ بھی تھے جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے۔ وہ بھی تھے جو وعظ کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایڑیوں کو لہولہان کر دیا کرتے تھے۔ وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خون نبوت کے سوا کسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی، وہ بھی تھے، جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آ آ کر ٹکراتا تھا اور وہ بھی تھے، جو مسلمانوں کو جلتی ریت پر لٹا کر ان کے سینوں پر آتشی مہریں لگایا کرتے تھے۔''

(سیرت النبی، جلد اول، ص: ۳۱۰)

عام معافی کا اعلان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اکابرین قریش کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ تمہیں معلوم ہے کہ آج تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ مکہ والے جنھوں نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے ساتھ ہر طرح کی زیادتی کی تھی، انھیں یہ فکر دامن گیر تھی کہ پتہ نہیں کیا ہونے والا ہے؟ لیکن وہ اس بات سے بھی اچھی طرح واقف تھے کہ آپ ﷺ بدلہ لینا مناسب نہیں سمجھیں گے۔ انھوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ جواب

دیا کہ آپ شریف بھائی ہیں اور ایک شریف بھائی کے بیٹے ہیں۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے وہی کہا، جو حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا اور یہی ایک نبی کے شایانِ شان تھا۔ لاتثریب علیکم الیوم۔اذھبو فانتم الطلقاء (آج تم پر کوئی گرفت نہیں ہے جاؤ تم سب آزاد ہو)۔ رسول اللہ کے اس اسوۂ حسنہ کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد تحریر فرماتے ہیں:

''مظلومی میں صبر، مقابلے میں عزم، معاملے میں راست بازی اور طاقت واختیار میں درگزر، تاریخ انسانیت کی وہ نوادر ہیں، جو کسی ایک زندگی کے اندر کبھی جمع نہیں ہوئے۔''

(حضرت محمد ﷺ ہجرت سے الرفیق الاعلیٰ تک، علی اصغر چودھری)

رسول اللہ ﷺ کا حسن سلوک اپنے دشمنوں کے ساتھ

ہجرت کے وقت مکہ والوں نے مسلمانوں کی جائیدادوں پر قبضہ کرلیا تھا۔ آج مسلمان اپنی جائیدادیں واپس لے سکتے تھے۔ اسی طرح اپنے اوپر کیے گئے ایک ایک ظلم کا بدلہ بھی لے سکتے تھے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو حکم دیا کہ وہ اپنی سابقہ جائیدادوں سے دست بردار ہو جائیں۔ یہ تھا اہل مکہ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا عفو ودرگزر اور حسن سلوک کا اعلیٰ نمونہ جس کی کوئی مثال چشم فلک نے نہیں دیکھی ہوگی اور نہ ہی دنیا اس کی کوئی نظیر پیش کرسکتی ہے۔ فتح مکہ کے بعد بڑی تعداد میں مرد وخواتین اسلام میں داخل ہو رہے تھے، ان میں وہ لوگ بھی تھے جو اپنی اسلام دشمنی میں پیش پیش تھے۔

اس موقع پر آپ ﷺ نے عثمان بن طلحہ کو بلا کر خانہ کعبہ کی چابی عطا کرتے ہوئے فرمایا۔ یہ قیامت تک تمہارے خاندان میں رہے گی۔ یہ وہی عثمان بن طلحہ ہیں، جنھوں نے ہجرت سے پہلے ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ کو خانہ کعبہ کے اندر نہ صرف یہ کہہ کر جانے سے روکا تھا بلکہ بہت برا بھلا بھی کہا تھا۔ اس وقت آپ نے حلم اور بردباری کا مظاہرہ کرتے ہوئے، صرف یہ فرمایا تھا:

''اے عثمان آج تم مجھے خانہ کعبہ کے اندر جانے سے روک رہے ہو۔ ایک دن آئے گا جب اس کی چابی میرے ہاتھ میں ہوگی۔ میں جسے چاہوں گا، دوں گا۔''

عثمان بن طلحہ آج دل ہی دل میں نادم اور شرمندہ تھے، آپ ﷺ کے اعلیٰ اخلاق اور حسن سلوک سے متأثر ہو کر مشرف بہ اسلام ہو جاتے ہیں۔

آپ ﷺ نے اسلام کے بدترین دشمن ابولہب کے دونوں بیٹوں عتبہ اور عتیبہ کو بھی معاف کر دیا، جنھوں نے آپ کی پیاری بیٹیوں حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ کو اپنے باپ کے دباؤ میں طلاق دے کر

آپ ﷺ کو سخت تکلیف پہنچائی تھی۔ فتح مکہ کے وقت خوف سے روپوش ہو گئے تھے۔ بعد میں دونوں بھائی مشرف بہ اسلام ہوئے۔

ہند ابوسفیان کی بیوی اور عتبہ کی بیٹی تھی، ابتداء سے ہی اسلام دشمنی میں پیش پیش تھی، غزوہ بدر میں قریش کی ناکامی اور ہزیمت کے بعد مسلمانوں سے انتقام لینے کے لیے رجزیہ اشعار پڑھ کر مکہ والوں کو اسلام کے خلاف آمادہ کرتی تھی۔ غزوہ احد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محترم چچا حضرت حمزہؓ کی شہادت کے بعد ان کا سینہ چاک کر کے کلیجہ چبانے کی ناکام کوشش کی تھی اور حضرت حمزہؓ اور دیگر شہدائے احد کے ناک اور کان کاٹ کر ان کا ہار بنا کر اس نے پہنا تھا۔ ہند کو اپنے گزشتہ کارناموں کی وجہ سے یقیناً شرمندگی اور ندامت تھی۔ اسے اس بات کا اندیشہ بھی تھا کہ کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اسلام دشمنی کی وجہ سے قتل نہ کرا دیں۔ چہرہ پر نقاب ڈال کر آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوئی تا کہ لوگ اسے پہچان نہ سکیں۔ قبول اسلام کے وقت بھی اس نے غیر مناسب باتیں کیں۔ لیکن آپ نے اس کی حرکتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے معاف کر دیا۔

جبیر بن مطعم کے غلام وحشی بن حرب نے جنگ احد میں آپ ﷺ کے جاں نثار چچا حضرت حمزہؓ کو شہید کیا تھا۔ فتح مکہ کے وقت اپنے گزشتہ کارناموں کی وجہ سے ڈر کر طائف بھاگ گیا تھا۔ مگر کچھ دنوں کے بعد جب طائف فتح ہوا تو آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے بھی معاف کر دیا۔ صرف اتنا فرمایا کہ تم میرے سامنے نہ آیا کرو۔ تمہیں دیکھ کر مجھے اپنے پیارے چچا یاد آ جاتے ہیں۔

عکرمہ بھی اسلام کے بدترین دشمن ابوجہل کے بیٹے تھے۔ فتح مکہ سے قبل اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آپ ﷺ کو سخت اذیت پہنچائی، جنگ بدر اور احد میں مسلمانوں کے خلاف نمایاں کارناموں کی وجہ سے قریش کے لیے بہت اہم ہو گئے تھے۔ مکہ فتح ہو جانے کے بعد انھوں نے حبش بھاگ جانے کا منصوبہ بنایا۔ ان کی بیوی ام حکیم بنت حارث مسلمان ہو چکی تھیں، عکرمہ کی تلاش میں تہامہ بندرگاہ تک گئیں، وہاں شوہر سے ملاقات ہوئی، انھیں تسلی دی اور بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں امان دے دی ہے۔ ام حکیم نے عکرمہ کو وہیں مسلمان کیا اور مدینہ کے لیے واپس چل پڑیں۔ ابھی یہ دونوں راستے ہی میں تھے کہ وحی کے ذریعہ آپ کو معلوم ہو گیا، آپ نے صحابہ کرامؓ کو ہدایت فرمائی کہ ابوجہل کا بیٹا عکرمہ مومن کی حیثیت سے آ رہا ہے، اس کے باپ کو برا بھلا نہ کہنا۔ مرنے والے کو لعنت

،ملامت نہیں کرنا چاہیے۔ام حکیم شوہر کو لے کر جب آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش ہوئے۔ فرمایا: اے ہجرت کرنے والے، تمہارا آنا مبارک ہو۔ آپ نے عکرمہ کو مخاطب کر کے فرمایا۔ آج تم مجھ سے جو بھی طلب کرو گے دوں گا۔ عکرمہ نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول، میرے لیے دعا کر دیں کہ میری ساری عداوت جو آپ سے تھی، اللہ اسے معاف کر دے۔

صفوان بن امیہ اسلام دشمنی میں بہت آگے تھے اور عمیر بن وہب کو گراں قدر انعام کا لالچ دے کر (نعوذ باللہ) رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ فتح مکہ کے وقت اپنی سابقہ حرکتوں پر نادم ہو کر ،جدہ چلے گئے تاکہ سمندر کے راستے کہیں دور نکل جائیں۔ان کا خیال تھا کہ وہ قتل کر دیے جائیں گے۔ اس وقت تک عمیر بن وہب مسلمان ہو چکے تھے انھوں نے رسول اللہ سے عرض کیا کہ صفوان بن امیہ اپنے قبیلہ کے سردار ہیں ، وہ خوف سے فرار ہو گئے ہیں، آپ انھیں معاف فرما دیں۔ آپ ﷺ نے صفوان کو امان دی، عمیر بن وہب کے کہنے پر بطور نشانی، اپنا مبارک عمامہ ان کو عطا کیا۔ جسے آپ نے فتح کے دن اپنے مبارک سر پر باندھ رکھا تھا۔ عمیر بن وہب کے اصرار اور تسلی دینے پر صفوان آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام کو سمجھنے کے لیے دو ماہ کی مہلت مانگی۔ آپ ﷺ نے از راہ کرم چار ماہ کی مہلت عنایت فرمائی۔ صفوان نے آپ ﷺ کے اخلاق سے متأثر ہو کر چند دنوں کے اندر ہی اپنی مرضی سے اسلام قبول کر لیا۔

عبداللہ بن سعید، حضرت عثمانؓ کے رضاعی (دودھ شریک) بھائی تھے اور قبول اسلام کے بعد مرتد ہو گئے تھے۔ جھوٹی اور بے بنیاد باتوں کے ذریعہ لوگوں کو اسلام سے دور کرتے تھے۔ فتح مکہ کے وقت انھوں نے حضرت عثمان کے پاس پناہ لی۔ انھیں ڈر تھا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد اس سے پھر جانا اور اسلام کے خلاف سازشیں کرنا بڑا جرم ہے، اس کی سزا قتل بھی ہو سکتی ہے۔ حضرت عثمان کی سفارش پر رسول اللہ ﷺ نے انھیں معاف کر دیا۔

ہبار بن اسود نے آپ ﷺ کی بیٹی حضرت زینبؓ کو مکہ سے ہجرت کرتے وقت، نیزہ مار کر اونٹ سے گرایا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کا حمل ساقط ہو گیا اور وہ سخت بیمار ہو گئی تھیں اور یہی بیماری ان کی موت کا سبب بنی تھی۔ فتح مکہ کے وقت خوف کی وجہ سے وہ کہیں روپوش ہو گیا تھا۔ چند دنوں کے بعد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی غلطیوں پر شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے معافی چاہی۔ آپ ﷺ نے اسے معاف کر دیا اور صحابہؓ سے کہا کہ کوئی اسے برا بھلا نہ کہے۔

مشہور ادیب اور شاعر کعب بن زہیر رسول اللہ ﷺ کے خلاف اپنے اشعار کے ذریعہ زہر افشانی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اپنے بھائی کے قبول اسلام پر اسے بھی لعن طعن کی۔ اس نے اپنی زندگی کا مقصد ہی اسلام دشمنی بنالیا تھا۔ اسلام کے خلاف اس کی سرگرمیوں کی وجہ سے فتح مکہ کے وقت رسول اللہ ﷺ نے اسے جان سے مارنے کا حکم دیا۔ لیکن وہ کہیں روپوش ہوگیا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد بھائی کے کہنے پر مدینہ پہنچ کر اس نے اسلام قبول کرلیا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اسے بھی معاف فرمادیا۔

قبیلہ بنوحنیفہ کا شمار ان قبائل میں تھا جو اسلام دشمنی میں پیش پیش تھا۔ ثمامہ بن اثال اس قبیلہ کے بااثر سرداروں میں سے تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سخت مخالف اور دشمن تھا۔ نجد کے ایک سفر سے واپسی پر صحابہ کرام اسے گرفتار کر کے مدینہ لائے اور مسجد نبوی کے ایک ستون سے باندھ دیا۔ آپ ﷺ کو خبر ملی تو وہاں پہنچے اور ثمامہ کا حال دریافت کیا۔ اس نے جواب دیا میں ٹھیک ہوں، اگر آپ مجھے قتل کیے جانے کا حکم دیتے ہیں تو یہ درست فیصلہ ہوگا۔ اگر میرے اوپر احسان کرتے ہیں تو ایک شکر گزار پر رحم فرمائیں گے۔ اگر میری رہائی کے بدلے میں مال درکار ہو تو بتائیں۔

دوسرے دن بھی آپ ﷺ نے ثمامہ سے یہی سوال کیا۔ اس نے کہا اگر آپ احسان کرتے تو ایک شکر گزار پر رحم فرمائیں گے۔ تیسرے دن بھی آپ نے سوال کیا۔ اس کا جواب اب بھی یہی تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے آزاد کرنے کا حکم دیا۔ ثمامہ نے رہائی ملنے کے بعد قریب ہی کھجور کے ایک باغ میں جا کر غسل کیا اور واپس آ کر مسجد نبوی میں مشرف بہ اسلام ہوا۔ ثمامہ نے قبول اسلام کے بعد کہا: اے اللہ کے رسول! اللہ کی قسم دنیا میں آپ سے زیادہ مجھے کسی سے نفرت نہ تھی۔ مگر اب آپ دنیا میں سب سے زیادہ محبوب بن گئے ہیں۔ اللہ کی قسم آپ کے شہر سے مجھے سخت نفرت تھی مگر آج میری نظر میں یہ شہر دنیا کے تمام مقامات سے اچھا ہوگیا ہے۔ اللہ کی قسم آپ کے دین (اسلام) سے مجھے حد درجہ عداوت و دشمنی تھی، لیکن آج آپ ہی کا دین مجھے محبوب تر ہوگیا ہے۔

سفر طائف رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کا مشکل ترین دن تھا۔ آپ بڑی امیدیں لے کر وہاں گئے تھے، لیکن طائف کے سرداروں اور عوام نے نہ صرف آپ ﷺ کی نبوت کی تکذیب کی، بلکہ پتھروں سے مار مار کر لہولہان کر دیا۔ فتح مکہ کے بعد یہی اہل طائف اور عبد یالیل (سردار) آپ کی خدمت (مدینہ) میں پہنچ کر داخل اسلام ہوئے اور آپ انھیں معاف فرمادیا۔ (رحمۃ للعالمین، جلد سوم، ص: ۳۰۳)

خیبر کی ایک یہودی خاتون زینب بنت حارث نے گوشت میں زہر ملا کر رسول اللہ ﷺ کو کھلایا اور بعد میں اس نے اپنا جرم قبول بھی کر لیا۔ اس کے باوجود آپ ﷺ نے اسے معاف فرما دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں ایسے بے شمار واقعات ملتے ہیں، آپ نے اپنے دشمنوں سے جس طرح حسن سلوک کیا وہ انسانی تاریخ کی بہت روشن اور تابناک مثال ہے۔ اپنے ساتھ برا کرنے والوں کو نہ صرف معاف کر دیا بلکہ ان کے ساتھ اخلاق کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔

یہود کے ساتھ حسنِ سلوک ۔ معاہدہ

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ پہنچ کر ہجرت کے پہلے سال ہی یہودیوں اور مسلمانوں کے تعلقات کو مستحکم کرنے اور امن وشانتی کے قیام کے لیے ان کے ساتھ ایک معاہدہ کیا۔ معاہدہ میں کل بارہ شرطیں تھیں۔ ان میں دو شرائط بہت واضح تھیں۔

۱۔ معاہدہ کرنے والی قوموں (یہود اور مسلمانوں) کے ساتھ کوئی بیرونی طاقت جنگ کرے گی تو فریقین ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

۲۔ دونوں فریق کے درمیان معاہدہ کی کسی شرط یا کسی نئی بات پر اختلاف ہو جائے، جس سے فتنہ و فساد کا اندیشہ ہو تو فیصلہ کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

رسول اللہ ﷺ کی دل آزاری

معاہدے کے باوجود یہود رسول اللہ ﷺ کو اذیتیں پہنچاتے رہے اور اسلام کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔ قرآن نے ان کے بارے میں واضح الفاظ میں کہا ہے:

لَتُبْلَوُنَّ فِیْ أَمْوَالِکُمْ وَأَنفُسِکُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ أُوتُواْ الْکِتَابَ مِن قَبْلِکُمْ وَمِنَ الَّذِیْنَ أَشْرَکُواْ أَذًی کَثِیْراً وَإِن تَصْبِرُواْ وَتَتَّقُواْ فَإِنَّ ذَلِکَ مِنْ عَزْمِ الأُمُورِ۔ (آل عمران:۱۸۶)

''مسلمانو، تمھیں مال اور جان دونوں کی آزمائشیں پیش آکر رہیں گی، اور تم اہل کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔ اگر ان سب حالات میں تم صبر اور تقویٰ کی روش پر قائم رہو تو یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کو اذیت پہنچانے کا کوئی موقع یہود اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ ان کے خواص کی اخلاقی صورت حال یہ تھی کہ جب آپ ﷺ سے ملتے تو السام علیکم کہتے۔ یعنی آپ کو موت آئے۔ جب یہ فقرہ حضرت عائشہؓ نے سنا تو غصہ میں فرمایا۔ تمھیں ہی موت آئے۔ آپؐ نے فرمایا:

عائشہ نرمی اور محبت سے کام لو۔ میں اس کے جواب میں علیک (تم پر بھی) کہہ دیتا ہوں بس یہ کافی ہے۔

یہود کی سازشیں

رسول اللہ ﷺ کے مدینہ تشریف لانے کے بعد انصار کے دو اہم قبائل اوس وخزرج کی باہم لڑائی جو سالوں سے جاری تھی ختم ہوگئی۔ یہود نے اپنی سازشوں سے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے دونوں قبائل کے درمیان نفرت وعداوت کو بڑھانے کے لیے پرانے زخموں کو کریدنے میں اہم رول ادا کیا۔ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اگر دونوں قبائل میں لڑائی دوبارہ شروع ہوجائے تو اسلام خود بہ خود خانہ جنگیوں کی نذر ہوجائے گا۔ انھوں نے اس جنگ کو ہوا دینے کے لیے جنگ بعاث کا تذکرہ شروع کردیا تاکہ دونوں کے پرانے زخم تازہ ہوجائیں۔ یہود کی کوششوں سے عداوت ودشمنی کی دبی ہوئی چنگاری شعلہ بن گئی اور قریب تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہوجائیں۔ جب اس کی خبر رسول اللہ ﷺ کو ہوئی تو آپ اوس وخزرج کے ذمہ داروں کے پاس گئے اور دونوں کو وعظ ونصیحت کرکے مشتعل ہونے سے بچایا۔ قرآن نے اس واقعہ کو اس انداز سے بیان کیا ہے۔

یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا إِن تُطِیعُوا فَرِیقاً مِّنَ الَّذِینَ أُوتُوا الْکِتَابَ یَرُدُّوکُم بَعْدَ إِیْمَانِکُمْ کَافِرِینَ۔ (آل عمران: ۱۰۰)

”اے ایمان لانے والو، اگر تم نے اہل کتاب میں سے ایک گروہ (یہود) کی بات مانی تو یہ تمھیں ایمان سے کفر کی طرف پھیر لے جائیں گے۔“

یہود کے ساتھ رواداری

رسول اللہ ﷺ کا رویہ یہود کے ساتھ حد درجہ نرمی اور حسن سلوک کا تھا۔ آپ بہت سارے مذہبی امور میں ان سے اتفاق رکھتے تھے۔ بخاری شریف میں ہے کہ جن امور کے بارے میں شریعت کا کوئی خاص حکم نہیں ہوتا رسول اللہ ﷺ وہاں اہل کتاب (یہود ونصاری) کی موافقت کرتے تھے۔

مدینہ میں یہود عاشورہ کے دن حضرت موسیٰ کو فرعون سے نجات ملنے کی خوشی میں روزہ رکھتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ وہ بھی عاشورہ کا روزہ رکھیں۔ ایک بار آپ ﷺ کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا، آپ اس کی تعظیم میں کھڑے ہوگئے۔ صحابہؓ نے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ یہ تو ایک یہودی کا جنازہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا وہ انسان نہیں ہے؟ کسی موقع پر ایک یہودی نے اپنے پیغمبر حضرت موسیٰ کی فضیلت اس طرح بیان کی کہ وہ (حضرت موسیٰ) حضرت محمد ﷺ

سے بھی افضل ہیں۔ اس بات پر ایک صحابی کو غصہ آ گیا اور انھوں نے اس یہودی کو ایک تھپڑ رسید کر دیا۔اس نے رسول اللہؐ سے شکایت کر دی۔ آپؐ نے صحابی سے فرمایا: مجھ کو دوسرے نبیوں پر ایسی فضیلت نہ دو، جس سے کسی نبی کی حیثیت کم ہو جائے۔ قیامت کے دن لوگ بے ہوش ہوں گے۔ سب سے پہلے مجھے ہوش آئے گا اس وقت میں دیکھوں گا کہ حضرت موسیٰؑ عرش کا پایہ تھامے کھڑے ہیں۔

یہود کی شرارتیں

یہود کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا معاملہ انتہائی نرمی اور محبت کا تھا۔لیکن ان تمام رواداریوں اور اخلاق حسنہ کا صلہ جو انھوں نے دیا وہ آگے کی سطور میں ملاحظہ فرمائیں۔

رسول اللہ ﷺ سے معاہدہ کرنے کے بعد بھی یہود اپنی اسلام دشمنی کو پس پردہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے اکابر قریش سے ساز باز رکھتے تھے۔ معاہدہ کے ایک سال کے بعد ہی ان کی شرارتیں کافی بڑھ گئیں۔ اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت سے انھیں اپنا سماجی اور مذہبی سامراج خطرے میں نظر آنے لگا۔ جنگ بدر میں مسلمانوں کی کامیابی نے انھیں مزید بے چین کر دیا تھا۔ معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انھوں نے مسلمانوں کے خلاف قریش کو ہر طرح کی مدد کرنے کا یقین دلایا۔ یہودی سردار کعب بن اشرف نے مکہ میں جا کر قریش کو جنگ بدر کا انتقام لینے کے لیے اکسایا۔

بنو قینقاع

مدینہ میں یہود کے تین بڑے قبائل، بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ آباد تھے۔ ان میں بنو قینقاع بہادر، جفاکش اور مال و ثروت میں سب سے آگے تھے۔ ان کے پاس جدید جنگی اسلحوں کا ذخیرہ بھی تھا۔ رسول اللہ ﷺ سے معاہدہ کی خلاف ورزی سب سے پہلے انھوں نے کی۔ اتفاق سے جنگ بدر کے بعد مدینہ میں ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا جس کی وجہ سے یہ آگ مزید بھڑک اٹھی۔ قبیلہ بنو قینقاع کے علاقے میں ایک انصاری خاتون کوئی سامان لینے گئی، وہاں ایک یہودی نے اس کی توہین کر دی۔ خاتون کی چیخ و پکار سن کر ایک انصاری مسلمان موقعہ واردات پر پہنچے اور طیش میں آ کر مجرم یہودی پر حملہ کر دیا جس کی وجہ سے اس کی موت ہو گئی۔ یہودیوں نے ردعمل میں اس مسلمان کو بھی قتل کر کے ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ مقتول انصار کے خاندان والے انتقام لینا چاہتے تھے۔ غلطی دونوں طرف سے ہوئی تھی۔ یہود اگر معاہدہ کے تحت رسول اللہ ﷺ کو حکم (فیصل) بنا لیتے تو معاملہ بہ آسانی حل ہو جاتا۔ لیکن انھوں نے ایسا نہ کر کے

ایک غلط راہ اختیار کی اور جنگ کی کیفیت پیدا کردی۔

ان حالات کی خبر جب رسول اللہ ﷺ کو ہوئی تو آپ ﷺ قبیلہ بنو قینقاع کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے فرمایا کہ معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو، اس کے غضب کو دعوت نہ دو۔ لیکن انھوں نے بڑے تکبر کے ساتھ کہا کہ اے محمد! آپ جنگ بدر کے نتیجہ سے خوش نہ ہوں۔ آپ کا معاملہ ان لوگوں سے تھا جو جنگی حکمت عملیوں سے ناواقف تھے۔ ہمارے ساتھ جنگ کا موقع آئے گا تو ہم اس کا جواب بہتر طور پر دیں گے۔ یہ کہہ کر بنو قینقاع نے علی الاعلان معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اعلان جنگ کر دیا۔ آپ ﷺ نے ان کی تنبیہ کرنے کے لیے ضروری اقدام کیا۔ شروع میں وہ قلعہ بند ہو گئے۔ پندرہ دنوں تک محاصرہ جاری رہا۔ آخر میں وہ اس بات پر راضی ہوئے کہ رسول اللہ ﷺ جو فیصلہ کر دیں وہ انھیں منظور ہوگا۔ ان کی عہد شکنی اور مسلسل سازشوں کی وجہ سے آپ ﷺ انھیں سخت سزا دینا چاہتے تھے، لیکن عبداللہ بن ابی کی سفارش اور اس کی منت وسماجت پر آپ ﷺ نے بطور سزا ان کو مدینہ سے جلاوطن کرنے کا فیصلہ کیا۔

بنو نضیر

یہود کا دوسرا قبیلہ بنو نضیر تھا۔ اس معاہدے میں وہ بھی برابر کے شریک تھے۔ جنگ بدر کے بعد رسول اللہ ﷺ کے خلاف ان کی سازشیں بھی تیز ہوگئیں۔ قریش نے انھیں ایک دھمکی آمیز خط بھیجا کہ تم صاحب حیثیت ہو، جائیدادوں اور قلعوں کے مالک ہو اس لیے محمد اور ان کے ساتھیوں سے جنگ کرو۔ ورنہ ہم تمہارے ساتھ برا سلوک کریں گے۔ بنو نضیر کے دلوں میں دھوکہ تو پہلے سے ہی تھا۔ قریش کے خط کے بعد عہد شکنی اور رسول اللہ ﷺ کو فریب دینے کا پختہ ارادہ کر لیا۔

ایک موقعہ پر آپ ﷺ چند صحابہ کرام کے ساتھ بنو نضیر کی آبادی میں تشریف لے گئے۔ ضیافت کے بہانے انھوں نے آپ ﷺ کو ایک اونچی دیوار کے سائے میں بیٹھا دیا۔ ان کا منصوبہ تھا کہ اوپر سے کوئی بھاری پتھر گرا دیں جس سے (نعوذ باللہ) آپ شہید ہو جائیں۔ یہودی سردار ایک ایک کر کے وہاں سے رخصت ہو گئے۔ صرف صحابہ کرام ﷺ اور آپ ﷺ وہاں تشریف فرما تھے۔ اللہ نے وحی کے ذریعہ آپ کو ان کی شرارتوں سے باخبر کر دیا۔ آپ ﷺ وہاں سے بڑی تیزی کے ساتھ نکلے اور بہ حفاظت مدینہ واپس آ گئے۔ جب بنو نضیر کو اس میں کامیابی نہیں ملی تو انھوں نے ایک نئی سازش شروع کر دی۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ اپنے تیس ساتھیوں کو لے کر آئیں اور ہمارے مذہبی علماء سے

اسلام کی حقانیت پر بات کریں۔ اگر وہ آپ کی باتوں سے مطمئن ہوں گے تو ہم لوگ ایمان لے آئیں گے۔ چونکہ ماضی میں بنونضیر نے رسول اللہ کے ساتھ بدعہدی کی تھی، اعتماد کو مجروح کیا تھا، اس لیے آپ نے انھیں پیغام دیا کہ تحریری معاہدہ کے بغیر ہم نہیں آسکتے ہیں۔ بنونضیر کسی طور بھی معاہدہ کے لیے تیار نہیں تھے۔ کچھ دن گزرنے کے بعد انھوں نے دوبارہ پیغام دیا کہ ہمارے تین علماء ہوں گے۔ آپ بھی اپنے ساتھ تین لوگوں کو لے کر آئیں۔ اس بار انھوں نے اطمینان دلایا کہ اگر وہ آپ کی نبوت کی تصدیق کرتے ہیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ ہوں گے۔ جب ان کا اصرار بہت بڑھا تو آپ ﷺ ان کے علماء سے تبادلہ خیال کے لیے تیار ہوگئے۔ یہاں بھی بنونضیر کے دلوں میں کھوٹ تھی، ان کی نیت تھی کہ جب رسول اللہؐ گفتگو کے لیے ان کی آبادی میں داخل ہوں گے تو پہلے سے گھات میں بیٹھے لوگ آپؐ کو قتل کردیں گے۔ اس سازش کی اطلاع بھی آپؐ کو مل چکی تھی، اس لیے آپ وہاں نہیں گئے۔ آپ نے ان کے خلاف بھی تادیبی کارروائی کا فیصلہ کیا۔ وہ بھی اپنے قلعوں میں بند ہوگئے۔ یہ محاصرہ دس بارہ دنوں تک جاری رہا اس کے بعد انھوں نے صلح کر کے مدینہ سے نکل جانے کی اجازت مانگی۔ آپؐ نے انھیں اس شرط پر اجازت دے دی کہ وہ ہتھیاروں اور اسلحوں کے علاوہ جو چاہیں لے جاسکتے ہیں۔ بنونضیر صاحب ثروت و دولت اور قلعوں کے مالک تھے۔ انھوں نے چھ سو اونٹوں پر اپنے مال و اسباب کو باندھا یہاں تک کہ گھروں کی کھڑکیاں دروازے بھی نکال لیے اور اپنے ہاتھوں سے گھروں کو مسمار کر کے خیبر کی طرف چلے گئے۔

بنوقریظہ

یہود کا تیسرا قبیلہ بنوقریظہ تھا۔ یہ مال و دولت اور سماجی حیثیت میں بنونضیر سے بہت کم تھے۔ لیکن انھوں نے بھی معاہدہ کی خلاف ورزی کی۔ جنگ بدر کے موقع پر انھوں نے اسلحوں اور ہتھیاروں سے مسلمانوں کے خلاف قریش کی مدد کی تھی۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے ان کے قصور کو نہ صرف نظر انداز کیا تھا بلکہ انھیں معاف بھی کردیا۔ بہت جلد انھیں اپنی غلطیوں کا احساس ہوا اور انھوں نے دوبارہ معاہدہ کی تجدید کرلی۔ لیکن جنگ احزاب میں انھوں نے مسلمانوں کی جان و مال کو خطرے میں ڈال کر باہر والوں کی مدد کر کے معاہدہ کو دوبارہ توڑا۔ مجبوراً ان کے خلاف بھی کارروائی کی گئی۔

حضرت علیؓ کی قیادت میں جب اسلامی فوج ان کے قلعوں کی طرف بڑھی تو ندامت اور شرمندگی کے بجائے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیں۔ یہ بھی اپنے قلعوں میں محصور ہوگئے۔ ۲۵؍دنوں کے محاصرے کے بعد ہتھیار ڈالتے ہوئے، انھوں نے قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن

معاذؓ کوحکم بنایا کہ وہ جو فیصلہ کریں گے انھیں منظور ہوگا۔ حضرت سعد اوران کا قبیلہ اوس بنوقریظہ کا حلیف تھا۔ حضرت سعد بن معاذؓ نے وہی فیصلہ کیا جو یہود اپنے دشمنوں سے کیا کرتے تھے۔ ان کی گزشتہ اسلام مخالف کارروائیوں کی بنیاد پر ان کے مردوں کوقتل کرنے کا حکم دیا۔ یہود اگر رسول اللہ کو اپنا حکم بناتے تو آپ وہی کرتے جو اس سے پہلے بنوقینقاع اور بنونضیر کے ساتھ کیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ مدینہ سے جلاوطنی کی سزا دیتے لیکن انھوں نے یہ سزا ازخود پسند کی۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے بنوقریظہ میں سے بھی ان کی درخواست پر سعد بن معاذ کے فیصلے سے کچھ لوگوں کو مستثنیٰ کردیا۔ مثلاً زہیر کے لیے مع اہل وعیال اور مال ودولت رہائی کا حکم دیا۔ اسی طرح رفاع بن شمویل کو بھی ان کی درخواست پر جاں بخشی فرمائی۔

یہاں بعض معترضین کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کے دو قبائل بنوقینقاع اور بنونضیر کے مقابلے میں بنوقریظہ کو سخت سزا دی۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ اگر بنوقریظہ رسول اللہ ﷺ کو حکم (ثالث) بناتے تو آپ ﷺ ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کرتے جو اس سے پیش تر قبائل کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن انھوں نے حضرت سعد بن معاذؓ کو حکم بنایا اور سعد بن معاذ نے ان کی مذہبی کتاب تورات کے مطابق ہی فیصلہ کیا۔ اس بابت علامہ شبلی نعمانی تحریر فرماتے ہیں:

۱۔ آں حضرت نے مدینہ آکر ان کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کیا۔ جس میں ان کے مذہب کی پوری آزادی دی گئی اور جان و مال کی حفاظت کا اقرار کیا گیا۔

۲۔ بنوقریظہ مرتبہ میں بنونضیر سے کم تھے۔ یعنی بنونضیر کا کوئی آدمی قریظہ کے کسی آدمی کو قتل کردیتا تھا تو اس کو صرف آدھا خون بہا دینا پڑتا تھا۔ بخلاف اس کے بنوقریظہ پورا خون بہا ادا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے بنوقریظہ پر یہ احسان کیا کہ ان کا درجہ بنونضیر کے برابر کردیا۔

۳۔ آنحضرت ﷺ نے بنونضیر کی جلاوطنی کے وقت بنوقریظہ سے دوبارہ تجدید معاہدہ کی۔

۴۔ باوجود ان باتوں کے عہد شکنی کی اور جنگ احزاب میں شریک ہوئے۔

۵۔ ازواج مطہرات قلعہ میں حفاظت کے لیے بھیج دی گئی تھیں، ان پر حملہ کرنا چاہا۔

۶۔ حی بن اخطب جو بغاوت کے جرم میں جلاوطن کردیا گیا تھا۔ جس نے تمام عرب کو برانگیختہ کرکے جنگ احزاب قائم کردی تھی۔ اس کو اپنے ساتھ لائے جو آتش جنگ کے اشتعال کا دیباچہ تھا۔ ان حالات میں بنوقریظہ کے ساتھ کیا سلوک کیا جاسکتا تھا۔ (سیرت النبی، جلد اول ص: ۴۶۲)

رسول اللہ ﷺ کی سماجی زندگی

ضمیر اللہ ضمیر اعظمی فلاحی، مرکز جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی

موبائل نمبر:9810915189

قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ۔ (آل عمران:۳۱)

''اے نبیؐ، لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا، وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔''

دنیا میں ایک انسان کا تعلق دوسرے انسانوں سے ہوتا ہے۔ وہ تنہا زندگی نہیں گزار سکتا، بلکہ اپنی بنی نوع کے ساتھ مل جل کر رہنا اس کی فطرت ہے۔ مرد اور عورت کے نکاح میں یکجا ہونے سے خاندان بنتا ہے اور خاندان کے مجموعے کو سماج کہتے ہیں۔

اسی باہمی تعلق کی وجہ سے انسان پر کچھ حقوق وفرائض عائد ہوتے ہیں۔ ان حقوق وفرائض کو اچھے ڈھنگ سے نبھانے کو اخلاق کہتے ہیں۔ یہ لفظ اپنے اندر بڑے وسیع معنی رکھتا ہے۔ محبت وشفقت، عدل وانصاف، دیانت وامانت، جرأت وہمت، بھلائی واحسان، عفو ودرگزر، حسن معاشرت اور حسن سلوک وغیرہ۔ دنیا کا امن وامان، خوشی وخوش حالی اور عروج وترقی کا دارومدار انہی صفات پر ہے۔ ہر مذہب کے رہنماؤں نے ان صفات عالیہ کی تعلیم وتلقین کی ہے۔ اسلام ایک جامع مذہب ہے اور نبی اکرمؐ کی شخصیت معیارِ حق ہے۔ چنانچہ آپؐ نے زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح اخلاق کی تکمیل بھی فرمائی۔ آپؐ نے فرمایا :بعثت لاتمم حسن الاخلاق۔ (مؤطا امام مالک) ''مجھے اللہ کی طرف سے بھیجا گیا ہے تاکہ اخلاقی اچھائیوں کو تمام وکمال تک پہنچاؤں۔''

اللہ کے رسولؐ نے بھرپور سماجی زندگی گزاری، سماجی زندگی میں افراد خاندان کے حقوق وفرائض بھی آئیں گے اور خاندان سے باہر کے افراد کے بھی۔ اس تعلق سے آپؐ کے ارشادات بھی ہیں اور عملی نمونہ بھی۔

افراد خاندان میں والدین، شوہر، بیوی، بچے اور رشتہ دار آتے ہیں۔ ہر انسان کو فطری طور پر اپنے والدین سے محبت ہوتی ہے۔ اس لیے وہ ان کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ اللہ رب العزت نے بھی اپنے حق کے بعد ماں باپ کا حق رکھا ہے۔ ارشاد ہے: وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (النساء:۳۶) اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو۔''

ماں باپ کی خدمت پر اللہ کے رسولؐ نے بھی بہت زور دیا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ سے عرض کیا: بہترین عمل کون سا ہے جو اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند ہے، آپؐ نے ارشاد فرمایا: وقت پر نماز پڑھنا، میں نے عرض کیا۔ اس کے بعد؟ آپؐ نے فرمایا: ماں باپ سے اچھا سلوک کرنا، میں نے عرض کیا: پھر کون سا عمل بہتر ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: اللہ کے راستے میں جہاد کرنا۔ (بخاری و مسلم)

ایک دوسری حدیث میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبیؐ نے فرمایا: ''جو نیک اولاد بھی ماں باپ پر محبت بھری ایک نظر ڈالتی ہے اس کے بدلے خدا اس کو ایک حج مقبول کا ثواب بخشتا ہے۔'' لوگوں نے پوچھا، اے اللہ کے رسولؐ! اگر کوئی دن میں سو بار اسی طرح محبت کی نظر ڈالے؟ آپؐ نے فرمایا: تب بھی۔ خدا تمہارے تصور سے بہت بڑا ہے اور تنگ دلی جیسے عیبوں سے بالکل پاک ہے۔ (مسلم)

حدیث میں آیا ہے کہ حضورؐ انتہائی خوش اخلاق اور عالی ظرف تھے۔ گھر کے اندر اپنے اہل خانہ کے ساتھ محبت اور کشادہ دلی کا برتاؤ کرتے تھے اور سبھی بیویوں کے ساتھ برابری کا سلوک فرماتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے بہترین آدمی وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو اور میں اپنے گھر والوں کے معاملے میں تم میں سب سے بہتر ہوں۔'' (ابن ماجہ)

حضورؐ اپنی بیویوں کو دین کے احکام سکھاتے تھے اور انہیں اسلامی اخلاق کا خوگر بناتے تھے تاکہ وہ خود بھی اسلام پر عمل کر سکیں اور اسلام کی دعوت دوسری خواتین تک پہنچا سکیں۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق بیوی کو کوئی ایسا رویہ نہیں اختیار کرنا چاہیے جس سے اس کا شوہر ناراض ہو۔ وہ اپنی گھریلو ذمہ داریوں کو اس خوبی کے ساتھ نبھانے کی کوشش کرے کہ جب اس کی وفات ہو تو شوہر خلوصِ دل سے اس کے حق میں کلمۂ خیر کہے اور اس کی جدائی کے صدمہ کو محسوس کرے۔ رسول

اللہؐ نے ارشاد فرمایا: ''اگر میں اللہ کے سوا خلق میں سے کسی کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دینا چاہتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔'' (مشکوٰۃ عن ابی ہریرہ)

ماں باپ اولاد کے فطری معلم ہیں۔ نشو و نما کے دوران بچے کے ذہن اور مزاج پر گھر کے ماحول اور گرد و پیش کے اثرات غیر شعوری طور پر منعکس ہوتے ہیں۔ بچوں کی اچھی طرح پرورش کرنا اور ان سے پیار و محبت کرنا سنت رسولؐ ہے۔ آپؐ خود بھی بچوں سے پیار کرتے، انہیں گود میں لیتے اور ان سے خوش طبعی کی باتیں کرتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: تم اپنی اولاد کی عزت کرو اور انہیں تہذیب سکھاؤ۔'' (ابن ماجہ عن انس بن مالک) ''عزت کرو'' کا مطلب یہ ہے کہ ان کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کرو جس سے انہیں اپنی اہانت کا احساس نہ ہو اور ان کے ساتھ بد اخلاقی سے نہ پیش آؤ کہ وہ نفرت کرنے لگیں۔ ''بچوں کو تہذیب سکھاؤ'' کے معنی یہ ہیں کہ انہیں اسلامی اخلاق و آداب سے آراستہ کرو۔ بچپن کی اخلاقی تربیت کے اثرات بڑے دوررس ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی زبان اور کردار کی اصلاح پر خاص توجہ دینی چاہیے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''بندہ جب مر جاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے مگر تین چیزوں کا ثواب اسے برابر ملتا رہتا ہے: (۱) صدقہ جاریہ (۲) وہ علم جس سے نفع اٹھایا جاتا رہے اور (۳) صالح اور نیک اولاد جو اس کے لیے دعا گو رہے۔

اسلام میں رشتہ داروں کے حقوق بھی بیان کیے گئے ہیں۔ ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا اور محبت سے پیش آنا ہمارا فرض ہے۔ حضورؐ ہر کلمہ پڑھنے والے کو ترغیب دیتے تھے کہ وہ رشتے داروں کا خاص خیال رکھے۔ حضورؐ خود بھی اپنے رشتہ داروں کا بہت لحاظ رکھتے تھے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ میں نے نبی کریمؐ سے سنا ہے کہ ''جس کو روزی کی فراخی اور عمر کی درازی پسند ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ رشتہ داروں سے عمدہ سلوک کرے۔'' (بخاری) اگر رشتہ داروں کی طرف سے اچھا معاملہ نہ ہو رہا ہو تو بھی ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا ہمارا فرض ہے۔

سماجی زندگی میں پڑوسیوں کی بہت اہمیت ہے۔ آپؐ اپنے پڑوسیوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو آپؐ پر ایمان لا چکے تھے اور وہ بھی جو بہت دن تک دولت ایمان سے محروم رہے۔ آپؐ نے ہمیشہ ان کے ساتھ محبت کا برتاؤ کیا، ان کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھا۔ ایک حدیث مبارک میں آپؐ نے یہاں تک فرمایا ہے: ''وہ شخص مسلمان نہیں جو خود پیٹ بھر کر کھانا کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔'' (بخاری)

نیک اور اچھے وہ لوگ ہیں جو دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اللہ کے رسولؐ ہر انسان کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جس موقع پر لوگ غصہ ہوتے تھے، اس وقت بھی آپؐ نرمی کا معاملہ کرتے تھے۔ سیرت پاک میں آیا ہے کہ خواہ کوئی اپنا ہوتا یا پرایا، آپ سب کے ساتھ محبت سے پیش آتے تھے، یہاں تک کہ آپؐ نے جانوروں کے ساتھ بھی اچھی طرح سے پیش آنے کا حکم دیا۔ آپؐ نے ان کے منھ پر مارنے سے منع فرمایا ہے۔

اخلاقی تعلیمات وہدایات میں سے بعض کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہوتا ہے اور بعض کا تعلق سماج سے ہوتا ہے۔ ان تمام تعلیمات کا حد درجہ خیال رکھنا ضروری ہے۔ جیسے معاملات میں دیانتداری اور کاروبار میں سچائی وغیرہ۔ اس کے برعکس امانت میں خیانت، دھوکہ، فریب، ناپ تول میں کمی، سود اور رشوت کسی کو پسند نہیں۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (النساء:۲۹) ''اے ایمان والو! تم غلط اور ناجائز طریقے سے دوسروں کا مال نہ کھاؤ۔''

حضورؐ ابتدائی زندگی سے امانت داری اور سچائی پر عمل پیرا تھے۔ آپؐ کی ایمان داری کی شہرت پورے مکہ میں تھی۔ لوگ آپؐ کی دیانت داری پر اتنا بھروسہ کرتے تھے کہ بے جھجک اپنا مال اور روپے پیسے آپؐ کے پاس بطور امانت رکھوا دیتے اور آپؐ کو ''امین'' کہہ کر پکارتے تھے۔

ایک صحابی قیس مخزومیؓ نے انہی ایام میں کچھ دن تک آپؐ کے ساتھ کاروبار کیا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ ''میں نے معاملات میں آپؐ کو ہمیشہ راست باز اور صادق پایا اور آپؐ کا معاملہ ہمیشہ صاف رہا۔'' (سیرت النبیؐ) حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریمؐ نے فرمایا: ''اللہ اس مسلمان سے محبت کرتا ہے جو محنت کر کے روزی کماتا ہے۔'' (ابن ماجہ)

ان اخلاقی ہدایات کو عبادت سے بڑھ کر قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے ہم سب کو کوشش کرنی چاہیے کہ اللہ اور کے رسولؐ کے ارشادات کی روشنی میں زندگی گزاریں۔ اس کے باوجود اگر بشری کم زوریوں کی وجہ سے ہم سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے اور اس پر ہم سچے دل سے توبہ کرتے ہوئے آئندہ کبھی اس کا ارتکاب نہ کرنے کا عزم کریں تو ان شاء اللہ وہ ہمیں معاف فرما دے گا۔ اللہ تعالی توبہ کرنے والے بندے کو نہ صرف معاف کرتا ہے بلکہ اس سے محبت بھی کرنے لگتا ہے۔ اور جس بندے سے اللہ محبت کرنے لگے اس کو دنیا میں بھی عزت و سر بلندی نصیب ہوگی اور آخرت میں بھی وہ سرخ رو اور کامیاب ہوگا۔

محسن انسانیت ﷺ کی خدمت شعاری

محی الدین غازی،

ڈین فیکلٹی آف قرآن، الجامعہ الاسلامیہ، شانتا پرم۔ کیرلا

موبائل نمبر: 9745457475

حسین اخلاق کی دل آویز تصویریں دیکھنے کے لیے سب سے اچھی اور بھرپور البم پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حسین وجمیل سیرت ہے۔ جب بھی اسے دیکھیں کوئی بہت دلکش تصویر سامنے آجاتی ہے، اور دیر تک نگاہوں کو ٹھنڈک اور دل کو کیف عطا کرتی ہے۔ رسول پاک کی سیرت کا ایک بہت دلکش پہلو آپ کی خدمت شعاری ہے، اور سیرت کے البم میں اس کی بہت ساری حسین وجمیل تصویریں نظر آتی ہیں۔

خدمت ومواسات کی ایک دل آویز تصویر امیر المومنین حضرت عثمان پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اللہ کی قسم ہم سفر میں بھی اللہ کے رسول کے ساتھ رہے اور حضر میں بھی، آپ ہمارے بیماروں کی عیادت فرماتے تھے، جنازوں میں شریک ہوتے تھے، ہمارے ساتھ مہمات پر نکلتے تھے، اور سامان کم ہو یا زیادہ اس میں ہمارا خیال رکھا کرتے تھے۔

ایک بہت دل کش تصویر ام المومنین حضرت عائشہ دکھاتی ہیں، فرماتی ہیں: آپ اپنا کام تو خود کرتے ہی تھے، اہل خانہ کے کاموں میں بھی بھرپور شرکت کرتے تھے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ آپ انسانوں کی دعوت اور امت کی تربیت میں بے حد مصروف رہا کرتے تھے، نبوت کی ذمہ داری اتنی بڑی تھی کہ دنیا کی ساری ذمہ داریاں اس کے سامنے کچھ بھی نہیں ہیں، پھر آپ کی متعدد بیویاں تھیں، اور وہ سب آپ کی خدمت کرنے کا بے پناہ شوق رکھتی تھیں، اس کے باوجود آپ اپنی بیویوں کے کاموں میں شریک ہونے کا موقعہ اور وقت نکال لیا کرتے تھے، یہ خدمت کا انوکھا جذبہ تھا۔ خدمت دراصل محبت کا ایک بہت خوب صورت لباس ہے، اور آپ اپنی ازواج کے ساتھ رہتے ہوئے اس کا خاص اہتمام کرتے تھے۔

ایک اور حسین وجمیل تصویر ملاحظہ ہو، راوی بیان کرتے ہیں کہ نجاشی کا وفد مدینہ آیا، تو آپ خود بڑھ کر ان کی خدمت فرمانے لگے، لوگوں نے کہا، اللہ کے رسول آپ یہ زحمت نہ اٹھائیں ہم اس کام کے

لیے کافی ہیں، آپ نے فرمایا: ان لوگوں نے ہمارے ساتھیوں کے ساتھ بہت عزت وتکریم کا معاملہ کیا تھا، میں چاہتا ہوں ان کو اس کا اچھا صلہ دوں۔ اللہ کے رسول نے بہت اہم بات کی طرف اشارہ کیا، وہ یہ کہ کسی کے احسان کا بہترین صلہ اس کی خدمت کرنا ہے، محسن کی خدمت کرتے ہوئے احسان شناسی کا اظہار بہت خوبی کے ساتھ ہوتا ہے۔

پیارے صحابی انس بن مالک کو آپ ﷺ کی خدمت کا بے پناہ شوق تھا، شوق تو تمام پیارے صحابہ کو تھا، اللہ ان سب سے راضی ہو، مگر حضرت انس کا شوق بہت بڑھا ہوا تھا، پورے دس سال تک سفر ہو یا حضر، آپ ﷺ کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہے، کہ آقا کی خدمت کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ بہت پیارا تھا یہ شوق اور بڑی حسین تھی یہ دھن۔ اس شوق خدمت نے حضرت انس کی شخصیت کو بہت عظیم بنا دیا تھا۔ مگر ذرا اور آگے بڑھ کر آقائے پاک ﷺ کی شخصیت کا جمال بھی دیکھیں، حضرت انس فرماتے ہیں کہ خدمت کے شوق سے سرشار میں دس سال تک سفر وحضر میں آپ ﷺ کے ساتھ رہا، میری نگاہ ہر آن آپ ﷺ کی خدمت کے موقعے تلاش کیا کرتی تھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ''میں نے آپ ﷺ کی جتنی خدمت کی اس سے کہیں زیادہ خود آپ ﷺ نے میری خدمت فرمائی''۔ وكانت خِدمته لي اكثر من خِدمتي له۔ یہ جملہ خدمت کے باب میں ایک انوکھا اور نرالا جملہ ہے۔

قربان جائیں اس پیکر جمیل پر۔ حسن اخلاق کی کیسی اونچی اونچی بلندیاں انسانوں کو دکھائیں۔ آپ ﷺ سے پیارے صحابہ بہت محبت کرتے تھے، مگر آپ ﷺ ان سے اور زیادہ محبت کرتے تھے۔ پیارے صحابہ آپ ﷺ کی بہت خدمت کرنا چاہتے تھے، مگر آپ ﷺ اور زیادہ ان کی خدمت فرمادیتے تھے۔ کیا ہی خوب ہو اگر خدمت کرنے کو عار سمجھنے والے خدمت کو رسول ﷺ کی سنت اور اپنی شخصیت کا زیور سمجھ لیں۔

اللہ کے رسول نے انسانوں کی خدمت کا جذبہ اپنے ساتھیوں میں بھی کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا، آپ کی بے شمار نصیحتیں اس پر گواہ ہیں، آپ نے جو افراد تیار کیے تھے وہ خدمت لینے کے بجائے خدمت کرنے میں لطف محسوس کرتے تھے، ان کی راتیں اگر ایک طرف سجدے میں آنسو بہاتے اور پیشانی رگڑتے ہوئے گزرتی تھیں، تو دوسری طرف راتوں کے اندھیرے میں وہ پیٹھ پر بوریاں لاد کر محتاجوں کے گھروں میں پہنچایا کرتے تھے۔ سجدوں کے نشان تو پیشانی پر نظر آتے تھے، مگر پیٹھ پر بوریوں کے نشان کسی کو دکھائی نہیں دیتے تھے، وفات ہونے کے بعد جسم کو نہلانے والے پیٹھ کے وہ نشان دیکھ لیتے تھے،

اور تدفین کے بعد ان کی کمی کو وہ غرباء اور مساکین محسوس کرتے تھے جن کے یہاں رات کی تاریکی میں کوئی اجنبی کھانے کی بوریاں پہنچا دیا کرتا تھا۔

خدمت کو جو لوگ ایک بوجھ سمجھتے ہیں، ان کی پوری زندگی ناگواری کے ساتھ یہ بوجھ اٹھانے، یا بوجھ اٹھانے سے بھاگنے میں گزرتی ہے، وہ آرام چاہتے ہیں، مگر ان کی روح کو آرام کے لمحے بہت کم میسر آتے ہیں۔ اور جو خدمت کو اپنا شوق بنا لیتے ہیں، وہ سدا مگن رہتے ہیں، وہ کبھی تھکتے نہیں ہیں، کیونکہ شوق کا جذبہ تھکاوٹ کو قریب نہیں آنے دیتا ہے۔ ایسے لوگ جب تک خدمت کے کچھ کام نہ کر لیں ان کو اپنی زندگی میں کچھ کمی سی محسوس ہوتی ہے، خدمت کر کے وہ اپنی تکمیل کرتے ہیں۔

سلام ہو محسن انسانیت پر، کہ اگر سارے انسان مل کر آپ کی عمر بھر خدمت کرتے تو بھی خدمت کا حق ادا نہیں ہو پاتا، مگر آپ کسی سے خدمت لینے کے بجائے تمام عمر ساری انسانیت کی خدمت کے لیے آگے آگے رہے۔

●◘●

خدمت خلق اور اسوۂ رسولؐ

جوھر جاوید، گیا، بہار
موبائل نمبر: 8409640946

انسانی سماج کی تنظیم کے بعد سے ہی خدمت خلق کا تصور کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ انسانی برادری کی خدمت کو ہر دور میں توقیر و تحسین کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ پریشان حال کی مدد اور تعاون کے لیے آگے آنا خواہ وہ مادی ہو یا اخلاقی، ایک پسندیدہ اور نیکی کا کام ہے۔

سماج میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ غربت و مفلوک الحال بھی ہوتے ہیں اور یتیم و نادار بھی۔ ان کی ضروریات زندگی کیسے پوری ہو کہ وہ بھی عزت نفس کے ساتھ زندہ رہ سکیں اور سماج کی تشکیل و ترتیب میں اپنا کردار ادا کر سکیں، اس کی فکر سماج کے خوش حال طبقہ کو کرنی ہے۔

اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ یتیموں کی پرورش اور تعلیم و تربیت، یتیم خانے کا قیام، بیوہ خواتین کی ضروریات کی تکمیل اور ضعیف العمر افراد کی نگہداشت کے لیے اداروں کے قیام کا تصور ہمارے انسانی سماج میں بہت پہلے سے موجود ہے۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا، پیاسوں کو پانی پلانا، آسمانی آفات سے متاثر افراد و خاندان کی ہر قسم کی پریشانیوں کو دور کرنے کی سعی و جہد کرنا، مصیبت زدہ و بے بس و لاچار افراد کی فکر کرنا، یتیم بچوں اور بچیوں کی شادی بیاہ کے لیے کوشاں رہنا، قیدیوں کی رہائی کے لیے قانونی امداد بہم پہنچانا، شکستہ خاطر و مایوس انسانوں کے اندر حوصلہ پیدا کرنا، مظلوموں کی دادرسی اور ان کے حقوق کے لیے کھڑے ہونا، سماج کے دبے کچلے لوگوں کا سہارا بننا، مریض اور طبی امداد کے محتاج افراد کے علاج و معالجہ کا نظم کرنا، ان کی دوا دارو کے لیے فکر مند ہونا، یہ اور اس قبیل کے دیگر بہت سارے کام ہمیشہ سے نیکی اور بر کے کام باور کیے گئے ہیں۔ یہ خدمت خلق کا ہمہ گیر تصور ہے۔ مگر محمد عربیؐ کی تعلیمات کی شان یہ ہے کہ آپؐ نے ان تمام خدا ترسی کے کاموں کے لیے مستحکم، محرک اور مضبوط بنیاد فراہم کی ہے۔

بنی نوع انسانی الله کا کنبه :

"الخلق عيال الله واحب الخلق الى الله من أحسن الى عياله"۔(**مشکوۃ المصابیح**، باب

''ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب اللہ کے نزدیک وہ ہے جو اللہ کی عیال یعنی مخلوق کے ساتھ زیادہ بھلائی سے پیش آئے۔''

آپؐ نے ساری انسانیت کو اللہ کا کنبہ قرار دے کر تمام انسانوں کو ایک دوسرے کا ہم درد و غم گسار بنادیا، سب کو ایک دوسرے کی خوشی و غم میں شریک کردیا۔ نبی اکرمؐ کا یہ ارشاد غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے، اور خدمت خلق کے لیے ترغیب و تشویق کا مستحکم، پائیدار اور دائمی محرک فراہم کرتا ہے۔ ہم کسی درماندہ، مصیبت زدہ اور مفلوک الحال کی پریشانی کو کیوں دور کرنے کی کوشش کریں؟ یتیم و نادار کی مدد کا داعیہ ہمارے اندر کیوں پیدا ہو؟ اس لیے کہ تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ اللہ کے کنبہ کے کسی فرد کی خدمت کرکے اور اس کا سہارا بن کر گویا ہم اپنے رب کی خدمت کررہے ہیں۔ کتنا حسین اور کتنا شاندار تصور خدمت خلق ہے جو ہمیں نبی آخرالزماں کی تعلیمات میں ملتا ہے۔

ایک تمثیل:

خدمت خلق فی الواقع خالق کی خدمت ہے یا بالفاظ دیگر خالق کی خدمت وعبادت کا ظہور بندوں کی خدمت کی صورت میں ہوتا ہے۔ نبی اکرمؐ نے اس بات کو ایک تمثیل کے ذریعہ اس طرح بیان فرمایا ہے۔ مسلم شریف کی حدیث ہے کہ رسول مقبولؐ نے ارشاد فرمایا:

''قیامت کے دن اللہ تعالی انسان سے فرمائے گا: اے آدم کے بیٹے میں بیمار پڑا رہا تو نے میری عیادت نہیں کی، آدمی پریشان ہوکر عرض کرے گا کہ پروردگار تو بیمار کیسے پڑسکتا ہے اور میں تیری عیادت کیسے کرسکتا ہوں؟ اللہ تعالی ارشاد فرمائے گا کہ کیا تجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہے، لیکن تو نے اس کی مزاج پرسی نہیں کی، اگر تو وہاں جاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ پھر اس کے بعد اللہ تعالی ارشاد فرمائے گا کہ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا لیکن تو نے مجھے کھانا نہیں دیا۔ انسان عرض کرے گا کہ اے پروردگار عالم! تو کیسے بھوکا ہوسکتا ہے اور تجھے میں کیسے کھانا دیتا؟ اللہ کی طرف سے جواب آئے گا کہ کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا طلب کیا تھا لیکن تو نے اسے کھانا نہیں دیا۔ اگر تو اس کی ضرورت پوری کرتا تو آج اس کا اجر یہاں پاتا۔ اسی طرح اللہ تعالی ارشاد فرمائے گا، اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا، لیکن تو نے نہیں پلایا۔ انسان کہے گا: اے رب العالمین تو کیسے پیاسا ہوسکتا ہے اور تجھے میں کیسے پانی پلاتا؟ اللہ تعالی کی طرف سے جواب آئے گا کہ میرے فلاں بندے نے

تجھ سے پانی طلب کیا تھا لیکن تو نے اسے پانی دینے سے انکار کر دیا، اگر تو نے اس کی پیاس بجھائی ہوتی تو اس کا اجر آج یہاں پاتا۔'' اس سے بڑھ کر سعادت اور شرف کا کیا مقام ہوسکتا ہے کہ انسان کسی مسکین کو کھانا کھلا کر، کسی بیمار کی تیمارداری کر کے اپنے رب کو پالے۔''خیر الناس أنفعهم للناس'' یا ''خیر الناس من ینفع الناس''(صحیح الجامع:۳۲۸۹)

دوسری اہم بات جس کا سراغ خدمت خلق کے تعلق سے ہمیں تعلیمات نبویؐ میں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ''تم میں سب سے بہترین انسان وہ ہے جو اپنی ذات سے دوسرے کو نفع پہنچائے''۔اس ارشاد میں سرور دو عالمؐ نے بہترین انسان کی علامت یہ بتائی کہ وہ دوسروں کے کام آنے والا ہو، دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنے والا ہو، سماج میں اس کی ذات سے دوسرے انسانوں کو نفع حاصل ہو، وہ خیر و بھلائی کا سرچشمہ ہو، سراپا رحمت ہو، قرآن کریم میں اللہ تعالی کے لیے الرحمٰن اور الرحیم کی صفات کا متعدد مقامات پر تذکرہ ہے۔اسی طرح خاتم النبیین کو بھی رحیم کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے۔قرآن کریم میں جہاں ذات خداوندی کے لیے رب العالمین آیا ہے، وہیں سرور کونین کے لیے رحمۃ للعالمین کہا گیا ہے۔ان تفصیلات کا مقصود و مطمح اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ اللہ رحمٰن اور نبی آخر الزماں رحیم ہیں، تو رحمت و شفقت مومنین کا مزاج اور شعار بن جائے۔مومن کی ہر ادا، اس کے ہر شعار سے رحمت و شفقت ٹپکی پڑتی ہو۔اس کے سایے میں آکر پریشان سے پریشان حال انسان بھی راحت کا احساس کرے۔اس کا وجود اس سایہ دار درخت کے مانند ہو جائے جس کے سایے میں آکر ہر ذی نفس چین و سکون اور راحت اور اطمینان کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے۔

نبوت سے قبل کی زندگی:

نبوت سے قبل بھی آپؐ انسانی خدمت کے لیے مشہور و معروف تھے۔انسانی خدمت و ہمدردی، رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک، ناداروں اور محتاجوں کی مدد، ضرورت مند لوگوں کے بوجھ اٹھانا، مہمان نوازی کرنا اور آفات و بلیات کے دنوں میں متأثرہ افراد یا خاندان کی ہر ممکن خدمت بجالانا آپؐ کا شیوہ اور وطیرہ تھا۔اور آپ ﷺ کی ان خصوصیات وصفات نے اسلام کے ابتدائی دور میں آپؐ کی دعوت کے فروغ و توسیع میں بہت بنیادی کردار ادا کیا۔سیرت اور احادیث کی کتب میں ابتدائے وحی کا واقعہ بہت تفصیل سے بیان ہوا ہے، غار حرا میں پہلی وحی کے نزول کے بعد آپؐ بہت پریشان ہو گئے، گھر جا کر اپنی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہؓ سے فرمایا کہ''زملونی زملونی''مجھے چادر اوڑھا دیں، مجھے چادر

اوڑھادیں۔'' میں اپنی جان کو خطرہ میں پاتا ہوں۔ اس کے بعد آپؐ نے غار حرا میں پیش آنے والے واقعہ کی مکمل روداد بیان کی تو حضرت خدیجہؓ کہنے لگیں:

حضرت خدیجہؓ کا بیان:

"کلا واللہ لا یخزیك اللہ ابدا، انك لتصل الرحم، وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق۔" (بخاری)

''ہرگز نہیں اللہ کی قسم! اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا۔ کیونکہ آپؐ رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں۔ لوگوں کے بوجھ اٹھاتے ہیں۔ ناداروں اور محتاجوں کی مدد کرتے ہیں۔ مہمان نوازی کرتے ہیں اور مصیبت کے دنوں میں متأثرہ لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔

سیدہ خدیجہ الکبریٰؓ نے گویا خدمت خلق کے تمام شعبہ جات کی تقسیم کردی، رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنا، ان سے جڑنا، قطع تعلق نہ کرنا، مجبور و بے سہارا (الکل کے معنی ہوتے ہیں''من لا ولد لہ ولا والد، ومن یکون عبدا علی غیرہ، الضعیف ''یعنی آپؐ ایسے لوگوں کا سہارا بنتے ہیں جن کا کوئی سہارا نہیں، وہ دوسروں کے سہارے زندہ ہیں۔) لوگوں کا سہارا بننا، ان کا بوجھ اٹھانا، کفالت کرنا، نادار اور محتاجوں کی مدد کرنا، اور آسمانی آفات میں متأثرہ افراد یا خاندان کی مدد کرنا یہ سب خدمت خلق کے کام ہیں۔ یقیناً آپؐ ان تمام شعبوں میں کام کیا کرتے تھے۔ جس کے لیے آج بڑے بڑے تھنک ٹینک (Think Tank) اور عملے ہوتے ہیں اور بڑی بڑی افرادی قوت درکار ہوتی ہے۔

حضرت خدیجہؓ کا یہ بیان کہ اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا، بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اپنی اس بات کی پشت پر جو دلائل لے کر وہ آتی ہیں وہ نبی اکرمؐ کی انسانیت دوستی اور انسانی خدمات کی غماز ہیں۔ نبی اکرمؐ کی خدمت خلق کے لیے یہی تگ و دو تھی جو دین اسلام کی ہمہ گیر مقبولیت اور سریع الاثری کی مضبوط بنیاد بنی۔ ہمدردی، غم گساری، شفقت و محبت اور انسانی خدمت کی یہ وہ تلوار تھی جس کی کاٹ دشمنان اسلام پیش نہیں کر سکے۔ بڑھیا والا واقعہ اس کی روشن مثال ہے۔

محمدؐ کی باتوں میں مت آنا:

سیرت کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ ایک مرتبہ ایک بڑھیا سر راہ مزدور کی تلاش میں بیٹھی تھی کہ ادھر سے آپؐ تشریف لے آئے۔ آپؐ نے اس کی خواہش کے مطابق اس کا سامان اٹھایا اور اس کے گھر تک پہنچا دیا۔ راستے میں بڑھیا نے آپؐ کو ایک نصیحت کی۔ اس نے کہا کہ تم بھلے انسان معلوم ہوتے ہو۔

دیکھو محمدؐ کی باتوں میں مت آنا۔ میں نے سنا ہے کہ وہ لوگوں کو اپنے آبائی دین سے منحرف کردیتا ہے۔گھر پہنچنے پر اس نے آپؐ کا نام پوچھا، جب آپؐ نے اپنا نام بتایا تو وہ حیرت میں پڑگئی اور آپؐ کے اخلاق کو دیکھ کر فوراً ایمان لے آئی۔ یہ خدمت خلق کا نتیجہ ہے۔اس سے پہلے اس بڑھیا کے نزدیک آپؐ کی جتنی بھی منفی رپوٹنگ کی گئی تھی وہ سب کی سب آن واحد میں زائل ہوگئی۔ کیونکہ جب اس نے اپنی آنکھ سے محمدؐ کے کریمانہ اخلاق اور انسانی خدمت کے جذبے کی عملی تصویر دیکھ لی تو اسے اب مزید دلیل کی حاجت نہیں تھی۔وہ مسلمان ہوگئی۔

آج کی اسلام مخالف فضا میں یہ واقعہ ہمیں خدمت خلق کی جانب متوجہ کرتا ہے۔ہمیں اس بات کی قطعاً پرواہ نہیں کرنی چاہیے کہ برادران وطن کے اذہان میں اسلام کے تئیں بے شمار غلط فہمیاں میڈیا اور دیگر ذرائع سے بھری جارہی ہیں،قومی اور بین الاقوامی میڈیا اسلام کی بیخ کنی کے درپے ہے اور ہر ممکن ہتھکنڈے اپنارہی ہے کہ اسلام کی تصویر کو مسخ کیا جائے۔لیکن یقین مانیں خدمت خلق کے ذریعہ عملی طور پر ہم بہت آسانی سے اور مؤثر انداز میں ان سب چیزوں کا تریاق ڈھونڈا جاسکتا ہے۔کسی انسان کے ذہن کو خواہ کتنا بھی مسموم کردیا جائے لیکن اگر وہ ضرورت مند ہو اور آپ اس کی اللہ کے لیے، بغیر شکریہ اور معاوضہ کے طالب بنے خدمت کرتے ہیں تو وہ متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔خواہ کتنی بھی منفی تبلیغ کی گئی ہو۔وہ سب کی سب زائل ہوجائے گی۔

نبی اکرمؐ کے جذبۂ خدمت خلق کی تصویر کشی نعیم صدیقی نے کچھ اس طرح کی ہے:

''بیماروں کی عیادت کو اہتمام سے جاتے،سرہانے بیٹھ کر پوچھتے:''كيف تجدك ؟''(تمہاری طبیعت کیسی ہے؟) بیمار کی پیشانی اور نبض پر ہاتھ رکھتے،کبھی سینے اور پیٹھ پر دست شفقت پھیرتے اور کبھی چہرے پر،کھانے کو پوچھتے، بیمار کسی چیز کی خواہش کرتا تو اگر مضر نہ ہوتی تو منگوادیتے۔تسلی دیتے اور فرماتے''لا بأس! ان شاء الله طهور ''(فکر کی کوئی بات نہیں! خدا نے چاہا تو جلد شفایاب ہوگے)شفا کے لیے دعا فرماتے۔حضرت سعدؓ کے لیے تین بار دعا کی۔مشرک چچاؤں کی بیمار پرسی بھی کی۔ایک یہودی بچے کی عیادت بھی فرمائی(جو ایمان لے آیا)اس کام کے لیے کوئی دن اور وقت مقرر نہ تھا۔جب بھی اطلاع ملتی اور وقت ملتا تشریف لے جاتے۔''(محسن انسانیت:۹۷)

سید القوم خادمهم:

یہ تو وہ تعلیمات نبویؐ ہیں جن کا روئے سخن عام مومنین یا مسلمانوں کی طرف ہے۔رؤسائے قوم یا

سرداران قوم کی بابت آپ ﷺ کی یہ ہدایت زریں الفاظ میں لکھنے کے لائق ہیں۔آپؐ نے فرمایا:''سید القوم خادمھم ''قوم کا سردار تو قوم کا خادم ہوتا ہے۔'' یہ محض فلسفہ نہیں تھا بلکہ عین آپؐ کا خلق ہے۔آپؐ اور آپ کے زیر عاطفت تربیت یافتہ صحابہ کرامؓ خصوصاً خلفائے راشدین کی زندگیاں اس کلام نبوت کی عملی تشریح وتوضیح ہیں۔تاریخ وسیر کی کتابوں میں ایسے واقعات جابجا آپ کو مل جائیں گے جن میں نبی اکرمؐ خود دوسروں کے گھر جا کر ان کا کام انجام دیتے نظر آئیں گے۔

چند جھلکیاں:

حضرت خباب بن ارتؓ کو کسی غزوہ میں نبی اکرمؐ نے روانہ کیا تھا۔مرد کی صورت میں کوئی دوسرا آدمی ان کے یہاں نہیں تھا۔ان کے یہاں دودھاری مویشی تھے،مگر خواتین دودھ نکالنا نہیں جانتی تھیں۔آپؐ روزانہ ان کے گھر جا کر دودھ نکال لیتے تھے۔

حضرت صدیق اکبرؓ کی پوری زندگی خدمت خلق سے عبارت تھی۔غریبوں اور محتاجوں کی خدمت کرنا آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔آپ ﷺ ہمیشہ مصیبت زدہ انسانوں کی مدد کرتے،مقروضوں کے قرض کا بار اٹھاتے،نہایت فیاضی کے ساتھ مہمان نوازی کرتے اور جب بھی ضرورت ہوتی اس کی مالی اعانت بھی کرتے۔قرابت داروں میں حضرت مسطحؓ بن اثاثہ کے تمام مصارف کا ذمہ آپ نے اپنے سر لے رکھا تھا۔اسی طرح آپ لوگوں کی بکریاں ان کے گھر جا کر دوھ دیتے اور خلیفہ بننے کے بعد بھی آپؓ اس خدمت کو بدستور بجالاتے رہے۔

سیدنا فاروق اعظمؓ کے متعلق علامہ شبلیؒ نے الفاروق میں لکھا ہے کہ آپؓ بیوہ عورتوں کے گھر اپنے کاندھے پر مشک لے کر جاتے کیونکہ ان کے گھر میں پانی نہیں ہوتا۔آپؓ سے متعلق روایت میں آتا ہے کہ مدینہ کے قرب وجوار میں ایک نابینہ خاتون رہتی تھی،سیدنا فاروقؓ کو اس کے متعلق علم ہوا تو آپؓ روزانہ رات کو یا علی الصبح اس کے گھر جا کر اس کا کام کر دیا کرتے۔

آپؐ کا معمول تھا کہ آپ رات کو رعایہ کی خبر گیری کے لیے گشت کیا کرتے تھے۔ایک رات گشت کرتے ہوئے مدینہ سے دور نکل گئے۔وہاں دیکھتے ہیں کہ ایک خاتون کچھ پکار ہی ہیں اور اس کے ارد گرد دو تین بچے سسکیاں لے رہے ہیں۔آپؓ نے جب یہ ماجرہ دیکھا تو خاتون سے حقیقت حال معلوم کرنے کی کوشش کی۔معلوم ہوا کہ گھر میں کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔بچوں کو بہلانے کے لیے چولہے پر پانی کو ابال رہی ہے تا کہ بچوں کو تسلی رہے کہ کھانا بن رہا ہے اور وہ انتظار کرتے ہوئے

سو جائیں۔ یہ منظر آپؐ سے دیکھا نہ گیا آپؐ فوراً مدینہ لوٹ کر آئے اور اپنے کاندھے پر کھانے کا سامان لا دکر اس خاتون کے گھر پہنچا دیا۔ پھر کھانا خود پکایا اور بچوں کو کھلایا۔

نبی اکرمؐ کے دیگر اصحاب کے متعلق بھی خدمت خلق کے ایسے نادر واقعات تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ تاریخ انسانی کی ان عظیم ہستیوں نے دنیا کو حکمرانی کا یہ درس دیا کہ تاج و تخت اور حکومت و سلطنت حکمرانی و فرماں روائی کے لیے نہیں بلکہ انسانوں کی خدمت اور رعایا کی خبر گیری کے لیے ہوتی ہے۔ معلوم انسانی تاریخ ایسی روشن مثالیں پیش کرنے سے قاصر ہے۔

نبی اکرمؐ کا سماجی رابطہ:

خدمت خلق کا کام بغیر سماجی رابطہ کے کرنا مشکل ہے۔ جب تک انسان کا سماج میں رہ رہے لوگوں سے مضبوط رابطہ نہ ہو وہ اس کے مسائل سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہمارا سماجی رابطہ مضبوط ہو۔ ہم سب کے احوال اور مسائل سے دلچسپی لیں اور خود آگے بڑھ کر ان کے مسائل کو جاننے کی کوشش کریں۔ نبی اکرمؐ کے متعلق نعیم صدیقی نے لکھا ہے:

''حضورؐ انتہائی عظمت کے مقام پر فائز ہو کر اور تاریخ کا رخ بدلنے والے کارنامے انجام دے کر بھی عوامی حلقوں سے پوری طرح مربوط تھے۔ اور جماعت اور معاشرہ کے افراد سے شخصی اور نجی تعلق رکھتے تھے۔ آپؐ کا معمول تھا کہ راستے میں ملنے والوں سے سلام کہتے اور سلام کہنے میں پہل کرتے۔''

بیوائوں کے لیے کوشش کرنا جہاد ہے:

نبی اکرمؐ نے بیواؤں اور مسکینوں کے لیے کوشش کرنے والوں کو، ان کے لیے فکرمند اور ان کی ضرورتوں کو پوری کرنے کے لیے محنت کرنے والوں کو مجاہد فی سبیل اللہ کے مثل قرار دیا ہے۔ کتنی بڑی بشارت ہے ان پاک نفوس کے لیے جو ان لوگوں کا سہارا بنتے ہیں جن کا کوئی ظاہری سہارا نہیں۔ اور ان کی حاجات و ضروریات کی تکمیل کے لیے پریشان رہتے ہیں اور ہر ممکن سعی اس بات کی کرتے ہیں کہ ان کی زندگی بھی خوش حال رہے۔

نبی اکرمؐ نے فرمایا: الساعی علی الارملة والمسکین کالمجاھد فی سبیل اللہ وأحسبه قال وکالقائم لا یفتر وکالصائم لا یفطر۔'' (بخاری و مسلم)

''بیواؤں اور مسکین کی خدمت کرنے والا مجاہد فی سبیل اللہ کی مانند ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ وہ اس نمازی کی طرح ہے جو مسلسل نماز پڑھتا ہے اور اس روزے

دار کی طرح ہے جو افطار نہیں کرتا۔''

یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں نبی اکرمؐ کے ساتھ ہوگا:

یتیم سماج کا سب سے کمزور طبقہ ہوتا ہے۔ قرآن وحدیث میں یتیم کی خبر گیری کرنے، ان کی نگہداشت کرنے اور ان کی کفالت کرنے پر پرزور الفاظ میں ابھارا گیا ہے۔ تاکہ باپ کی محبتوں اور شفقتوں سے محروم بچے اپنی مالی تنگی کے باعث دل برداشتہ نہ ہوں اور انہیں اپنی یتیمی کا احساس نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جناب محمدؐ یتیموں کے متعلق حسن سلوک کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ آپؐ نے یتیموں کی نگہداشت کی مسلسل تلقین فرمائی اور اسے انسانیت اور اسلام کا اہم فریضہ بتایا۔ آپؐ نے مسلمانوں کے اندر یتیموں کی خبر گیری کرنے اور ان کی کفالت کرنے کے جذبہ کو ابھارتے ہوئے فرمایا: ''انا و کافل الیتیم فی الجنة ھکذا'' (بخاری، کتاب الادب)

''میں اور یتیم جنت میں اس طرح ہوں گے جیسے یہ دو انگلیاں ہیں۔'' یعنی یتیم کی کفالت کرنے والوں کو جنت میں نبی اکرمؐ کی معیت اور قربت کا شرف نصیب ہوگا۔ ترغیب وتشویق کا کتنا عمدہ انداز آپؐ نے اختیار کیا کہ لوگ یتیموں کی خبر گیری کے لیے آگے آئیں اور ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئیں۔ یہ صرف اور صرف نبی اکرمؐ کا کارنامہ ہے کہ آپؐ نے سماج کے اس کمزورترین طبقہ کے لیے مستقل نگہداشت کا سامان فرمایا۔ سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں:

''آج دنیا کے شہر شہر میں یتیم خانے قائم ہیں، مگر اگر یہ سوال کیا جائے کہ محمدؐ سے پہلے بھی یہ بدقسمت گروہ اس نعمت سے آشنا تھا تو تاریخ کی زبان سے جواب نفی میں ملے گا۔ اسلام پہلا مذہب ہے، جس نے اس مظلوم فرقہ کی دادرسی کی۔ عرب پہلی سرزمین ہے، جہاں کسی یتیم خانے کی بنیاد پڑی اور اس کی حکومت دنیا کی پہلی حکومت ہے جس نے اس ذمہ داری کو محسوس کیا اور عرب، مصر شام، عراق، ہندوستان، جہاں جہاں مسلمانوں نے اپنی حکومتوں کی بنیادیں ڈالیں ساتھ ساتھ ان مظلوموں کے لیے بھی امن و راحت کے گھر بنائے۔ ان کے لیے وظیفے مقرر کیے، مکتب قائم کیے، جائیدادیں وقف کیں۔'' (سیرۃ النبیؐ جلد ۶، ص: ۱۴۳)

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے:

رسول مقبولؐ نے ارشاد فرمایا: مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ تو وہ اسے رسوا کرے اور نہ اس پر ظلم کرے اور جو اپنے بھائی کی حاجت روائی میں رہے گا اللہ اس کی ضرورت کو پورا کرتا رہے گا اور جو مسلمان

سے کوئی تکلیف دور کرے گا اللہ اس سے قیامت کے دن تکالیف دور کرے گا اور جو مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا قیامت کے دن اللہ اس کی پردہ پوشی کرے گا۔ (حضرت عبداللہ ابن عمرؓ)

اس ارشاد مبارک میں ایک فقرہ بہت اہمیت کا حامل ہے وہ یہ کہ جب تک انسان اپنے بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے اللہ اس کی مدد کرتا رہتا ہے۔ خدمت انسانیت کے لیے اس سے بڑھ کر ترغیب کے کیا الفاظ ہو سکتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان یہ چاہتا ہے کہ اللہ کی مدد ہمیشہ اس کے ساتھ شامل حال رہے تو اسے اپنے بھائی کی مدد، خدمت اور ضرورتوں کی تکمیل میں کوشاں رہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گی۔

محتاج اور مساکین کی دادرسی کرنے والا نبی اکرمؐ سے بڑھ کر کون ہے؟ آپؐ نے سماج کے اس طبقہ کی مدد و اعانت کے لیے خوش حال لوگوں کو ہدایت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''اللہ جل شانہ کو سب سے زیادہ یہ عمل پسند ہے کہ کسی مسکین کو کھانا کھلایا جائے۔'' تعلیمات نبویؐ میں ہم دیکھتے ہیں کہ سماج کے جتنے بھی کم زور ترین افراد ہیں، ان کی دادرسی کی گئی ہے اور ان کی اعانت پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ قرآن کریم میں بھی سماج کے اس طبقے کی خبر گیری کرنے پر بڑی تاکید موجود ہے اور ایسے لوگوں کو جنت کی بشارت دی گئی ہے جو مسکینوں اور محتاجوں کی خبر گیری کرتے ہیں۔ اسی طرح آپؐ نے ارشاد فرمایا: مسلمان ایک جسد واحد کی مانند ہیں۔ جس کا اگر ایک عضو درد میں مبتلا ہو تو پورا بدن تکلیف محسوس کرتا ہے۔'' ایک اور حدیث میں فرمایا کہ ''الناس کلھم سواء کأسنان المشط'' انسان آپس میں کنگھی کے دندانوں کی طرح ہیں یعنی تمام انسان آپس میں مل کر ہی مؤثر انداز میں کام انجام دے سکتے ہیں۔''

الدین النصیحة:

آپؐ نے تمام لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنے کی جانب متوجہ کیا ہے۔ مسلمانوں کو سب کا خیر خواہ اور معاون ہونا چاہیے۔ مزید آپؐ نے ارشاد فرمایا: اگر تم خدا سے محبت کرتے ہو تو پہلے اس کے بندوں سے محبت کرو۔'' اور یہ بھی فرمایا کہ ''ایمان کی علامت خلق اللہ سے مہربانی و مروت کرنا ہے۔''

اس طرح کے متعدد ارشادات نبویؐ ہیں جو احادیث کی کتابوں میں آسانی مل جائیں گے مگر سب کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کی قدر و منزلت اسی وقت ہے جبکہ وہ اپنے دل میں دوسروں کا غم اور درد رکھتا ہو، سب کے کام آتا ہو اور سب کی خدمت کرتا ہو۔ یہی خدمت خلق انسانیت کا جوہر بھی ہے اور انسان کے لیے اپنے رب کو پانے کا ذریعہ بھی۔ اللہ ہم سب کو نبی آخرالزماںؐ کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے خدمت خلق کی توفیق دے۔ آمین ثم آمین

انسانوں کی خدمت سے معمور سیرت پاک ﷺ

عبدالحاکم مجاہد، مرکز جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی

انسان اپنے فرائض وواجبات کے علاوہ جواچھا رویہ، انسانوں کے ساتھ خصوصی طور پر اور بالعموم تمام مخلوقات کے ساتھ اختیار کرتا ہے، اسے خدمت خلق کہتے ہیں۔قیامت کے دن انسان کا مواخذہ فرائض و واجبات کی عدم ادائیگی پر ہوگا۔ان کے علاوہ اس کے جو اعمال ہوں گے وہ اس کے درجات کی بلندی کے لیے کام آئیں گے،لیکن جس طرح کوئی انسان اپنے لیے یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ احسان کا معاملہ نہ کیا جائے، ٹھیک اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی اپنی مخلوقات کے سلسلہ میں یہی چاہتا ہے کہ ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ احسان کا معاملہ ہو۔جو نعمتیں بھی اس نے اپنے بندے کو نوازی ہیں ان سے زیادہ سے زیادہ لوگ مستفید ہوں۔اگر ایک شخص کسی کے ساتھ احسان کا معاملہ اختیار نہیں کرتا تو اسے دوسرے کو نقصان پہنچانے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔نظام عالم کو چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جس طرح تمام چیزوں کے درمیان خدمت کا مضبوط رشتہ قائم کیا ہے، اسی طرح کا رشتہ انسانوں کے درمیان بھی وجود میں آئے اور اس کائنات کے حسن میں مزید اضافہ ہو۔

خدمت کی ابتدا اپنے گھر اور خاندان کے افراد سے ہوتی ہے۔جو شخص ان کے درمیان اپنا رویہ درست رکھتا ہے، وہ اخلاقی مدارج طے کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے،اس کے اخلاق وکردار میں وسعت آتی رہتی ہے،اوروہ دنیا کی ہر مخلوق کے ساتھ ایسا ہی تعاون کا معاملہ کرتا ہے۔انسانی اخلاق جوں جوں بلند ہوتے ہیں،اس کے اندر خدمت خلق کا جذبہ بھی پروان چڑھتا رہتا ہے۔مثلاً ایک پیاسا شخص ایسی جگہ پر ہے جہاں وہ اپنے اختیار سے پانی حاصل نہیں کرسکتا،وہ کسی بااختیار فرد سے اس کا مطالبہ کرتا ہے،دوسرے شخص پر اس کے مطالبے کو پورا کرنا لازم ہے،لیکن وہ سادہ پانی پیش کرنے کے بجائے اس کی پیاس بجھانے کے لیے ٹھنڈے پانی سے اس کی خاطر تواضع کرتا ہے تو یہ خدمت خلق کی اعلیٰ مثال ہے۔اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’کوئی شخص دو آدمیوں کے درمیان انصاف کردے یہ بھی صدقہ ہے، کسی کو جانور پر سوار ہونے میں مدد دے یہ بھی صدقہ ہے،سواری پر کسی کا سامان رکھ دے یہ بھی

صدقہ ہے۔زبان سے اچھی بات کرے یہ بھی صدقہ ہے۔اسی طرح نماز کے لیے جو قدم اٹھائے وہ بھی صدقہ ہے۔راستہ سے کسی تکلیف دہ چیز کو دور کر دے یہ بھی صدقہ ہے۔'' (بخاری و مسلم)

ایک انسان جب کسی دوسرے انسان کے ساتھ احسان کا معاملہ کرتا ہے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا ہے کہ اس کا تعلق صرف ایک انسان سے ہے، بلکہ اس کے احسان کے نتیجے میں ملنے والے فوائد کے اثرات بعض دفعہ کئی نسلوں تک دیکھے جاسکتے ہیں۔اسی طرح اگر کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے ساتھ برے اور ناپسندیدہ اخلاق کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس کے اثرات بھی دیرپا ہوتے ہیں۔اسلام تمام مخلوقات کے ساتھ احسان کا معاملہ اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ایسا کرنے پر وہ جنت کے اعلیٰ مقام کی بشارت دیتا ہے۔خدمت خلق سے عام انسانوں کی دوری کی ایک اہم اور بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ انسان کی نظر ایک چھوٹی سی ظاہری چیز کو دیکھ کر فیصلہ کرتی ہے کہ وہ ایک معمولی اور حقیر خدمت کیوں انجام دے۔اس کی نظر سے یہ چیز اوجھل رہتی ہے کہ پانی کے جہاز کو ڈبونے کے لیے چھوٹا سا سوراخ ہی کافی ہوتا ہے۔

خدمت خلق ایک بنیادی قدر ہے۔دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ تمام چیزیں ایک دوسرے کے تعاون کی محتاج ہیں۔کوئی چیز بذات خود پروان نہیں چڑھتی، جب تک کہ اسے دوسری چیزوں کا تعاون حاصل نہ ہو۔ایک دوسرے کے تعاون سے ایک چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی اس دنیا میں اپنا اہم کردار ادا کرتی نظر آتی ہے۔لیکن یہ تعاون جب مفقود ہوتا ہے تو پھر دنیا کی بڑی سے بڑی چیز بھی ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کا شکار ہو جاتی ہے۔ایک چھوٹے سے پودے کو پروان چڑھنے کے لیے ہوا، پانی، مٹی، کھاد اور دھوپ وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔جب تک یہ چیزیں اسے فراہم ہوں، پودا پروان چڑھتا رہتا ہے۔لیکن جیسے ہی ان میں سے کوئی چیز کم ہو جائے، وہ خشک ہونا شروع ہو جاتا ہے اور اس کی ترقی ماند پڑنے لگتی ہے۔ایک بڑے سے بڑا پہاڑ بھی اپنی جگہ پر اسی وقت تک قائم رہتا ہے جب تک کہ اسے موسم، آب و ہوا، درخت اور پیڑ پودے اپنا تعاون فراہم کرتے رہیں، لیکن ان میں سے کوئی چیز اپنی جگہ سے ہٹ جاتی ہے تو اس کی صلاحیت ختم ہونے لگتی ہے۔تعاون اور ایک دوسرے کی خدمت کا یہ نظام جب تک باقی رہے گا، دنیا کا نظام صحیح سلامت چلتا رہے گا۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کی جو منظر کشی کی ہے کہ اس دن زمین، پہاڑ، آسمان، سورج، چاند، تارے وغیرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائیں گے اور وہ تمام چیزیں ہوا میں تیرتی ہوئی نظر آئیں

گی،اس پر غور کریں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنی مضبوط اور بھاری بھرکم چیزیں اپنی جگہ کیوں اور کیسے چھوڑ دیں گی؟ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان تعاون کا جو رشتہ قائم کیا ہے، وہ اس دن خدا کے حکم سے ختم ہو جائے گا، پھر وہ بذات خود اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتے۔ یہی کیفیت جب بحیثیت انسان ہم اختیار کرنا چھوڑ دیں گے تو دھیرے دھیرے قرب قیامت تک پہنچ جائیں گے اور جب قیامت واقع ہو جائے گی تو اللہ تعالیٰ حساب و کتاب تک انسانوں کے درمیان بھی انسانی رشتہ ختم کر دے گا۔ پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک انسان کی نظر اپنے ننگے جسم پر نہیں جائے گی اور ایک حاملہ عورت اپنے حمل کو ضائع کر دے گی۔

حقوق کی قسمیں

حقوق کی دو قسمیں کی گئی ہیں: حقوق اللہ اور حقوق العباد

(ا) حقوق اللہ وہ حقوق ہیں جو بلا واسطہ خدا اور بندے سے تعلق رکھتے ہیں، جیسے نماز، روزہ، دعا، اذکار وغیرہ۔ یہ عبادات بندوں کو اپنے رب سے جوڑنے کا ذریعہ ہیں۔ان سے بندہ اور رب کے درمیان رشتہ مضبوط ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔اس کے بااختیار ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ ایمان میں مضبوطی واستحکام پیدا ہوتا ہے۔ جب یہ کیفیت ہوتی ہے تو انسان کے اندر عاجزی، انکساری، ہمدردی، اور اخوت و بھائی چارگی کی روح پروان چڑھتی ہے۔ پھر وہ اپنی ذات سے خلق خدا کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’میں نے ایک شخص کو جنت میں چلتے پھرتے دیکھا (جس کا خاص عمل یہ تھا کہ) اس نے راستہ میں موجود ایک ایسا درخت کاٹ دیا تھا جو لوگوں کو تکلیف دے رہا تھا۔‘‘

(ب) حقوق العباد وہ حقوق ہیں جو براہ راست انسانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ حقوق اللہ کی ادائیگی کے نتیجہ میں مذکورہ جو اثرات انسانی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں وہ حقوق العباد کی راہ میں آسانیاں فراہم کرتے ہیں۔ پھر انسان جو بھی عمل انجام دیتا ہے، اس میں وہ ایک اعلیٰ مقصد کو پیش نظر رکھتا ہے۔ یہ اعلیٰ مقصد اسے جنت کی اس کشادگی کی طرف لے جاتا ہے، جو زمین و آسمان کی وسعت سے بڑھ کر ہے۔ انسان کو یہ اتنا بڑا اور عظیم انعام کیوں دیا جاتا ہے؟ عقل یہ کہتی ہے کہ ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ معاملات برتنے کا جو اعلیٰ معیار ہے اس کا انعام بھی اتنا ہی بڑا اور دائمی ہونا چاہیے۔

جنت اور جہنم کا راستہ اخلاص اور دکھاوے کے درمیان سے ہو کر گزرتا ہے۔ یعنی یہ کہ انسان کا عمل اگر اخلاص کے ساتھ انجام دیا گیا ہے تو اسے جنت ملتی ہے، ورنہ جہنم اس کا ٹھکانہ ہوگا۔ انسان کا عمل چھوٹا ہو، لیکن اخلاص سے پر ہو تو وہ بھی اللہ اور اس کے رسول کی نظر میں بڑا ہو جاتا ہے۔

انسانوں کی خدمت اللہ کے حکم کی تعمیل میں

اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔ جو صفات اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے منتخب کی ہیں، ان کو وہ انسان کے اندر بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا ہے، وہ معاف کرنا پسند کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسانوں کے آپسی معاملات بھی رحم و کرم پر مبنی ہوں۔ وہ ہر چیز سے بے نیاز ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے بھی یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ قناعت پسند ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہی تمام مخلوقات کا رب ہے، لہٰذا وہ چاہتا ہے کہ اسی کی عبادت اور پرستش کی جائے، اس نے اپنے بندوں کے اندر یہ خو ڈال دی ہے کہ وہ احسان فراموشی کو پسند نہیں کرتے۔ وہ فیاض ہے، جسے جتنا چاہتا ہے عطا کرتا ہے، اس لیے بخل اس کی نظر میں ناپسندیدہ عمل ہے۔ عبادات کا اعلیٰ اور مطلوب معیار یہ ہے کہ انسان جو بھی عبادت کرے وہ رضائے الٰہی کو پیش نظر رکھ کر کرے۔ اس کی نظر میں عبادات کا صلہ نہ ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ مومن کو اس کے نیک عمل کا اجر آخرت میں عطا کیا جائے گا۔

یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ یہاں کا نظام اس قاعدہ پر چل رہا ہے کہ اگر مثبت رخ پر کوشش کی جائے تو اس کے اثرات بھی انسان چکھ لے گا۔ قطع نظر اس سے کہ وہ کوشش کرنے والا فرد مومن ہے یا کافر۔ یعنی یہ کہ کوشش کرنے والا ایمان کے لحاظ سے مومن ہے یا کافر، اللہ تعالیٰ کو اس سے پرواہ نہیں ہے۔ کوشش اگر یکساں ہے تو نتائج بھی یکساں ہوں گے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا لینی دینی ہے، آپ جیسا کریں گے ویسا انجام آپ کو مل کر رہے گا۔ آپ اچھا عمل کریں گے تو آپ کے ساتھ لوگ اچھا سلوک کریں گے اور اگر آپ برا عمل کریں گے تو اس کے اثراتِ بد آپ پر پڑ کر رہیں گے۔ ایک مومن کو نیک عمل سے روکنے کے لیے شیطان کا یہ کتنا بڑا وسوسہ ہے کہ ہم اپنا صلہ آخرت پر چھوڑ دیتے ہیں اور ایک غیر مسلم کو اس کا صلہ دنیا ہی میں عطا کر دیتے ہیں! انجام میں جلدی اور تاخیر ہو سکتی ہے۔ جس طرح ایک شخص کے اچھے عمل کا نتیجہ ضروری نہیں کہ اس کی زندگی ہی میں سامنے آ جائے اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ اس کے برے عمل کا نتیجہ وہ دیکھ لے۔ نتائج انسان کے فہم و ادراک اور اندازے پر پورے نہیں اترتے۔ نتائج کا انحصار تو اس پر ہے کہ انسان کے عمل نے معاشرے اور سماج پر کس حد تک اثرات چھوڑے ہیں۔

انسان کے عمل کے اثرات اگر گہرے ہیں تو وہ جلد نمایاں ہوں گے اور اگر اس کے اثرات انسانی سماج اور معاشرے پر نمایاں نہیں ہیں تو جب کبھی وہ نمایاں ہوں گے، تب اس کے نتائج دیکھنے کو ملیں گے۔ البتہ آخرت کا اجر صرف انہی لوگوں کے حصے میں آئے گا جن کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ عصر میں کیا ہے اور ان کے یہ اوصاف بیان کیے ہیں: ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر۔ یہ چار صفات ہمیں بتاتی ہیں کہ آخرت کی کامیابی اہل ایمان کے لیے مخصوص ہے۔

ایک سکھ صاحب نے کچھ دن قبل بس اسٹاپ پر میرے ساتھ تین اَور لوگوں کو اپنی کار میں لفٹ دی۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ یہ ان کی فطرت ہے۔ راستے میں جو بھی مسافر سواری کا انتظار کرتا یا پیدل چلتا ہوا نظر آتا ہے، جگہ ہونے پر وہ ان کو اپنی گاڑی میں بٹھا لیتے ہیں۔ ایک صاحب نے کہا کہ سر! آپ کو یہ کام کرتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟ انہوں نے بڑے فخریہ لہجہ میں جواب دیا کہ آج تک میں نے کسی کے ساتھ برا نہیں کیا تو کوئی میرے ساتھ کیوں برا کرے گا۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ یہ کام وہ برسوں سے انجام دے رہے ہیں اور آج تک ان کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جس سے ان کو کسی طرح کا نقصان ہوا ہو۔ چنانچہ ان کی کمیونٹی کے ان جیسے افراد کے ان اعمال کا نتیجہ ہے کہ آج سکھ کمیونٹی کو ایک معزز حیثیت حاصل ہے۔

علم کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ یہ خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔ یہ مقولہ صرف علم ہی پر نہیں بلکہ ان تمام چیزوں پر بھی صادق آتا ہے جن کا تعلق انسانی رشتوں کو پائیدار بنانے کے لیے ضروری ہے۔ مثلاً آپ دوسروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے ہیں تو دوسرے لوگ بھی آپ سے عزت واحترام کے ساتھ پیش آئیں گے۔ آپ کسی تنگ دست کے ساتھ فیاضانہ سلوک کرتے ہیں تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ آپ کے رزق میں کشادگی پیدا کرتا ہے۔ آپ لوگوں کے لیے راہیں آسان کرتے ہیں تو لوگ بھی ضرورت پر آپ کے کام آئیں گے۔ حتیٰ کہ اگر آپ اپنے دل میں کسی کے لیے نیک جذبات رکھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں بھی آپ کی محبت ڈال دیتا ہے۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ ہم اپنی مجلس میں کسی کو یاد کر رہے ہوتے ہیں اور وہ حاضر ہو جاتا ہے، اس کا مطلب ہے کہ انسان اپنے خیالات کے ذریعہ بھی ایک دوسرے کے ربط میں آجاتا ہے۔

رسول اللہؐ کا حضرت خدیجہؓ سے مکالمہ

نبوت سے سرفراز ہونے پر جب رسول اللہ ﷺ اپنے گھر حضرت خدیجہؓ کے پاس تشریف لائے تو

آپؐ نے ان کو جو باتیں کہہ کر تسلی دی، وہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔قربان جایئے حضرت خدیجہؓ کی دوررس نگاہوں پر۔انہوں نے فرمایا:''آپؐ غریبوں، یتیموں، بے کسوں، مظلوموں کے حمایتی اور خیرخواہ ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز بے یارومددگار نہیں چھوڑے گا۔'' تاریخ شاہد ہے، دنیا نے وہ دن بھی دیکھا کہ فتح مکہ کے موقع پر تقریباً ایک لاکھ کی جمعیت آپ کے ساتھ موجود تھی۔اور فرط مسرت سے آپؐ اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر کہہ رہے تھے:اللھم اشھد، اللھم اشھد، اللھم اشھد۔

خدمت خلق کے بارے میں اقوال رسولؐ

خدمت خلق کے سلسلے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہدایات ہمیں دی ہیں ان میں سے بعض واجبات کے درجہ کی ہیں اور بعض مستحبات کے درجے کی۔مثلاً آپؐ نے ارشاد فرمایا:''جو خود پیٹ بھر کر کھانا کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے، وہ ہم میں سے نہیں۔'' ایک دوسرے موقع پر ارشاد فرمایا :''راستے سے کانٹا ہٹانا بھی صدقہ ہے۔'' یہ اور اس طرح کی دوسری احادیث کی ایک لمبی فہرست ہے جن کے ذکر سے مضمون کی طوالت کا اندیشہ ہے۔ان تمام احادیث کو اگر پیش نظر رکھ کر غور کیا جائے تو سب کا خلاصہ یہی نکلتا ہے کہ اسلام کے غالب ہونے میں ان ہی کا عمل دخل ہے ۔موجودہ دور میں جن ملی ،قومی، ملکی اور عالمی مسائل سے امت مسلمہ دوچار ہے، ان کے حل کے سلسلے میں ہمیں بلالحاظ قوم وملت حسب استطاعت اپنی پوری تگ ودو کا محور خدمت خلق کو بنالینا چاہیے۔ ہمارا یہ کام انفرادی طور پر بھی ہوسکتا ہے اور اجتماعی طور پر بھی۔ یہ ہر انسان کی اپنی پسند ہے کہ وہ اس کام کو کس طرح بہتر طور پر انجام دے سکتا ہے۔لیکن ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ انسان کے اجتماعی یا انفرادی عمل کا نتیجہ بھی اجتماعی اور انفرادی ہوتا ہے۔ انسان اگر کسی بھلائی کو فروغ دینے کے لیے اجتماعی کوشش کرتا ہے تو اس کے اثرات بھی اجتماعی طور پر قبول کیے جائیں گے اسی طرح جب کسی برائی کو اجتماعی طور پر فروغ دینے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس کے اثرات بھی پوری اجتماعیت پر پڑتے ہیں۔بحیثیت امت وسط، ہمارا عظیم مقصد اللہ تعالیٰ نے خود واضح کردیا ہے:یأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر ۔معروفات میں وہ تمام امور شامل ہیں جن کو اللہ اور اس کے رسول نے کرنے کا حکم دیا ہے یا ان پر ابھارا ہے اور منکرات میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جن سے اللہ اور اس کے رسول نے منع کیا ہے یا ان پر وعید سنائی گئی ہے۔وہ تمام امور جن کا شمار معروفات میں ہوتا ہے، ان کو کرنا یا ان کی طرف راغب کرنا اور وہ تمام امور جن کا منکرات میں شمار کیا جاتا ہے، ان سے باز رہنا اور ان سے دوسروں کو باز رکھنا، یہی خدمت خلق ہے۔ان میں کسی چیز کو

آپ الگ کر کے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ خدمت خلق کے امور نہیں ہیں، الّا یہ کہ وہ امور حقوق اللہ سے متعلق ہوں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

''تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جس سے خیر کی توقع کی جائے اور جس کے شر سے لوگ محفوظ رہیں اور تم میں سے بدترین شخص وہ ہے جس سے خیر کی توقع کی نہ کی جائے اور جس کے شر سے لوگ محفوظ نہ رہیں۔'' (مسند احمد، ترمذی)

موجودہ دور میں این جی اوز کی اہمیت

ماضی کے بالمقابل موجودہ دور میں، جبکہ ذرائع ابلاغ کے وسیع ذرائع ہمیں فراہم ہیں، خدمت خلق کے ذریعہ تمام لوگوں تک پہنچنا اور بھی زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ اس وقت فاقہ کشی، ناخواندگی اور بے روزگاری، ایسے مسائل ہیں جس کا شکار بلا لحاظ قوم وملت تمام لوگ ہیں۔ ان کے حل کے سلسلے میں بھی عام طور پر یکساں بے توجہی پائی جاتی ہے، جس کی وجہ سے بہت سارے نت نئے مسائل نے جنم لیا ہے۔

موجودہ دور میں خدمت خلق کو انجام دینے کے لیے مختلف این جی اوز قائم ہیں، جن کے سماج پر گہرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ کہیں کہیں ایک دو شکایتیں بھی سننے میں آتی ہیں، جو کہ ناپسندیدہ ہیں۔ خدمت خلق کے سلسلے میں اگر مسلمانوں کے درمیان عام شعور کو بیدار کیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ ہماری ایک نئی پہچان بنے گی اور غیر مسلمین کے درمیان اسلام کی شبیہ صاف ہوگی۔ مسلمانوں کے پاس چونکہ عقیدۂ آخرت ہے، وہ یہ جانتے ہیں کہ ہم جو کچھ بھی عمل کر رہے ہیں آخرت میں ہمیں اس کا حساب و کتاب دینا ہے، اس لحاظ سے اگر ہم غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ غیر مسلمین کے مقابلے مسلمان اس کام کو بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں۔

رسول اللہؐ کا عملی نمونہ

نبوت سے قبل اور نبوت کے بعد کی نبی مکرم ﷺ کی پوری زندگی خدمت خلق سے عبارت ہے۔ تاریخ کے اوراق میں آپ کی آٹھ سالہ عمر کا وہ واقعہ قارئین کے ذہن میں ہوگا جب آپ نے خانۂ کعبہ کی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس سے آپ کی زندگی کے رخ کا پتہ چلتا ہے۔ نبوت سے قبل کا وہ واقعہ بھی معروف ہے کہ جب خانۂ کعبہ کی از سر نو تعمیر کے موقع پر اختلاف ہوا اور آپ نے اپنی کمال درجہ ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے جنگ و جدال کے ایک یقینی موقع کو ختم کر دیا۔ یہ واقعہ اس

بات کا ثبوت ہے کہ نبوت سے قبل بھی آپ اپنے سماج میں ایک معزز اور رہنما کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے آ چکے تھے۔ نبوت سے قبل خصوصی طور پر اور نبوت کے بعد عمومی طور آپ ؐ کی زندگی میں ایسے بے شمار واقعات ہمیں ملتے ہیں جن کی بدولت بے قرار انسانیت کو قرار نصیب آیا۔ نبوت کے ابتدائی دنوں میں جب آپ نے ایک بڑھیا کے بوجھ کو اپنے کندھوں پر رکھ کر اس کے گھر تک پہنچایا تھا وہ واقعہ بھی بہت ہی معروف ہے۔ یہ وہی خاتون تھیں جن کو محمد (ﷺ) کے نام سے نفرت تھی۔ لیکن آپ ؐ کے اعلیٰ اخلاق کے مظاہرہ نے اسے جنت کا پروانہ عطا کیا۔ ان اخلاق کی وجہ سے آپ کے اردگرد نیک طبیعت لوگوں کی ایک جماعت تیار ہوگئی جو اخلاص وللّٰہیت، خدمت خلق، انفاق فی سبیل اللہ اور جنت کے حصول کے لیے ایک دوسرے پر سبقت کرنے والے تھے۔

اللہ کے رسول ﷺ کے بعد آپ کے صحابہؓ میں سے حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہم وغیرہ کی زندگی سے ایسے بے شمار واقعات ہمیں ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان حضرات نے دین کی سربلندی کے لیے خدمت خلق کو وسیلہ بنایا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایسے لاتعداد غلاموں کو خرید کر آزاد کرایا جو صرف اس وجہ سے ستائے جاتے تھے کہ وہ ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ اپنے دور خلافت میں بیت المال کی رقم کو تقسیم کر کے ایسے بے شمار رفاہی کام انجام دیے کہ آنے والے پندرہ بیس سالوں کے اندر مسلم مملکت میں کوئی زکوٰۃ لینے والا نہ رہ گیا۔ یہ حضرت ابوبکرؓ کا وہ کارنامہ ہے جو اکثر لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ بعد کے خلفاء نے ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بہت سے ایسے امور انجام دیے جو رہتی دنیا تک یاد کیے جائیں گے۔ حضرت عثمان بن عفانؓ نے ایک یہودی کا کنواں منہ مانگی قیمت پر خرید کر لوگوں کے لیے وقف کردیا۔ مکہ میں جب قحط سالی ہوئی تو آپؓ نے تقریباً سو اونٹوں پر لدا ہوا اناج اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے تقسیم کردیا۔ ہجرت مدینہ کے موقع پر جب آپ ؐ نے لوگوں کے درمیان مواخاۃ کا رشتہ قائم کیا تو لوگوں نے وہ مثالیں پیش کیں کہ دنیا اس کی نظیر پیش کرنے سے آج تک قاصر ہے۔ ایک قلیل مدت میں مدینہ جیسی فلاحی ریاست کو ایک وسیع وعریض خطہ میں پھلنے پھولنے کے مواقع میسر آئے۔

اس سلسلے میں ایک بات ہمیشہ ہمیں یہ یاد رکھنی چاہیے کہ دین میں ہر چیز کی اپنی ایک جگہ اور اپنا ایک مقام ہے۔ اس کو اس جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ چسپاں کرنے کی کوشش کرنا، دین کے ساتھ کھلواڑ کرنے کے مترادف ہے۔ عبادات معاملات کا بدل نہیں ہوسکتیں اور نہ معاملات عبادات کا بدل ہوسکتے

ہیں۔ ہر چیز کو اس کے شرعی مقام پر رکھ کر پرکھنے کا نام ہی دین ہے۔ جیسے بغیر سیٹوں والی کسی گاڑی کو ہم مکمل گاڑی نہیں کہہ سکتے، اسی طرح عبادات، انفاق، اخوت و بھائی چارگی، اور دیگر احکام کے بغیر ہم دین کو مکمل نہیں کہہ سکتے۔ دین تبھی مکمل ہوگا جب کہ ہر چیز کو اس کا اصل مقام دیا جائے۔ جو لوگ دین کے کسی خاص جز و کو ہی دین سمجھ بیٹھتے ہیں، ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے فاسق کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''اللہ کی مسجدوں کو آباد کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، جو نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں اور سوائے اللہ کے کسی سے نہ ڈریں، ان ہی سے یہ توقع ہے کہ وہ ہدایت پائیں گے۔ کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی آبادکاری کو اس شخص کے عمل کے برابر ٹھہرالیا ہے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھے اور اللہ کے راستے میں جہاد کرے۔ یہ دونوں اللہ کے نزدیک برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ فاسقوں کی ہدایت نہیں کرتا۔ اللہ کے ہاں ان لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے، جنہوں نے ہجرت کی اور اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کیا۔ یہی لوگ کام یاب ہونے والے ہیں۔ انہیں ان کا رب اپنی طرف سے بڑی رحمت اور بڑی رضامندی اور ایسی جنتوں کی خوش خبری دیتا ہے جن میں ان کے لیے ہمیشہ کی نعمتیں ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ بے شک اللہ کے نزدیک بڑا اجر ہے۔'' (التوبہ: ۱۸۔۲۲)

محبت رسول ؐ اور اس کے تقاضے

ساجدہ ابواللیث فلاحی،
کلیۃ البنات، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ

متعدد آیات قرآنی اس بات پر گواہ ہیں کہ جب قومیں بگاڑ کا شکار ہوئیں، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا تاکہ وہ اپنی قوم کے سامنے ہدایت و گمراہی اور ان کے اچھے و برے انجام کو بطریق احسن واضح کر دیں اور انھیں ضلالت و گمراہی کے کھڈ سے نکال کر ہدایت کی راہ پر ڈالنے کے لیے ہر ممکن کوشش انجام دیں، جیسا کہ فرمایا گیا:

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيراً وَنَذِيراً وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خلَا فِيهَا نَذِيرٌ۔ (فاطر:۲۴)

''ہم نے ہی آپ ؐ کو حق دے کر خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور کوئی امت ایسی نہیں ہوئی جس میں کوئی ڈرانے والا نہ گزرا ہو''۔

جب عرب شرک اور بت پرستی کی آماج گاہ بن گیا اور اہل عرب گمراہیوں کے دلدل میں پھنس گئے تو رب کریم کی محبت و رحمت جوش میں آئی اور اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر اور رسول بنا کر مبعوث فرمایا۔ یہ وہ عظیم ہستی ہے جس کے ذریعہ انسانیت کو اللہ تعالیٰ کا ابدی پیغام اور زندگی بسر کرنے کے اصول و ضوابط عطا کیے گئے۔ آپ ؐ تمام انسانوں کے لیے سراپا رحمت ثابت ہوئے اور آپ ؐ نے ربّ دو جہاں کا پیغام بلا کم و کاست اس کے بندوں تک پہنچا دیا، صرف پہنچایا ہی نہیں بلکہ اس پر ہر آن عمل کر کے دکھایا تاکہ ہر مومن و مومنہ کے لیے مشعل راہ ثابت ہو۔ آپ ؐ کی نبوت و بعثت کی دلیل قرآن مجید کی درج ذیل آیت ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِداً وَمُبَشِّراً وَنَذِيراً۔ وَدَاعِياً إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجاً مُّنِيراً۔ (الاحزاب:۴۵-۴۶)

''اے نبی ؐ! یقیناً ہم نے آپ ؐ کو (رسول بنا کر) گواہ دینے والا، خوشخبری سنانے والا، آگاہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے اور اللہ کے حکم سے اس کی طرف بلانے والا اور روشن چراغ''۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں رسولؐ اللہ کی حیثیت واضح کر دی ہے اور ان کے بلند ترین مقام سے امت مسلمہ بلکہ تمام انسانوں کو آگاہ کر دیا ہے کہ آپ ﷺ قولی و عملی نیز دنیوی و اخروی شہادت پر مامور کیے گئے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی یقین دہانی، رسالت، بعث بعد الموت، عمل صالح کے نتیجہ میں جنت کی بشارت اور بداعمالیوں کے نتیجہ میں جہنم سے انذار وغیرہ سے لوگوں کو واقف کرانا۔

لہٰذا نبی اکرمؐ نے قولی اور عملی شہادت پیش کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی اور بغیر کسی کوتاہی کے پوری تندہی اور جانفشانی سے اللہ تعالیٰ کے پیغام کو بلا کم و کاست اس کے بندوں تک پہنچا دیا تاکہ اللہ کی محبت لوگوں پر قائم ہو جائے اور آخرت میں بھی آپؐ یہ شہادت قائم کر سکیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً لِّتَكُونُواْ شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيداً۔ (البقرۃ:۱۴۳)

''اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک 'امت وسط' بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو''۔

ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو آگاہ کر دیا کہ اب بندوں کی فلاح و بہبود اور اخروی نجات صرف اور صرف رسولؐ کی کما حقہ پیروی اختیار کر لینے میں ہے اور پیغام پہنچا دینے کے بعد آپؐ کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ اب انسان بذات خود اس کا ذمہ دار ہے، فرمایا گیا:

مَّنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ وَمَن تَوَلَّى فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظاً۔ (النساء:۸۰)

''جو اس رسولؐ کی اطاعت کرے اس نے اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کی اور جو منھ پھیرے تو ہم نے آپ کو ان پر نگہبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے''۔

اسی مفہوم کو حدیث میں ان الفاظ میں واضح کیا گیا ہے۔

من أطاعنی فقد أطاع الله و من عصانی فقد عصی الله و من أطاع امیری فقد اطاعنی و من عصی امیری فقد عصانی۔ (بخاری، مسلم)

''جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی، اور جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی، اس نے میری نافرمانی کی''۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولؐ کا کوئی حکم اور کوئی عمل اپنی مرضی و چاہت پر منحصر نہیں تھا بلکہ وہ صرف وہی بات کہتے جس کا وحی کے ذریعہ حکم دیا جاتا اور اسی کے مطابق عمل کرتے اور تعلیم دیتے تھے۔ جیسا کہ قرآن مجید کہتا ہے:

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَى۔ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى۔ عَلَّمَهُ شَدِيْدُ الْقُوَى۔ (النجم:۳-۵)

''اور وہ اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کہتے، وہ تو صرف وحی ہے جو اتاری جاتی ہے، اسے شدید طاقت دینے والے فرشتے نے سکھایا ہے''۔

ساتھ ہی آپؐ نے دینی تقاضے کے تحت انجام کار سے بھی آگاہ کر دیا کہ خوش بخت اور کامیاب انسان وہی ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کی تعلیمات کو قبول کر لے۔ اللہ کی عدالت میں وہ ناکام و نامراد ٹھہرے گا جس نے میری لائی ہوئی تعلیمات سے صرف نظر کیا، چشم پوشی برتی اور تمام تر حدود و قیود سے آزاد ہو کر من مانی زندگی بسر کی۔ حدیث میں آتا ہے کہ:

من يطع الله و رسوله فقد رشد، و من يعصهما فانه لا يضر الا نفسه۔ (ابوداود:۹۲۷)

''جس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کی، وہ ہدایت پا گیا، اور جس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کی تو وہ خود اپنے نفس کو ہی نقصان پہنچائے گا''۔

اس سنت الٰہی کی تفصیل کے بعد یہ امر قابل غور ہے کہ سچی اطاعت کیونکر ممکن ہے؟ کیا مطاع کی حقیقی محبت کے بغیر فی الواقع سچی محبت کی جا سکتی ہے؟

انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ جس سے جتنی محبت کرتا ہے، اسی کے مطابق اس کے ہر اشارہ پر عمل کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے یہاں تک کہ یہ قلبی محبت اگر عروج پر پہنچ جائے تو بسا اوقات جان بھی قربان کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے بندۂ مومن سے اسلام کا مطالبہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف عمومی محبت نہ کرے بلکہ آپؐ کو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ محبوب رکھے تا کہ اتباع رسولؐ کا حق کلی طور پر ادا کر سکے۔ رسولؐ اللہ کا فرمان ہے:

لا يومن احد كم حتى اكون احب اليه من والده و ولده و الناس اجمعين۔ (بخاری:۱۵)

''تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے نزدیک، اس کے باپ، اس کی اولاد، اور تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں''۔

اس کی بہترین مثال ایک انصاریہ خاتون کا واقعہ ہے۔ جن کے والد، بھائی اور شوہر جنگ میں شہید کردیے جاتے ہیں لیکن وہ حضورؐ کی شہادت کی افواہ سن کر بے قرار ہو کر گھر سے نکل پڑتی ہیں۔ راستے میں انھیں لوگ باپ، بھائی اور شوہر کی شہادت کی خبر دیتے ہیں تو ان کا جو جواب ملتا ہے، وہ حیرت انگیز ہے:

''میں باپ بھائی اور شوہر کے بارے میں نہیں پوچھ رہی ہوں، مجھے بتاؤ کہ رسول اللہ ﷺ کیسے ہیں؟ ان کو خبر دی جاتی ہے آپؐ حیات اور الحمدللہ بعافیت ہیں تو وہ کہتی ہیں مجھے اطمینان نہیں ہوگا جب تک کہ میں آپؐ کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں''۔

چنانچہ جب وہ خود پہنچ کر آپؐ کا دیدار اپنی نگاہوں سے کرلیتی ہیں تو بے اختیار پکار اٹھتی ہیں:

كل مصيبة بعدك جلل (دلائل النبوۃ، بیہقی: ۳۰۲/۳)

''آپؐ کے ہوتے ہوئے ہر مصیبت ہیچ ہے''۔

یہ قوت ایمانی تھی جس نے انھیں بے قرار کردیا کہ وہ ہستی جو دین الٰہی جاننے کا واحد ذریعہ ہے، نعوذ باللہ اگر شہید کردی جاتی ہے تو ملت اسلامیہ عظیم خسارے اور تباہی سے دوچار ہوسکتی ہے۔

اس واقعہ کی روشنی میں تمام مسلمانوں کو غور کرلینے کی ضرورت ہے کہ ذات رسولؐ سے ہماری محبت کس حد تک ہے اور اسلام کو کس معیار کی محبت مطلوب ہے؟ اس کا جواب اس حدیث میں بھی ملتا ہے:

حضرت عمرؓ بن خطاب نے حضورؐ سے کہا: اے اللہ کے رسولؐ آپ مجھے اپنی جان کے علاوہ ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں، تو آپؐ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ تمہارا ایمان مکمل نہیں ہوسکتا، یہاں تک کہ میں تمہاری جان سے بھی زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں، حضرت عمرؓ نے کہا: اللہ کی قسم، اب آپؐ مجھے میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں، تب نبی کریمؐ نے فرمایا: اے عمر، اب تم پکے مومن ہو گئے۔ (بخاری: ٦٦٢٣)

رسول اللہ کی اس قدر شدید محبت کا حکم صرف اسی لیے ہے کہ محبت کے بغیر اتباعِ رسول ممکن نہیں ہے اور اتباعِ رسولؐ کے بغیر اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت وعبادت بھی ممکن نہیں ہے۔

آج افرادِ امت کا معاملہ کچھ اس کے برعکس نظر آتا ہے۔ ہم عقیدتِ رسولؐ کے مدعی ہیں، محبتِ رسولؐ کا دم بھرتے ہیں لیکن محبتِ رسولؐ کے تقاضے کیا ہیں اور اس کے تحت کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟ ان کی ادائیگی کس طرح کی جائے؟ اس پہلو سے غور وخوض کرنا طبیعتوں پر گراں گزرتا ہے۔

امت مسلمہ کی ایک کثیر تعداد میلاد النبیؐ کو ''عید'' کی حیثیت دیتے ہوئے اسے ''عید میلاد النبیؐ''

کے نام سے جانتی ہے اور باقاعدہ تہوار کی حیثیت سے اس کا جشن مناتی ہے۔۱۲/ربیع الاول کو جشن، چراغاں، مساجد کی سجاوٹ، تقریریں، نعت گوئی، آتش بازی، کفریہ وشرکیہ نعرے، عورتوں اور مردوں کی مخلوط مجالس وغیرہ کا انعقاد کیا جاتا ہے، جن کا بلاشبہہ احکام اسلام سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ مسلمانوں کے لیے حدیث کے مطابق صرف دو ہی تہوار ہیں، عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ۔ اس کے علاوہ کوئی جشن یا تہوار قرآن وسنت سے ثابت نہیں ہے۔ صحابہ کرام کا عمل اس پر دلیل ہے کہ انہوں نے نہ ہی حیاتِ رسولؐ میں ''عید میلاد النبیؐ'' منائی اور نہ ہی وفاتِ رسولؐ کے بعد، باوجود اس کے کہ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید محبت تھی۔

عید میلاد النبی کی ابتداء مولانا رشید احمد گنگوہی کے مطابق 'ابوسعید کوکبوری بن ابی الحسن اربل' (موصل) متوفی ۱۸/رمضان ۶۳ھ نے کی ہے۔ (بحوالہ: فتویٰ رشیدیہ، ص:۱۲۳)

اس کے جواز کا فتویٰ دینے والے شخص کا نام ابوالخطاب عمر بن الحسن المعروف ابن دحیا کلبی متوفی ۵۳۳ھ ہے۔

حافظ ابن حجرؒ اپنی کتاب ''لسان المیز ان'' جلد۲/صفحہ۲۹۵/میں لکھتے ہیں:

''میں نے تمام لوگوں کو دحیا کلبی کے جھوٹ اور ضعیف ہونے پر متفق پایا''

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ کہتے ہیں:

''عمل مولد بعض لوگوں نے نصاریٰ کی اتباع میں ایجاد کیا ہے یا نبی کی تعظیم میں، آپؐ کے یوم ولادت کے موقع پر جو عید میلاد النبیؐ منائی جاتی ہے یہ عمل مولد سلف صالحین نے نہیں کیا ہے۔'' (بحوالہ: اقتضاء الصراط المستقیم)

علامہ شیخ احمد بن حجر لکھتے ہیں:

''عید میلاد النبیؐ کی بدعت ساتویں صدی ہجری میں موصل میں واقع اربل کے بادشاہ مظفر نے ایجاد کی تھی''۔ (بحوالہ: بدعت اوران کا شرعی پوسٹ مارٹم، یوسف القرضاوی)

یہ چیز باعثِ افسوس ہے کہ اطاعتِ رسول جملہ شعبہ حیات میں مسلمانوں کے لیے ایک مشکل امر ہے جو محاسبہ زندگی کو بھی لازم کرتا ہے اور بے لگام آزادانہ زندگی کو دائرہ ایمان کا پابند بناتا ہے۔ اس لیے کچھ ایسے اعمال اختیار کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے جو وقتی اور عارضی ہیں اور جن کی بنا پر محبّ رسولؐ کہلانے کے بھی مستحق ہیں۔

مقصود کلام یہ کہ افراد امت میں حضورؐ سے حقیقی محبت کی سچائی عملی طور پر ظاہر ہونی چاہیے۔ آپؐ کی سیرت کو اپنا رول ماڈل بنایا جائے اور ان کی لائی ہوئی شریعت کی نہ صرف حفاظت کی جائے بلکہ اسے عام کرنے کی کوشش کی جائے ساتھ ہی اس کے اوپر عائد ہونے والے مخالفینِ اسلام کے اعتراضات کا دفاع کیا جائے۔

جشن میلاد النبیؐ کے تعلق سے درج بالا علماء کے استفسارات کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ میلاد النبیؐ کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے بلکہ اس دن کو یاد رکھنا اس مقصد کے تحت ہو کہ مسلمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو آگے بڑھانے کی فکر کریں اور اسی دن بطور خاص ان کی تعلیمات کو عام کرنے کا پختہ عزم کریں تا کہ ضلالت و گمراہی میں سسکتی بلکتی انسانیت اصلاحِ حال کی طرف متوجہ ہو اور دنیا کے سامنے آپؐ کی صحیح تصویر اور ان کا لایا ہوا پیغام واضح ہو سکے۔ قرآن خود کہتا ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيراً وَنَذِيراً۔ (السبا:۲۸)

''اور ہم نے آپؐ کو تمام دنیا والوں کے لیے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے''۔

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ۔ (الانبیاء:۱۰۷)

''اور ہم نے آپؐ کو تمام دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے''۔

دوسری بات یہ کہ مختلف تحریکیں، تنظیمیں اور داعیان دین جو امت کے سامنے ۱۲؍ربیع الاول کی نا مناسب سرگرمیوں اور مراسم پر نکیر اور سیرت رسولؐ کے مختلف گوشوں کو واضح کرنے کے لیے اس دن جلسوں کا انعقاد کرتے ہیں، وہ اسے صرف ایک دن کے لیے خاص نہ کر لیں بلکہ اس سے پہلے اور بعد بھی اس طرح کے اجتماعات کا انعقاد وقتاً فوقتاً کرتے رہیں تا کہ ان کے ذریعہ مسلمانوں کی یاد دہانی اور اصلاح وتربیت کا موقع برابر ملتا رہے، بصورتِ دیگر اس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ ۱۲؍ربیع الاول کے اجتماعات بھی رسمی ہو کر رہ جائیں اور پھر پورے سال آپؐ کی آمد، مشن اور تعلیمات کی یادیں ذہنوں سے محو ہو جائیں۔

تیسری بات یہ کہ اس موقع پر ہمیں اپنا محاسبہ اور جائزہ لینا چاہیے کہ کیا ہمارے دل و دماغ میں محبت رسولؐ اس قدر جاگزیں ہے کہ اپنی جان، خواہشات اور منفعت و مفادات اطاعت رسولؐ میں قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائیں اور اس کے بدلہ اخروی زندگی کی لازوال نعمتوں سے فیضیاب ہوں؟ اگر نہیں! تو اس عظیم گرانقدر شئے کو حاصل کرنے کے لیے علمی وفکری تیاری اور سیرت رسولؐ سے

مکمل رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت ہے تا کہ نبی اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی واقعی اور حقیقی محبت ہمارے دلوں میں پیوست ہو سکے اور محبان رسولؐ محبت رسولؐ کے تقاضے کما حقہ پورے کر سکیں۔

محبت رسولؐ کے تقاضے

کسی چیز کو تسلیم کر لینے کے بعد اس کے تعلق سے جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس کا نام ''تقاضا'' ہے۔ اسی طرح ایک مسلمان رسولؐ کی رسالت کو پوری عقیدت و محبت کے ساتھ تسلیم کر لیتا ہے تو بحیثیت محبّ اس کے اوپر کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں جن کی ادائیگی اس کے لیے ضروری ہے۔

ذیل میں کچھ اہم تقاضوں کا ذکر کرنا مناسب ہوگا:

اتباع رسول

انسان جس سے محبت کرتا ہے اس کی ہر بات تسلیم کرنے اور اس کے فرامین کو بجا لانے میں قدرے خوشی و مسرت محسوس کرتا ہے، تو پھر وہ شخصیت جس کی عدم محبت کی بنیاد پر ایک مسلمان کے ایمان کی نفی کچھ اس طرح کی گئی ہے کہ:

" لا یومن أحدکم حتی أکون أحب الیه من والده و ولده والناس أجمعین۔"(بخاری:۱۵)

''تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والدین، اولاد اور تمام تر لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں''۔

چنانچہ جس کی محبت ایمان کا لازمی جزو قرار دی گئی تو اس سے محبت کا تقاضا، اس کے ہر حکم کی تعمیل اور اطاعت و فرماں برداری ہے۔ اسی طرح ہر اس چیز سے نفرت، بیزاری اور کراہیت کا احساس بھی، جسے اس محبوب و محمود ہستی نے ناپسند کیا ہو اور اس سے منع فرمایا ہو۔ جیسا کہ فرمایا گیا:

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا۔ (الحشر:۷)

''رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں جو کچھ دیں اسے لے لو اور جس چیز سے منع کریں اس سے رک جاؤ''۔

چنانچہ بندۂ مومن کو یہ اختیار ہرگز نہیں دیا گیا کہ جب چاہے فرمان رسولؐ کو تھام لے اور اس پر عمل کرے اور جب چاہے اپنی من مانی روش اختیار کرے، بلکہ محبت رسولؐ کا واجبی تقاضا ہے کہ کتاب و سنت کی روشنی میں جملہ شعبہ حیات میں آپؐ کی کامل پیروی اختیار کی جائے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ۔ (النساء:۶۴)

''ہم نے جو بھی رسول بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے''۔

ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا:

لا یؤمن أحدکم حتیٰ یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ۔ (معجم السفر للسلفی:۲۰۹)

''تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی خواہشات میری لائی ہوئی تعلیمات کے تابع نہ ہوجائیں''۔

درج بالا نصوص سے محبت رسولؐ کے اولین تقاضے اور اطاعت رسولؐ کی اہمیت واضح طور پر سامنے آتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ محبّ رسولؐ کے اوپر کس قدر بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جو اس کے جملہ شعبہ حیات کا احاطہ کرتی ہیں اور عمل کی دعوت دیتی ہیں۔قرآن نے ان ذمہ داریوں کی کما حقہ ادائیگی کی صورت میں اخروی زندگی کی کامیابی اور جنت میں بیش بہا نعمتوں کی بشارت بھی دی:

وَمَن يُطِعِ اللّهَ وَالرَّسُولَ فَأُوْلَـئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاء وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَـئِكَ رَفِيقاً۔ (النساء:۶۹)

''جو لوگ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین، کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آئیں''۔

اس کے برعکس یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ رسولؐ کی اطاعت سے صرفِ نظر گناہِ عظیم ہے، جس کے نتیجہ میں آخرت کے بھیانک بدترین انجام سے بھی نعوذ باللہ دوچار ہونا پڑ سکتا ہے۔مزید یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ بھلائی کے کام اور اچھے عمل کی بنیاد اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کی اطاعت ہی ہو۔اگر اعمال اچھے ہوں لیکن ان کی بنیاد غیر اللہ کی اطاعت پر ہو تو باطل اور رائیگاں ہیں۔قرآن کہتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ۔ (محمد:۳۳)

''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو برباد نہ کرلو''۔

اسی طرح اطاعت سے منھ موڑنے اور روگردانی کرنے والوں کو بھی ان کے بھیانک انجام سے اس آیت میں آگاہ کردیا گیا:

وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَداً۔ (الجن:۲۳)

''اور جو بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات نہیں مانے گا اس کے لیے جہنم کی آگ ہے اور ایسے لوگ

اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

اسوہ رسول ﷺ

محبت رسولؐ کا دوسرا تقاضا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو اسوہ بنانا ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيْراً۔ (الاحزاب:۲۱)

''درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونہ تھا، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخرت کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے''۔

رسول اللہ کی زندگی کو نمونہ بنا کر اس کے آئینہ میں زندگی گزارنے کی کوشش وہی شخص کرے گا جس کو بعث بعد الموت کا احساس اور اعمال کے واجبی نتائج کا یقین ہو۔رہا وہ فرد جسے یا تو آخرت کی امید ہی نہ ہو یا اگر ہو تو کبھی کبھار ہی اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والا ہو اور زندگی کی ہما ہمی و مصروفیات نے اسے موت کے بعد پیش آنے والے نتائج سے غافل کر رکھا ہو تو ایسا شخص بجائے اللہ کے رسولؐ کو رہنما بنانے کے، اپنی من پسند شخصیت کو رہنما بنائے گا تا کہ اس کے لیے دنیاوی ترقی ممکن ہو سکے۔

سنتِ رسول ﷺ کی طرف رجوع

محبت رسولؐ کا تیسرا تقاضا اپنے جملہ معاملات و مسائل میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی طرف رجوع کرنا ہے، اسی سے فیصلہ چاہنا اور مسائل کا حل دریافت کرنا ہے۔غیر اسلامی عدالتوں کی طرف رجوع کرنا اور اپنے مفاد کے لیے غیر اللہ سے اپنے مسائل حل کرانا ایمان کے ناقص ہونے کی علامت ہے، بلکہ قرآن نے ایسے شخص کے ایمان کی ہی سرے سے نفی کی ہے۔

آج مسلمانوں کے اندر یہ چیز عام ہو چکی ہے۔کم ہی لوگ باہمی تنازعات میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔اکثریت ایسی ہے جو حق و باطل کے بکھیڑے میں الجھنا نہیں چاہتی، بلکہ دنیا کا ادنیٰ ترین نفع حاصل کرنے کے لیے آخرت کا سودا کر لیتی ہے اور غیر اسلامی عدالتوں کے غیر مسلم حکمرانوں سے اپنے حق میں فیصلہ کرا کے خود کو سب سے زیادہ چالاک، سمجھدار اور کامیاب سمجھتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُواْ فِيْ أَنفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُواْ تَسْلِيماً۔ (النساء:٦٥)

''تمھیں! تمہارے رب کی قسم، یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سربہ سر تسلیم کر لیں''۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُون۔ (النور:۵۱)

''ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور رسولؐ کی طرف بلائے جائیں تا کہ رسولؐ ان کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو وہ کہیں، ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں''۔

درج بالا دونوں آیات کا حکم صرف آپؐ کی زندگی تک کے لیے ہی نہیں تھا بلکہ قیامت تک کے مسلمانوں کے لیے ہے۔ آپؐ کو اس حیثیت کے ساتھ تسلیم کرنے اور عمل کرنے پر ہی مومن ہونے اور نہ ہونے کا انحصار ہے۔ اس لیے اہل ایمان پر لازم ہے کہ اپنے تنازعات میں احکام اللہ و احکام الرسول کی طرف رجوع کریں اور جو کچھ وہاں سے فیصلہ ہو اسے تسلیم کریں۔ فیصلے خواہ موافق ہوں یا ناموافق، ان پر کسی طرح کی ناپسندیدگی کا اظہار تو درکنار دل میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں۔

گویا کہ طاغوتی نظام کے باطل فرماں رواؤں کو عادل و منصف سمجھنے اور ان سے اپنے مقدموں کے فیصلے کرانے کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے اور نہ ہی کتاب و سنت کے فیصلوں پر کسی قسم کے پس و پیش اور عدم تعمیل اور نہ ہی اپنے معاملات میں بذاتِ خود فیصلے کرنے کا کوئی اختیار۔ اگر کوئی نعوذ باللہ نافرمانی اور انحراف کی روش اختیار کرتا ہے تو اسے یہ آیت کریمہ جھنجھوڑنے کے لیے کافی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ۔ (الحجرات:۱)

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسولؐ کے آگے پیش قدمی نہ کرو اور اللہ سے ڈرو، اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے''۔

ایک اور جگہ ارشادِ ربانی ہے:

وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَداً۔ (الجن:۲۳)

''جو بھی اللہ اور اس کے رسول کی بات نہ مانے گا اس کے لیے جہنم کی آگ ہے اور ایسے لوگ اس

میں ہمیشہ رہیں گے''۔

تعظیمِ رسول

محبت رسولؐ کا چوتھا تقاضا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توقیر وتعظیم ہے جو اسلام اہل ایمان کے اندر دیکھنا چاہتا ہے، لیکن اس کا مطلب صرف اتنا نہیں ہے کہ مختلف موقع پر کھڑے ہو کر سلام پڑھ لیا جائے اور اس کو کافی سمجھا جائے بلکہ قرآن کریم ہر مسلمان اور محبِّ رسولؐ سے جس ادب واحترام کا مطالبہ کرتا ہے اس کو درج ذیل آیات میں واضح کیا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ۔ (الحجرات:۲)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنی آواز نبیؐ کی آواز سے بلند نہ کرو، اور نہ نبیؐ سے اونچی آواز سے بات کرو، جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کرایا سب غارت ہو جائے اور تمھیں خبر بھی نہ ہو''۔

یہ ادب اگرچہ آپؐ کی مجلس کے لیے سکھایا گیا تھا اور اس کے مخاطب عہد نبوی کے اہل ایمان تھے لیکن یہ حکم قیامت تک کے لیے ہے۔ آج وہ مقدس ہستی موجود نہیں ہے لیکن افراد امت کے دلوں میں ان کے لیے انتہا درجہ کا ادب واحترام پایا جانا چاہیے، اس طور پر کہ جہاں آپؐ کا ذکر ہو رہا ہو، آپؐ کی کوئی حدیث سنائی جا رہی ہو، وہاں آواز بلند کرنے سے گریز کیا جائے۔ اگر آپؐ کا کوئی حکم ذکر کیا جا رہا ہو یا بطور تنبیہ یاد دلایا جا رہا ہو تو اس کو برضا ورغبت خندہ پیشانی سے قبول کیا جائے۔

نبی کریمؐ پر درود بھیجنا

محبت رسولؐ کا ایک تقاضا آپؐ پر درود بھیجنا ہے جس کی قرآن وسنت میں تاکید کی گئی ہے۔ یہ محبان رسولؐ کے لیے غور طلب ہے کہ درود کا ورد بطور خاص کسی موقع پر نہیں ہے بلکہ یہ حکم عام ہے، جس کی طرف قرآن اشارہ کرتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (احزاب:۵۶)

''اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی کریمؐ پر درود بھیجتے ہیں۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم بھی ان پر درود وسلام بھیجو''۔

مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں: اس آیت میں مسلمانوں کو دو چیزوں کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک 'صَلُّوا عَلَيْهِ'، دوسرا 'سَلِّمُوا تَسْلِيماً'۔

صلوٰۃ کا لفظ جب علیٰ کے صلہ کے ساتھ آتا ہے تو اس کے تین معنی ہوتے ہیں۔ ایک کسی پر مائل ہونا، اس کی طرف محبت کے ساتھ متوجہ ہونا اور اس پر جھکنا، دوسرے کسی کی تعریف کرنا، تیسرے کسی کے حق میں دعا کرنا، لیکن جب یہ لفظ بندوں کے لیے بولا جائے گا، خواہ وہ فرشتے ہوں یا انسان، تو وہ تینوں معنی میں ہوگا، یعنی اس میں محبت، مدح وثنا اور دعائے رحمت تینوں کا مفہوم شامل ہوگا۔ لہٰذا اہل ایمان کو نبیؐ کے حق میں 'صَلُّوا عَلَيْهِ' کا حکم دینے کا مطلب یہ ہے کہ تم ان کے گرویدہ ہو جاؤ، ان کی مدح وثنا کرو اور ان کے لیے دعا کرو۔ سلام کا لفظ بھی دو معنی رکھتا ہے۔ ایک ہر طرح کی آفات و نقائص سے محفوظ رہنا جس کے لیے ہم اردو میں 'سلامتی' کا لفظ بولتے ہیں۔ دوسرے صلح اور عدم مخالفت۔ نبی کریمؐ کے حق میں 'سَلِّمُوا تَسْلِيماً' کہنے کا ایک مطلب یہ ہے کہ تم ان کے حق میں کامل سلامتی کی دعا کرو اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم پورے دل وجان سے ان کا ساتھ دو، ان کی مخالفت سے پرہیز کرو اور ان کے سچے فرماں بردار بن کر رہو۔ (تفہیم القرآن: ۱۲۴/۴)

درود وسلام کا طریقہ بھی احادیث میں واضح کر دیا گیا اور یہ وہی ہے جو ہم تشہد میں پڑھتے ہیں:

التحيات لله والصلوٰت والطيبات السلام عليك أيها النبى و رحمة الله و بركاته، السلام علينا وعلى عبادالله الصالحين۔ (صحیح بخاری)

''تمام زبانی، مالی اور بدنی عبادتیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ اے نبیؐ آپ پر سلام ہو اور اللہ کی برکت ہو اور سلام ہو ہم پر اور اللہ کے تمام نیک بندوں پر''۔

مزید آپؐ نے آگے فرمایا: ''جب تم لوگ یہ کلمہ کہتے ہو تو آسمان وزمین کے ہر نیک بندے کو یہ دعا پہنچ جاتی ہے''۔

دوسری حدیث کعب بن عجرۃ کی طرف منسوب ہے:

رسولؐ اللہ ہماری طرف آئے تو ہم نے کہا یا رسول اللہ ہم نے تو یہ جان لیا کہ آپؐ پر کس طرح سلام بھیجیں، مگر آپؐ پر درود کیسے بھیجیں؟ تو آپؐ نے فرمایا:

قولوا اللهم صل على محمد وعلىٰ آل محمد كما صليت علىٰ ابراهيم و على آل ابراهيم انك حميد مجيد، الهم بارك على محمد وعلى آل محمد كما باركت علىٰ

ابراهیم و علیٰ آل ابراهیم انك حمید مجید۔(بخاری)

درود سے بہر حال ہر مسلمان کو واقفیت ہوتی ہے، البتہ درود کے فرض، واجب، سنت اور مستحب ہونے میں فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔تشہدِ نماز میں جواس کے پڑھنے کی سنت جاری ہے اس سے بھی پابندیِ 'صلوۃ' کی ادائیگی ممکن ہے۔احساس صرف اس بات کا لازماً پایا جانا چاہیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے بعداللہ کے رسول محمدؐ انسانیت کے سب سے بڑے محسن ومربی ہیں۔

مزید یہ کہ درود پڑھنا باعث فضیلت اور موجب اجروثواب بھی ہے۔اپنے محسن کو پہچاننا اورحسب استطاعت اس کے احسان کا حق ادا کرنا انسان کی فطرت میں شامل ہے پھر مزید اس پر اجروثواب کی بشارت بھی ہوتو یہ خود کسی مسلمان کی عزت وتکریم میں اضافہ کا باعث ہے۔حدیث میں ہے:

"من صلی علی صلوٰۃ لم تزل الملئکة یصلی علیه ما صلی علی۔(احمد،ابن ماجہ)

''جوشخص مجھ پر درود بھیجتا ہے۔ملائکہ اس پر درود بھیجتے رہتے ہیں جب تک وہ مجھ پر درود بھیجتا رہے''۔

دوسری جگہ آپؐ نے فرمایا:

من صلی علی واحدۃ یصلی الله علیه عشراً۔(مسنداحمد:۸٦٦۵)

''جومجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہےاللہ تعالیٰ اس پر دس مرتبہ درود بھیجتا ہے''۔

درج بالا حدیث ثابت کررہی ہے کہ خیرالبشر حضرت محمدؐ پر درود بھیجنا کس قدر اہمیت کا حامل ہے کہ اسے نتیجتاً اللہ تعالیٰ اوراس کے فرشتوں کی طرف سے درود حاصل ہوتا ہے۔ایسے بندۂ مومن کومزید بشارت سےنوازا جاتا ہے:

اولی الناس بی یوم القیامة أکثر هم علی صلاۃ۔(ترمذی:۴۸۴)

''قیامت کے روز میرے ساتھ رہنے کا سب سے زیادہ مستحق وہ ہوگا جو مجھ پر سب سے زیادہ درود بھیجے گا''۔

ساتھ ہی درود کے تعلق سےغفلت اور لاپروائی کرنے والےکودرج ذیل حدیث میں تنبیہ بھی کی گئی ہے:

البخیل الذی من ذکرت عنده فلم یصل علی ۔(ترمذی:۳۵۴٦)

''بخیل ہے وہ شخص جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے''۔

ایسے ہی ایک مرتبہ رسولؐ منبر پر چڑھے تو پہلے زینہ پر آمین کہا، دوسرے پر آمین کہااوراسی طرح

تیسرے پر بھی آمین کہا، پھر آپؐ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

''میرے پاس جبرئیل علیہ السلام آئے تھے تو انھوں نے کہا: اے محمدؐ جس نے رمضان پایا اور اس کی مغفرت نہ کی گئی تو اللہ اس کو اپنی رحمت سے دور کر دے تو میں نے کہا 'آمین'۔ انھوں نے کہا جس نے اپنے والدین یا ان دونوں میں سے کسی ایک کو پایا اور (ان کی خدمت نہ کی) جہنم میں چلا گیا تو اس کو اللہ تعالیٰ (اپنی رحمت سے) دور کر دے، تو میں نے آمین کہا، پھر جبرئیل علیہ السلام نے کہا، جس کے پاس آپؐ کا ذکر آئے اور وہ آپؐ پر درود نہ بھیجے تو اللہ اس کو (اپنی رحمت سے) دور کر دے تو میں نے اس پر آمین کہا'' (ابن حبان بحوالہ صحیح الترغیب)

سنتِ رسول کو زندہ کرنا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ حیات پر غور کرنا، اس کے فروغ کی تگ ودو اور ان کی دعوت کو عام کرنے کے ساتھ ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرنا بھی محبت رسولؐ کا تقاضا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس سے دین کو زندہ کیا جاسکتا ہے اور جس سے فلاح دارین حاصل کی جاسکتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

من أحيا سنتی فقد أحيانی ومن أحيانی كان معی فی الجنة۔ (جامع ترمذی)

''جس نے میری سنت کو زندہ کیا اس نے مجھے زندہ کیا اور جس نے مجھے زندہ کیا تو وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا''۔

اسی طرح آپؐ نے دوسری جگہ فرمایا:

انه من أحيا سنة من سنتی قد أميتت بعدی فان له من الأجر مثل من عمل بها من غير أن ينقص من أجورهم شيئاً۔ (الترمذی:۲۶۷۷)

''جس نے میرے بعد میری کسی مردہ سنت کو زندہ کیا (یعنی ایسی سنت جس پر لوگوں نے عمل کرنا چھوڑ دیا تھا) تو اس کو اتنا ثواب ملے گا جتنا کہ اس پر عمل کرنے والے کو اور اس پر عمل کرنے والوں کے اجر میں کوئی کمی بھی نہیں ہوگی''۔

ان احادیث میں سنت رسولؐ کو زندہ کرنے کی ترغیب وتشویق ہے۔

محبت رسولؐ کے ان تقاضوں کی تکمیل سے ہی ہم دنیا اور آخرت دونوں میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان پر عمل کی توفیق دے، آمین۔

انسان کاملؐ

محمد مصطفیٰ انسان کامل
میان خیر وشر ہیں حد فاصل
ہے اسوہ آپ کا اعلی واشرف
کوئی اسوہ نہیں اس کے مقابل
تھے پیکر آپ عفو درگزر کے
کیا اخلاق سے دشمن کو گھائل
عبادت ہو کہ میدان سیاست
ہراک پہلو سے وہ اسوہ ہیں کامل
نہ چھوڑوں گا کبھی میں ان کا اسوہ
ملیں چاہے مجھے طوق وسلاسل
ابوبکر وعمر، عثمان وحیدر
نبی کی محنتوں کا ہیں یہ حاصل
نہیں ہوتی کبھی رسوا یہ امت!
جو اپناتی شہ دیں کے خصائل
اگر ہے آپ سے الفت کا دعوی
مٹا ڈالو جہاں سے نقش باطل
جو ہو سچی محبت ان سے عارقؔ
ہمارا خود پتہ پوچھے گی منزل

احسان الحق فلاحی عارقؔ آئمی،
جامعۃ الفلاح

مرکز فکر وعمل

مرکز فکر وعمل جب تک نہ بن جائے رسولؐ
کوئی ہرگز ہو نہیں سکتا ہے شیدائے رسولؐ

پرتوِ آیات قرآں ہیں سخن ہائے رسولؐ
ہے وہی منشائے حق بھی، ہے جو منشائے رسولؐ

ہے مہ و پرویں سے آگے درکِ دانائے رسولؐ
دیکھ لیتی ہے ابد تک چشم بینائے رسولؐ

رحمۃ للعالمینی کا یہ وصف خاص ہے
زخم کھا کر رحمتوں کے پھول برسائے رسولؐ

استعارے جاں بلب ہیں، دم بخود الفاظ ہیں
ماورائے عقل ہے حسن سراپائے رسولؐ

ہے معطر باغ عالم ان کے دم سے آج بھی
کس قدر دلکش ہیں رنگ و بوئے گلہائے رسولؐ

ہیچ ہے ان کی نظر میں دولت کونین بھی
ہے وراثت مرد مومن کی تولائے رسولؐ

کہکشاں بھی چاہتی ہے ہمسری خورشید کی
پھر رہی ہے ڈھونڈتی عکس کف پائے رسولؐ

ایک اُمّی بن گیا کیسے جہاں کا رہنما
معجزہ یہ دیکھ کر حیراں ہیں اعدائے رسولؐ

زندگی کی ان گزرگاہوں سے بچ بچ کر چلو
منعکس جن سے نہ ہوں نقش کف پائے رسولؐ

مل نہیں سکتی اُسے ہرگز صراط مستقیم
درحقیقت جو نہیں ہے جادہ پیمائے رسولؐ

بس یہی ہے شرط راشدؔ کامیابی کے لیے
دل میں ہو رب کا یقیں اور سر میں سودائے رسولؐ

سید راشد حامدی فلاحی،نئی دہلی

شہ انوار کے پاس!

تیر کے پاس کبھی تھی، نہ ہی تلوار کے پاس
جو کہانی تھی محمد ترے کردار کے پاس
طے ہوئی تھی جو مسافت وہ بہ یک جنبش چشم
ویسی تمثیل کہاں ہے کسی رفتار کے پاس
اب ترا اسوہ ہی بخشے گا اجالوں کے سراغ
وقت لے آیا ہے ہم سب کو شب تار کے پاس
گنبد سبز سے اٹھے تو کہیں اور تکوں
آنکھ صحرائی لیے آئی ہے گلزار کے پاس
آفریں ! چشم عرب !! بارہا دیکھا تونے
محو تدریس ہیں انجم شہ انوار کے پاس
سبز و شاداب نہ کیوں ہو ترا دامن طائف!
خوں بہایا تھا کسی نے ترے کہسار کے پاس
اس کی توصیف کا حق جس سے ادا ہو صارمؔ
ہے کہاں حرف و بیاں وہ لب اظہار کے پاس

ارشد جمال صارمؔ،
اسسٹنٹ پروفیسر منصورہ کالج، مالیگاؤں

نعت رسولِ پاک

صحرا کے ذرّہ ذرّہ میں بیعت کا نور تھا
ہر سو رسولِ پاک کی ہجرت کا نور تھا

طیبہ میں جشنِ آمدِ رحمت کا نور تھا
یعنی ہر ایک سمت محبت کا نور تھا

اصحاب کے دلوں میں عقیدت کا نور تھا
اللہ کے رسول سے نسبت کا نور تھا

صدیق کے جلَو میں صداقت کا نور تھا
پیشانیٔ عمر پہ عدالت کا نور تھا

عثمان کی رگوں میں سخاوت کا نور تھا
حضرت علی میں علم و شجاعت کا نور تھا

عشرہ مبشّرہ میں اطاعت کا نور تھا
پیارے نبی سے عشق و محبت کا نور تھا

معراج سے جو لوٹ کے آئے مرے حضور
چہرہ پہ انبیاء کی امامت کا نور تھا

غارِ حرا میں ذکرِ خدا تھا، رسول تھے
اور دور آسماں پہ عبادت کا نور تھا

کون ومکاں میں پھیل گیا جس کا سلسلہ
وہ مصطفےٰ کے مہرِ نبوت کا نور تھا

اُس کی ہی برکتوں سے منوّر ہے یہ زمیں
طائف کی وادیوں میں جو رحمت کا نور تھا

جس نے نبیلؔ تم سے کہلوائی نعت پاک
عشقِ محمدی کی اجازت کا نور تھا

عزیز نبیلؔ،قطر

یہ نعت ہے فیضان نبی

دل لے کے چلا ہے شہ بطحا کے نگر میں
آیا ہے نیا لطف مجھے آج سفر میں
پتھر لگے تر خوں سے ہوا جسم مبارک
وہ منظر طائف ہے مرے دیدہ تر میں
شق ہوگیا مہتاب اشارہ سے نبی کے
کہتے ہیں نشاں اب بھی ہے موجود قمر میں
اخلاق کریمانہ نبی کے ہیں مثالی
دشمن بھی رہے نظر عنایت کے اثر میں
جب چھوڑ دیا ہم نے ترا دامن سنت
ہم گر گئے سرکار زمانے کی نظر میں
یہ نعت ہے فیضان نبی رحمت ربی
اخترؔ نہیں کچھ حسن مرے دست ہنر میں

سعید اختر اعظمی،
معلم دار السلام انٹرنیشنل دہلی پبلک اسکول
ریاض سعودی عرب

نعت سرکار دو عالمؐ

دم بھر کے لیے ہی نام نبی اس دل کا سہارا ہوجائے
تقدیر سے نعت فخر رسل میرا بھی ترانہ ہوجائے

یہ روح منور ہوجائے، دنیائے دل وجاں روشن ہو
تاریکی غم میں شاہ مدینہ کا جو نظارہ ہو جائے

مجنون و دِوانہ کہہ کہہ کر دنیا نے جسے ٹھکرایا تھا
اے کاش یہ دل اس ہستی کا مجذوب و دِوانہ ہو جائے

سرکار کے کوچے سے ہو کر تم آئے ہو، ٹھہرو تو ذرا
اس شہر کی باتیں ہو جائیں، کچھ غم کا مداوا ہو جائے

بطحا کی یاد مجھے ہردم ،تڑپاتی ہے،ترساتی ہے
اے خالق اکبر میرا بھی اس شہر میں جانا ہوجائے

چل جائے اگر سکہ ہم پر سلطان مدینہ کا تنویؔر
ہاں جاری و ساری دنیا میں پھر سکہ ہمارا ہوجائے

تنویر آفاقی،
ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

نعت

کی ہی نہیں ہے جس نے اطاعت رسولؐ کی
حاصل اسے ہو کیسے شفاعت رسولؐ کی
در در پہ اپنے سر کو جھکاؤں میں کس لیے
کافی مرے لیے ہے ہدایت رسولؐ کی
تاریکیاں زمانے کی دم توڑنے لگیں
مکے میں جب ہوئی تھی ولادت رسولؐ کی
روتے رہے دعاؤں میں امت کے واسطے
دیکھی ہے عائشہؓ نے یہ حالت رسولؐ کی
کھویا وقار آج بھی مل جائے گا مگر
''آپس کے جھگڑے چھوڑ دے امت رسولؐ کی''
دشمن بھی اعتراف پہ مجبور ہوگئے
اللہ کررہا ہے حفاظت رسولؐ کی
صدیقؓ ہوں، عمرؓ ہوں کہ عثمانؓ وبوترابؓ
حصے میں سب کے آئی رفاقت رسولؐ کی
تکریم کس طرح سے کرے گا کوئی ضمیرؔ
ہم نے تو چھوڑ دی ہے روایت رسولؐ کی

ضمیر اعظمی،
مرکز جماعت اسلامی ہند

سلام

ہم محو خواب تو ہے حقیقت تجھے سلام
تیرا وجود حاصل امت تجھے سلام
تو نعمت تمام تو برکت تجھے سلام
کرتی ہے اب تو اپنی محبت تجھے سلام
اے میرے مہر و ماہ نبوت تجھے سلام

انسانیت کے غم میں تری چشم تر بہ تر
بادل ہو جیسے کوئی لیے بارشِ گہر
بے برگ زندگی کو دیا آبِ معتبر
تجھ سے ملی حیات کو نزہت تجھے سلام
اے میرے مہر و ماہ نبوت تجھے سلام

تو شاہد نگار دوعالم تو لاجواب
تو سبزۂ بہار دوعالم تو لاجواب
روشن ہے رہ گزار دوعالم تو لاجواب
تو ہی ہے دوجہان کی زینت تجھے سلام
اے میرے مہر و ماہ نبوت تجھے سلام

قرآن خود ہے تیری رسالت پہ اک دلیل
جس کو حرا کے غار میں لائے تھے جبرئیل

ممکن نہیں ہے جس کے لیے کوئی قال و قیل
تو حامل کتاب رسالت تجھے سلام
اے میرے مہر و ماہ نبوت تجھے سلام

سازِ ستم کو تو نے دیا نغمۂ وفا
آہنگ میں ہے تیرے چھپا جذبۂ وفا
تیرا سرود، تیری نوا شیشۂ وفا
سرتابہ پاتو حسن ولطافت تجھے سلام
اے میرے مہر و ماہ نبوت تجھے سلام

تو محفلوں کی جان ہے تو روح انجمن
تو شمعِ عطر بیز ہے تو نور فکروفن
تو چاندنیٔ ذہن ہے تو سایہ بدن

میری یہ نعت تیری بدولت تجھے سلام
اے میرے مہر و ماہ نبوت تجھے سلام

سالم سلیم،نئی دہلی